# RULERS, RELIGION, & RICHES

## Why the West Got Rich and the Middle East Did Not

by

Jared Rubin

# حکمران، مذہب اور دولت

## مغرب کیوں امیر ہوا، مشرق وسطیٰ کیوں نہیں ہوا؟

جیریڈ روبن

ترجمہ: پروفیسر مقبول الٰہی

مشعل

# حکمران، مذہب اور دولت

## مغرب کیوں امیر ہوا، مشرق وسطےٰ کیوں نہیں ہوا؟

جیریڈ روبن

ترجمہ: پروفیسر مقبول الٰہی

مشعل بکس

آر-بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان



حکمران، مذہب اور دولت

مغرب کیوں امیر ہوا، مشرق وسطےٰ کیوں نہیں ہوا؟

جیریڈ روبن

ترجمہ: پروفیسر مقبول الٰہی

کاپی رائٹ اردو © 2018 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگلش© جیریڈ روبن2017

کتاب کا ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی پریس کی اجازت سے شائع کیا گیا ہے۔

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون وفیکس: 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

www.MashalBooks.org

# فہرست


پیش لفظ ..... 7

**1- تعارف ..... 11**

استدلال کے مضمرات اور محدودات ..... 20

ترغیبات کے حوالے سے سوچنا ..... 23

دلیل کا خلاصہ ..... 26

دوسری توضیحات ..... 33

تکمیلی مفروضہ جات ..... 34

متضاد مفروضے ..... 41

اس کتاب کے مخاطب .... اور ایک وضاحت ..... 45

**حصہ اوّل ..... 47**

**حکمرانی کی توسیع: معاشی کامیابی اور جمود کا ایک نظریہ ..... 47**

**2- حکمرانی کی توسیع ..... 49**





قوانین اور پالیسیاں کون بناتا ہے اور اُن کی پیروی کیوں کی جاتی ہے؟ ..... 52

کھیل کا نظریہ اور اداروں کا کردار ..... 63

حکمرانوں اور اُن کے توسیعی کارندوں کے درمیان کھیلا جانے والا کھیل ..... 66

طویل المدّتی ادارہ جاتی تبدیلی (اور جمود) ..... 72

قابلِ آزمائش پیش بینیاں ..... 77

**3- حکمرانی کی توسیع کی تاریخی بُنیادیں ..... 81**

اسلام اور عیسائیت میں (حکمرانی کی) مذہبی جواز بخشی کا اصول ..... 84

ڈھانچے کو استعمال کرنا: مذہبی جوازِ اقتدار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ..... 93

محمد ﷺ کے بعد اقتدار کی اسلامی جواز بخشی ..... 96

سقوطِ روم کے بعد عیسائی جواز بخشیِ اقتدار ..... 104

مقدّروں کا پلٹنا ..... 117

**حصہ دوم**

**نظریے کا اطلاق: مغرب کیوں امیر ہوا اور مشرقِ وسطیٰ کیوں نہ ہوا.. 121**

**4- سود لینے پر پابندیاں ..... 123**

اسلامی ممانعتِ سود کی تاریخ ..... 128

سُود پر عیسائی پابندیوں کی تاریخ ..... 136

اسلامی اور عیسائی سُود کی پابندیوں میں اختلافات کی توضیح ..... 145

راستے پر منحصر نتائج ..... 151


www.MashalBooks.org

**5- چھاپہ خانے پر پابندیاں ..... 161**

یورپ میں ابتدائی چھپائی ..... 165

سلطنتِ عثمانیہ میں طباعت کے ضابطے ..... 172

عثمانیوں نے چھاپہ خانہ کو کیوں روکا؟ ..... 178

چھاپہ خانہ یورپ میں کیوں تیزی سے پھیلا؟ ..... 184

ناقابلِ پیش بینی نتائج ..... 189

**6- طباعت اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا ..... 191**

پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا کا پھیلاؤ ..... 200

چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کا تحریک اصلاحِ کلیسا کے ساتھ تعلق جوڑنا ..... 204

تحریکِ اصلاحِ کلیسا پر چھاپہ خانے کے اثر کو جانچنا ..... 209

معاشی اشرافیہ کی طرف سے توسیع اقتدار: ایک پروٹسٹنٹ مظہر؟ ..... 218

خلاصہ: مختلف ادارہ جاتی راستوں کی توضیح ..... 224

سلطنتِ عثمانیہ میں (انجامِ کار) طباعت کا اُبھار ..... 226

کیا ہوسکتا تھا؟ ..... 235

**7- کامیابی: انگلستان اور جمہوریہ ڈچ ..... 237**

مابعد تحریکِ اصلاحِ کلیسا کا انگلستان ..... 241

تحریکِ اصلاح کلیسا، ڈچ بغاوت، اور معاشی کامیابی ..... 252

جدید معیشت کے نقیب ..... 265





**8- جمود: سپین اور سلطنتِ عُثمانیہ ..... 267**

سپین میں طویل مدّتی معاشی جمود ..... 272

سلطنتِ عثمانیہ میں مذہبی جواز بخشیِ اقتدار اور معاشی جمود ..... 289

یہ چیز اہمیت رکھتی ہے کہ اقتدار کو کون توسیع دیتا ہے ..... 311

**9- نتیجہ ..... 313**

مُمکنہ غلط فہمیاں ..... 322

مغرب کے عروج کے ضمنی مفاہیم ..... 328

اکیسویں صدی اور اُس سے آگے کے لئے مضمرات ..... 331

اختتامی خیالات ..... 339

حواشی ..... 342

حوالہ جات ..... 359


www.MashalBooks.org

# پیش لفظ

میں نے اس کتاب کیلئے تحقیق، سٹینفورڈ یونیورسٹی میں گریجوایشن کے اپنے تیسرے سال 2004ء میں شروع کی۔ اُس وقت جو کہانیاں زبان زدِ عام تھیں، اُن میں ''مغرب'' اور ''اسلامی دُنیا'' کے درمیان کشمکش ایک تھی۔ 9/11 ابھی ہر ذہن میں تازہ تھی اور عراق اور افغانستان میں جنگیں خبروں کی سُرخیوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ درمیان کے بارہ سالوں میں اس محاذ پر کوئی زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ اگر کوئی تبدیلی آئی بھی ہے تو صرف یہ کہ کشمکش اور گہری ہوگئی ہے۔ پوری دنیا میں دہشت گردانہ حملے، القاعدہ اور آئی ایس آئی ایس کا پھیلاؤ، اور شامی مہاجرین کا تباہ کُن بحران، سب اسی بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قابلِ پیشگوئی مستقبل میں مغرب کی تمام سیاسی اور معاشی جنگیں مشرقِ اوسط میں واقع ہوں گی۔

لہٰذا مشرقِ اوسط اور مغرب کے درمیان کشمکش کا ادراک پہلے درجے کی اہمیت رکھتا ہے، یہی اس کتاب کو لکھنے کی بنیادی وجہ ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کشمکش کا بنیادی محرّک ان دو خطوں کے مقدروں کے درمیان وسیع ناہمواری ہے۔ معاشی ناہمواری حقیقی ہے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں کچھ خلیجی ریاستوں نے قابلِ ذکر تیل کی دولت حاصل کر لی، لیکن آبادی کے بہت قلیل حصے نے اس کا کوئی ثمر دیکھا ہے۔ بہرحال یہ دولت چند روزہ ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، ان تیل سے مالا مال اقوام میں سے کسی کے بارے میں یہ شہادت نہیں ہے کہ اُنہوں نے بہتر معیشت کی طرح کی کوئی چیز قائم کی ہو، جو اس وقت بھی قائم رہے گی جب دُنیا بطور توانائی کے ایک بنیادی ذریعے کے پیٹرولیم سے کسی اور جانب رجوع کرے گی۔



مغرب اور باقی ماندہ دُنیا کے درمیان اسی معاشی تفاوت نے، اُنیسویں اور بیسویں صدیوں میں شرقِ اوسط پر مغربی تسلط اور سامراجیت کی راہ ہموار کی۔ اسی معاشی تفاوت نے، بیسویں صدی کے زیادہ تر حصے میں اُن آمرانہ حکمرانوں کو شرقِ اوسط کی سیاست پر غلبے کو ممکن بنایا، جنہیں مغرب کی حمایت حاصل تھی.....ان نتائج کی بہت گہری تاریخی جڑیں ہیں، اور اس کتاب کا ہدف یہ ہے کہ ان جڑوں کو دریافت اور اُن کا تجزیہ کرے۔ اس میں پیش کئے گئے دلائل تقابلی ہیں۔ اگر مشرقِ وسطیٰ میں کچھ غلط ہوا، تو اس کے اسباب کو سمجھنا آسان تر ہے اگر اُس کا تقابل اُس سے کیا جائے جو مغربی یورپ کے بعض حصوں میں صحیح ہوا۔ لہٰذا اس کتاب کا ہدف دوُرخا ہے۔ ایک طرف یہ دیرپا معاشی کامیابی کے بعض لازمی تعین کاروں کی بصیرت مہیا کرتی ہے۔ دوسری طرف یہ واضح کرتی ہے کہ اگر یہ تعین کار غیر موجود ہوں تو کوئی معیشت کب اور کیسے جمود کا شکار ہوجاتی ہے۔

اگر گہرے طور پر غور وفکر کیا جائے، تو مغرب اور مشرقِ وسطیٰ کی معاشی خوشحالی کے درمیان یہ وسیع فرق اس قدر واضح نہیں ہے۔ اس فرق کا کوئی بھی بیان اس چیز کی بھی توجیہہ کرے گا کہ صورتِ حال ہمیشہ ایسی نہیں رہی۔ اسلام کے قائم ہونے کے بعد صدیوں تک مشرقِ وسطیٰ کسی بھی پیمانے سے مغرب سے حقیقتاً آگے رہا ہے۔ معاشیات، سیاسیات ثقافت اور سائنس کے پیمانے سے۔ قرونِ وسطیٰ کے جوبن کے دور سے، زرخیز ہلال مغربی یوریشیا کا ثقافتی اور معاشی مرکز تھا۔

کسی نہ کسی نقطے پر یہ سب کچھ واضح طور پر تبدیل ہوگیا۔ میرے علم کے مطابق کسی دانشور نے یہ استدلال نہیں کیا کہ اٹھارویں صدی کے وسط میں صنعت کاری کے وقت مشرقِ وسطیٰ کسی سرکردہ یورپی معیشت کے قریب بھی تھا۔ صنعت کاری کے بعد وہ واضح معاشی اختلافات جو پہلے سے موجود تھے کئی گُنا مزید شدید ہوگئے۔ لہٰذا اب حقیقی سوالات یہ ہیں:

وہ خطہ جو اس قدر طویل عرصے تک اس قدر آگے تھا۔ آخرِ کار پیچھے کیوں رہ گیا؟ صنعتی انقلاب برطانیہ میں کیوں شروع ہوا بجائے مثال کے طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے؟

یہ کتاب ان سوالات کے جوابات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کرتی ہے.....ایسا کرتے ہوئے یہ اس بھاری بھرکم مسئلے سے بھی نپٹتی ہے جس کو مغربی ذرائع ابلاغ اور دانشوروں کے اظہاریوں کی طرف سے مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کی ایک توجیہہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی اسلام۔ میرا

www.KitaboSunnat.com

ماننا ہے کہ ایسے دعوے مضحکہ خیز ہیں۔ لیکن اُنہیں بغیر کسی قائل کُن توجیہہ مہیا کرنے کے محض یونہی ردّ نہیں کیا جاسکتا..... میں ایسی توجیہہ پیشِ کررہا ہوں، اگرچہ یہ بات قاری پر ہے کہ آیا وہ اسے قائل کُن سمجھتا ہے یا نہیں۔ میری توجیہہ کی بنیاد گہرے طور پر معاشی نظریے پر ہے اور یہ اُن تمام عوامل کو مدِ نظر رکھتی ہے جنہوں نے اس تبدیلی میں کوئی کردار ادا کیا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری اُس کردار کا ایک گہرا ادراک حاصل کر پائے گا، جو اسلام نے مشرق وسطیٰ کے معاشی جمود اور مغرب کے ساتھ کشمکش میں ادا کیا۔

یہ استدلال ایک مرکزی نقطے کے بارے میں اُمید افزا طور پر واضح ہے: بذات خود اسلام مسئلہ نہیں ہے۔ تاہم جہاں مذہب سیاست میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہو، وہاں معاشی کامیابی کا امکان کم ہوتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب بھی عمومی طور پر مذہب کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں ہے۔ کوئی بھی مفاداتی گروہ جسے سیاست کی سودا بازی کی میز پر طاقتور نشست حاصل ہو، لیکن اُس کے مفادات معاشی ترقی کے ساتھ لگا نہ کھاتے ہوں، وہ کسی بھی معاشرے کی معاشی ترقی میں منفی کردار ادا کرے گا۔ تاریخی اعتبار سے، ایسے اسباب کی بنا پر جو اس کتاب میں واضح کئے گئے ہیں، مشرق وسطیٰ اور مغربی یورپ، دونوں میں مذہبی مقتدرہ کو سیاسی بساط پر بہت زیادہ تسلط حاصل تھا۔ لہٰذا دونوں خطوں کے درمیان طویل مدتی معاشی فرق کو سمجھنے کیلئے، اُس عمل کو سمجھنے کی غایت ضرورت ہے جس کے ذریعے اس مقتدرہ کو آخر الذکر میں تو ختم کر دیا گیا لیکن اوآل الذکر میں ختم نہیں کیا جاسکا۔

یہ کتاب مشرقِ وسطی اور مغرب کے درمیان معاشی عدم مساوات کو ختم کرنے کے لیے کوئی حل پیش نہیں کرتی۔ یہ محض مسئلے اور اس کے اسباب کی تشخیص کرتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ایک ڈاکٹر کو علاج تجویز کرنے سے پہلے صحیح تشخیص چاہیے، اسی طرح۔ اگر ہم اُن سیاسی اور معاشی اقدامات کو سمجھنا چاہتے ہیں جو اس فرق کو ختم کرنے میں مدد دیں تو اس فرق کی صحیح تشخیص بہت اہم ہے۔ اس کتاب کی طرف سے مہیا کردہ تشخیص اسلام کے کسی سادگی پسند تصور پر مبنی نہیں ہے، اور یہ کتاب غیر معیاری معاشی کارکردگی کیلئے اسلام کو کسی بھی اور مذہب کی نسبت زیادہ موردِ الزام قرار نہیں دیتی..... یہ، یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ مشرق وسطی کیلئے مذہب کو سیاست سے خارج کر دینا ایک انتہائی اہم اور ضروری اقدام ہوگا، لیکن یہ بھی ایک مکمل حل نہیں ہے۔



مشرقِ وسطیٰ میں فوری نتیجے کی توقع کرنا بے سود ہے مذہب کو سیاست سے (زیادہ سے زیادہ) خارج کرنے کیلئے مغرب کو صدیاں لگیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ تناظر ایک اہمیت رکھتا ہے اور دونوں خطوں کے معاشی اور سیاسی تناظرات بہت مختلف ہیں۔ ایک اہم فرق جس پر اس کتاب میں توجہ دی گئی ہے یہ ہے کہ اسلام موروثی سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے میں عیسائیت سے زیادہ ساز گار ہے جو کہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اُن تبدیلیوں کو یقیناً متاثر کرتی ہے جو مشرق وسطیٰ میں ممکن ہیں۔ لیکن اگر مذہب کو سیاست سے خارج بھی کر دیا جائے تو یہ صرف ایک پہلا قدم ہوگا۔ یہ بات بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ سودا بازی کی بساط پر مذہبی اشرافیہ کی جگہ کون لیتا ہے۔ مثلاً اگر مذہبی اشرافیہ کی جگہ آمر لے لیتے ہیں تو یہ معاشی اور ذاتی بہبود کیلئے یقیناً بدتر صورتِ حال ہوگی۔

اسلامی بنیادی پرستی کا عروج اور پھیلاؤ ممکن طور پر بیسویں صدی کی زندہ رہنے والی کہانیوں میں سے ایک ہوگا۔ اس کو روکنے کا بہترین طریقہ..... بلاشبہ کسی بھی قسم کی انتہا پسندی کو روکنے کا بہترین طریقہ..... معاشی ترقی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انتہا پسندانہ خیالات، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، اُس وقت بہت زیادہ پُرکشش ہوتے ہیں جب ایک بہتر مستقبل کی بہت کم اُمید ہو۔ ایسے خیالات، اور اُن کو بروئے کار لانے والی شدید انتہا پسندانہ تراکیب ایک ایسی دُنیا کی ذیلی پیداوار ہیں جو معاشی طور پر پیچھے رہ گئی ہے..... میری مخلصانہ اُمید یہ ہے کہ یہ کتاب ہمیں ایسے معاشی جمود کے ذرائع کو سمجھنے کے ایک قدم قریب تر لے جائے گی، جبکہ یہ اس بات پر بھی کچھ روشنی ڈالے گی کہ، مشرقِ وسطیٰ میں کونسا راستہ ایک طویل مدتی مستقل معاشی ترقی کی طرف لے جائے گا۔

www.MashalBooks.org

# (1)

# تعارف

تقریباً کسی بھی دستیاب پیمانے کے مطابق، مشرقِ وسطیٰ اور مغرب کی معاشی اور سیاسی خوشحالیوں کے درمیان ایک وسیع فرق ہے۔ تیل کی دولت کو مدِنظر رکھنے کے باوجود، جس سے کہ مشرقِ وسطیٰ کے باسیوں کا ایک بہت قلیل حصہ فائدہ اُٹھاتا ہے، مغرب کے باشندے مشرقِ وسطیٰ کے باشندوں کی نسبت چھ گنا زیادہ دولت مند ہیں۔ وہ اوسط آٹھ مزید سال زندہ رہنے کی توقع کر سکتے ہیں اور تقریباً دوگنی تعلیم سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ (دیکھئے جدول 1.1)۔ مشرقِ وسطیٰ کی معاشی پسماندگی کی ایک وجہ اور نتیجہ..... کمزور حکمرانی اور تشدد ہے۔ ایک اوسط مشرقِ وسطیٰ کا باشندہ، ایک اوسط مغربی باشندے کی نسبت زیادہ کمزور اور آمرانہ ریاست میں رہتا ہے اور شہری اور نسلی تشدد کا کہیں زیادہ شکار ہوتا ہے۔ یہ بلاشبہ مشرقِ وسطیٰ اور باقی ماندہ دُنیا کے درمیان سیاسی تناؤ کی بنیادی وجہ ہے۔ اور یہ اسلام پسندوں کی طرف سے اپنائی گئی سیاسی اور معاشی شکایات کی بنیاد ہے۔

**جدول 1.1:** معاشی اور سیاسی صحت ''مغرب'' اور مشرقِ وسطیٰ / شمالی افریقہ (MENA)



2012-2014 (آبادی کے حساب سے پیمائش کی گئی)

| o | ''مغرب'' | MENA | توضیح و اشارات |
|---|---|---|---|
| **فی کس جی ڈی پی** | | | |
| (مجموعی قومی پیداوار) | 48,269ڈالر | 8,009ڈالر | 2013 میں امریکی ڈالر |
| امکانِ حیات | 80.4 | 72.6 | 2013 میں پیدائش کے وقت امکان حیات |
| تعلیم کے اوسط سال | 12.1 | 6.8 | 2012 کے اعداد و شمار |
| ریاستی کمزوری | 1.42 | 11.11 | 0-25 (25 سب سے کمزور ہے) |
| شہری یا نسلی تشدد/جنگ | 0.00 | 1.03 | 0-10 (10 سب سے زیادہ پُرتشدد ہے) |
| شخص مطلق العنانی | 0.00 | 3.58 | 0-10 (10 سب سے زیادہ آمرانہ ہے) |

## ذرائع

مجموعی قومی پیداوار .....ورلڈ بینک (2014) تعلیم۔ یو این ڈویلپمنٹ پروگرام (2014): آبادی.....سی آئی اے ورلڈ فیکٹ بک (2014); تمام اعداد و شمار کی پیمائش 2014 کی آبادی کے مطابق کی گئی; مجموعی قومی پیداوار اور کمزوری 2013 میں ہیں; تشدد اور مطلق العنانی 2014 میں ہیں۔

مغربی یورپ میں شامل ہیں: آسٹریلیا، آسٹریا، بلجیم، کینڈا، ڈنمارک، فن لینڈ، فرانس، جرمنی، آئرلینڈ، لکسمبرگ، نیدرلینڈز، نیوزی لینڈ، پُرتگال، سپین، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، برطانیہ اور امریکہ۔

## MENA میں شامل ہیں:

الجیریا، بحرین، مصر، ایران، عراق، اُردون، کویت، لبنان، لیبیا، مراکش، عمان، قطر، سعودی عرب، شام، تیونس، یو اے ای۔ مغربی کنارہ اور غزہ، اور یمن۔

## مغرب اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان

بلاشبہ، مغرب اور باقی ماندہ دُنیا کے درمیان یہ فرق نسبتاً ایک تازہ مظہر ہے۔ ماقبل صنعتی دور میں، مغربی یورپ واضح طور پر باقی ماندہ دُنیا سے آگے نہیں تھا، اور یہ مشرقِ وسطیٰ سے اس قدر زیادہ

www.MashalBooks.org

آگے نہیں تھا کہ سلطنت عثمانیہ (سرکردہ مشرقِ وسطیٰ کی ریاست) معاشی یا سیاسی طور پر اپنے آپ کو کمتر سمجھتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ، ایک وسیع معاشی، سیاسی، عسکری، اور تکنیکی فرق دونوں میں نمایاں ہوتا گیا۔ اس فرق نے یورپیوں کیلئے باقی ماندہ دُنیا پر معاشی اور سیاسی طور پر غلبہ حاصل کرنے کی گنجائش پیدا کی، جو کہ ایک ایسی حقیقت ہے جو دُنیا کے بیشتر آباد حصے کو اُن کی طرف سے نوآبادیات بنانے کی حقیقت سے واضح ہے۔ اسی دوران، اُنیسویں صدی کے آتے آتے، سلطنت عثمانیہ کو ''یورپ کا مردِ بیمار'' سمجھا جانے لگا..... جو کبھی ایک عظیم سلطنت تھی جو اپنے آخری پیروں پر تھی۔ سرکردہ مغربی طاقتوں نے آخر کار مشرقِ وسطیٰ کو ایسی ریاستوں کی شکل میں تراش لیا، جن کی ایسی مصنوعی سرحدیں تھیں جو یورپ کی جغرافیائی سیاسی ضروریات سے مطابقت رکھتی تھیں۔

یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی معیشت مغرب کی معیشت سے بہت واضح طور پر مختلف ہوگئی۔ لیکن اس اختلاف کی وجہ کیا ہوئی؟ یہ فرق اس کی نسبت بہت زیادہ پریشان کُن ہے، جتنا یہ اکیسویں صدی کے تناظر سے محسوس ہوگا۔ پچھلی ایک یا دو ہزاریوں کے زیادہ تر عرصے سے مغربیوں کے مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں سے رابطے باقی ماندہ دُنیا کی نسبت زیادہ تھے۔ مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان بین الثقافتی تفہیم اُس سے زیادہ کثرت سے واقع ہوئی جتنی مغربی یورپ اور باقی ماندہ دُنیا کے درمیان ہوتی۔ ان دونوں خطوں کے درمیان مشابہتیں اور نسبتاً یکجائی مغرب کی مقابلۃً کامیابی کو اور بھی زیادہ پُراسرار بنا دیتی ہیں۔ کس چیز نے مغرب کی معیشتوں کو کامیاب کرنے اور مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کو منجمد رکھنے کی راہ پیدا کی؟

یہ ہے وہ سوال جس سے اس کتاب میں نمٹا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب اس بارے میں ہے کہ کیوں کچھ معیشتیں کامیاب ہوتی ہیں اور دوسری منجمد ہو جاتی ہیں۔ اس سوال سے احتراز کرنا ناممکن ہے۔ خواہ یہ کچھ لوگوں کی ناراضگی کا سبب بھی ہو؛ کسی مفروضے کو اس وجہ سے مسترد کرنا کہ وہ ناگوار ہے، ایک بُری سائنس ہے۔ اور اس امکان کو ہی ردّ نہ کرنے کی ایک وجہ ہے۔ اسلامی تاریخ کے مشہور عالم برنارڈ لیوس، اپنی زندگی کے آخری حصے میں اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ (2) اور اسلامی فلسفے اور عمل کے ساتھ بُرے نتائج کو منسوب کرنے کی ایک طویل مستشرقانہ روایت ہے۔ یہ مغربی ذرائع ابلاغ کا ایک عام طنز بھی ہے، جہاں اسلام اور ''خراب'' سیاسی، سماجی اور معاشی واقعات کے درمیان سہل پسندانہ تعلق



جوڑنا بہت عام ہے۔ اگرچہ ذرائع ابلاغ میں آنے والی زیادہ تر کہانیوں کو محض تھوڑے سے گہرے جائزے پر اُڑا دینا آسان ہے۔ لیکن مستشرقین کے زیادہ ذہین انداز سے قائم کئے گئے دلائل کو اُڑانا اتنا آسان نہیں ہے۔ لیوس اور دوسرے لوگ مشرقِ وسطیٰ اور اسلامی تاریخ کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے۔ اور بلاشبہ اسلام تجارت اور حکمرانی سے متعلق اپنے اندر متعدد مناسب ضابطے رکھتا ہے۔

پس۔ اسلام موردِ الزام کیوں نہیں ہے؟ اس کا جواب سادہ سا ہے: خواہ کوئی شخص اس تصوّر کو قبول بھی کر لے کہ مذہبی اصول معاشی کارکردگی کیلئے اہم ہیں، تو بھی حقائق اس کیلئے بالکل مرتب نہیں ہوتے۔ صنعت سازی سے قبل کی ہزاری میں ان خطوں کی تواریخ اس تصور سے مطابقت نہیں رکھتیں کہ اسلام معاشی ترقی کے مخالف ہے۔ اس بارے میں کسی بھی نظریے میں کہ، جدید معیشت مشرقِ وسطیٰ کی بجائے مغربی یورپ میں کیوں پیدا ہوئی، مدِنظر رکھنے کی اہم حقیقت یہ ہے کہ، اسلام کے فروغ کے بعد صدیوں تک مشرقِ وسطیٰ، معاشی، ٹیکنولوجیاتی، اور ثقافتی اعتبار سے، یورپ سے آگے تھا۔ ساتویں صدی سے لے کر بارھویں صدی تک، اسلامی سلطنتیں مغربی یوریشیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ اسلام اپنی پہلی چار یا پانچ صدیوں میں مثبت معاشی ترقی کے ساتھ منسلک تھا۔

معیشتوں کے اندر اور بین المعیشتی طور پر، آٹھ سے دس صدیاں پہلے، دولت کی عالمی تقسیم، اکیسویں صدی کی نسبت بہت مختلف تھی۔ مغربی یورپ نسبتاً ایک غریب علاقہ تھا..... قانون کی حکمرانی صرف چھوٹے، آباد علاقوں میں تھی۔ چھوٹے پیمانے کی بین العلاقائی تجارت موجود تھی۔ آبادیاں چھوٹی چھوٹی اور بکھری ہوئی تھیں، اور سائنس اور ٹیکنالوجی دوسرے علاقوں سے بہت پیچھے تھی۔ تقریباً کسی بھی دستیاب پیمانے کے مطابق مشرقِ وسطیٰ یورپ سے آگے تھا۔ اس کی رسائی بہت ترقی یافتہ ٹیکنالوجی تک تھی۔ اس کی تجارت بہت بڑی مقداروں میں اور طویل تر فاصلوں تک جاری تھی۔ اور ان کے ہاں زیادہ پیچیدہ آلات استعمال کئے جاتے تھے۔ اس بیان کی تائید میں بہت زیادہ شہادت موجود ہے۔ ریاضی۔ طب، فلسفہ فن، اور فن تعمیر میں بڑی بڑی پیش رفتیں، تیرھویں صدی میں اسلامی دُنیا کا طُرّۂ امتیاز تھیں۔ جوں جوں ہم پیچھے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ اعداد و شمار یقیناً بہت کم ہیں، لیکن قبل جدید صورتِ حال میں دولت وہ ایک اشاریہ

جس کے اعداد وشمار ہمارے پاس ہیں وہ شہری آبادی کا حجم ہے۔ شہری آبادی قبل جدید معاشی کارکردگی کے ایک پیمانے کے طور پر کام کرتی ہے، کیونکہ بڑی بڑی شہری آبادیوں کا مطلب ہے کہ، ایسے لوگوں کیلئے جو اپنے گزارے کیلئے کچھ پیدا نہیں کر رہے تھے، خوراک مہیا کرنے کیلئے کافی کچھ موجود تھا۔ اور شہری لوگ عام طور پر آسائشاتِ زندگی پیدا اور استعمال کر رہے تھے۔ مختصراً بڑی شہری آبادیوں کا مطلب عمومی طور پر زیادہ دولت تھا۔(3)

شہری آبادی کے اعداد وشمار مشتبہ رُجحان کی تائید کرتے ہیں۔ پچھلے 1,200 سالوں میں مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان معاشی مقدروں کی ایک سُست لیکن واضح پلٹے کو ظاہر کرتے ہوئے۔ شکل ا.ا یہ ظاہر کرتی ہے کہ 800 میں اسلامی دُنیا کا شہری آبادی کا تناسب عیسائی یورپ کی نسبت بہت زیادہ تھا۔(4) یورپ اور مشرق وسطیٰ میں بائیس سب سے بڑے شہروں میں سے چودہ .....بشمول سب سے بڑے شہر۔ عباسی دارالحکومت بغداد کے .....اسلامی حکومت کے ماتحت تھے۔ جدید دور کے سپین میں اُموی خلافت (قرطبہ) اور جدید عراق میں مرتکز، عباسی خلافت، گنجان آباد ترین اور امیر ترین علاقوں پر حکومت کرتی تھیں .....آٹھ گنجان آباد ترین شہروں میں سے سات پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ جبکہ صرف ایک شہر بازنطینی دارالحکومت قسطنطنیہ ایسا تھا جس میں عیسائیوں کی ایک بڑی شہری آبادی تھی۔ درحقیقت عیسائی مغربی اور وسطی یورپ کے سب سے اوپر کے تیرہ شہروں (نیپلز، روم، ویرونا، ریجنز برگ، مٹز، پرس، سپئیر، مینز، ریمز، ٹورز، کولون، ٹرائیر لولیون) کی مشترکہ آبادی، 800 میں بغداد کی آبادی سے کم تھی۔

**شکل 1.1:** CE 800 میں یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے بیس گنجان آباد ترین شہر۔



ذریعہ: بوسکرائے آل (2013)

تیزی سے پانچ سو سال آگے گزر جائیے۔ 1300 تک گزشتہ پیروں میں بیان کیا گیا منظر بلاشبہ تبدیل ہوا، لیکن پھر بھی منگولوں کی طرف سے کچھ شہری آبادیوں کی چھٹائی کے باوجود مشرقِ وسطیٰ پسماندہ ہونے سے بہت دور تھا۔ 1300 تک مغربی یورپ کی معیشتیں دوبارہ ترقی کر رہی تھیں۔ رُومی معاشی انحطاط کے بعد، خاص طور پر شمالی اٹلی میں۔ اور مغربی یورپ کے بہت سے حصے ٹھیک ٹھاک اپنی بحالی کی راہ پر تھے۔ شکل 1.2 یہ ظاہر کرتی ہے کہ عیسائی اور مسلم دُنیاؤں کے درمیان طاقت کا توازن بہت مساوی تھا، اس طرح کہ اوپر کے بارہ شہروں پر عیسائیوں کی حکومت تھی (بشمول سب سے زیادہ گنجان آباد شہر پیرس کے)۔ یورپی ترقی کا مرکز اٹلی میں واقع تھا .....بارہ عیسائی شہروں میں سے چھ اٹلی میں تھے۔ جن میں چار امیر شمالی علاقے میں واقع تھے۔ شمالی اٹلی کی شہری ریاستیں، خاص طور پر وینس، جینوا اور فلورنس، دُنیا کے امیر ترین مقامات میں سے تھے جو جدید بینکنگ، مالیات، شماریات اور تجارت کے بہت سے پہلوؤں کو جنم دے رہے تھے۔ شمال مغربی یورپ اوائل چودھویں صدی میں مسلم خطے کی امیر ترین ریاست (مصر) سے قدرے زیادہ دولت مند تھا، جبکہ اٹلی مغربی یورپ کے کسی بھی حصے کی نسبت، چہ جائیکہ مشرقِ وسطیٰ، تقریباً دوسو گنا دولت مند تھا۔(5)

**شکل 1.2:** CE 1300 میں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے بیس گنجان آباد ترین شہر۔

ذریعہ: بوسکرائے آل (2013)

1800 تک مقدّروں کا یہ پلٹا مکمل ہو گیا۔ علاقے میں بیس گنجان آباد ترین شہروں میں

سے سترہ نہ صرف عیسائی تھے، بلکہ مغربی یا وسطی یورپ میں واقع تھے۔ برطانیہ عظمیٰ میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہو چکا تھا، اور یورپی طاقتوں نے باقی ماندہ دُنیا کے بہت سے حصے کو نوآبادیاں بنالیا تھا۔ حقیقی معاوضہ جات شمال مغربی یورپ میں مسلم دُنیا کے امیر ترین حصوں کی نسبت بھی بہت زیادہ تھے۔ (6) یہ فرق صرف کلی طور پر شمالی مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان نہیں تھا۔ اس وقت تک حقیقی معاوضہ جات شمالی مغربی یورپ اور چین، جاپان اور ہندوستان کے درمیان بھی حیرت انگیز طور پر مختلف تھے۔ (7)

**شکل نمبر 1.3:** یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں بیس گنجان آباد ترین شہر 1800 عیسوی

شکل 1.4 معاشی مقدروں میں اس رُجحان کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔ یہ شکل 800 سے 1800 تک ہر صدی کیلئے مغربی یوریشیا کے ''شہری مرکزِ ثقل'' کو پیش کرتی ہے۔ یہ اُن علاقوں کے مطابق پیمائش کے لحاظ سے جہاں شہری لوگ رہتے تھے۔ اوسط طول بلد اور عرض بلد کا ایک سادہ پیمانہ ہے۔ زیادہ گنجائش آباد علاقے مرکزِ ثقل کو اپنے قریب تر ''کھینچتے تھے۔'' اس شکل میں راستہ واضح ہے۔ 800 میں مغربی یوریشیا کا شہری مرکز اناطولیائی جزیرہ نما کے عین مغرب میں تھا۔ اسے عباسی خلافت کی طرف سے جس کا مرکز عراق میں تھا۔ جنوب مشرق کی طرف سے سخت کشش کا سامنا تھا۔ جبکہ اسے مصر کے پُر رونق شہری علاقوں کی طرف سے جنوب کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ اس بات کی بنیادی وجہ کہ یہ مرکز عباسی دارالخلافہ سے اس قدر دور مغرب میں تھا، یہ تھی کہ جزیرہ نما آئبیریا میں مسلمانوں کی بڑی شہری آبادیاں موجود تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ، شہری مرکز شمال مغرب کی طرف منتقل ہو گیا؛ پہلے اٹلی کی طرف جیسا کہ دسویں صدی کے آواخر میں شمالی



اطالیائی شہری ریاستیں وسیع ہونا شروع ہوئیں اور آخرِ کار سولھویں تا اٹھارویں صدی شمال مغربی یورپ کی طرف جیسا کہ باقی ماندہ خطے کی مناسبت سے انگلستان اور ڈچ ریپبلک بھی اُبھرنے لگیں۔ 1800 تک مغربی یوریشیا کا شہری مرکز شمال مغربی اٹلی میں، میلان کے نزدیک واقع تھا .....جو کہ قدیم عباسی دارالخلافہ بغداد سے تقریباً دو ہزار میل دور تھا، لیکن شمال مغربی یورپ کے دو عظیم تجارتی شہروں، لندن ایمسٹرڈیم سے صرف 500.....600 میل کے فاصلے پر تھا

**شکل 1.4:** یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں مرکزِ ثقل 1800.....800

**نوٹ**

شکل 1.1 سے 1.4 تک کے نقشے محض مثل پیش کرنے کے مقاصد کیلئے ہیں۔ یورپ اس نقشے میں اپنی روایتی مثل کی نسبت درے جھکا ہوا ہے تا کہ پورے خطے کو جگہ دی جا سکے۔

**ذریعہ:** بوسکراے آل (2013)

آخر کار، مقدروں کے پلٹے کی کسی بھی توجیہہ کو دو تاریخی پہلوؤں سے مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ اوّل اسے عظیم مسلم سلطنتوں کے عروج اور ساتھ ہی ساتھ اُن کے مقابلۃً جمود دونوں کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ دوم، اگرچہ اشکال 1.1 تا 1.4 سے یہ واضح نہیں ہے، لیکن جدید معیشت بڑی حد تک شمال مغربی یورپ کی پیداوار ہے.....یعنی انگلستان کی اور اُس سے پہلے نیوز لینڈز کی۔ لہٰذا اس بات کی تفہیم کہ جدید دولت کہاں سے آئی، لازماً مغربی یورپ کے اندر طویل مدتی افتراق کی توجیہہ کرے گی۔

اس کتاب کا مقصد ان دونوں موضوعات سے ایک متوازن ڈھانچے میں نمٹنا ہے۔ یہ ڈھانچہ ان سادگی پسندانہ نظریات سے صرف نظر کرتا ہے کہ اس تبدیلی کی بنیاد میں اسلام ہے یا اس کے برعکس، کیتھولسزم یا پروٹسٹنزم یورپی کامیابی کے اسباب ہیں۔ ہاں البتہ یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ یہ بات اہم ہے کہ سیاسی اہل اقتدار نے کس طرح مذہب کو اپنے اقتدار کو جواز بخشنے کیلئے استعمال کیا اور مذہب سے موروثی اقتدار اور اُس سے معاشی نتائج کی ٹھیک ٹھیک تصویر کشی کا دارومدار تاریخی عوامل پر ہے۔



# استدلال کے مضمرات اور محدودات

جیسا کہ تیمور کُران (Timur Kuran) نے اسے نام دیا ہے۔ اس ''طویل افتراق'' کے نتائج اس اکیسویں صدی میں بھی ہمارے ساتھ موجود ہیں..... اگر تیل کی دولت کا دھما کہ نہ ہوتا، تو مشرقِ وسطیٰ کرّہ ارض کے غریب ترین مقامات میں سے ہوتا، جس کا مقابلہ صرف زیریں صحارائی افریقہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے بعض حصے کرتے۔ اس بات کی تحقیق کا جواز پیدا کرنے کیلئے تاریخی تجسس پسندی ہی کافی ہے کہ یہ علاقہ ..... جو کبھی دُنیا کا امیر ترین اور متمدن ترین خطہ تھا۔ کیسے پیچھے چلا گیا۔

لیکن تاریخی تجسس ہمیشہ کافی نہیں ہوتا۔ مؤرخین اور دوسرے دانش ورانہ ذہن کے افراد، تاریخی رشتوں کو بے نقاب کرنے کو فی ذاتہٖ ایک مقصد سمجھتے ہیں، لیکن دوسرے لوگ اس قسم کی تاریخی تحقیق کو صرف اُس وقت قابلِ قدر سمجھتے ہیں جب یہ ہم عصر مسائل پر روشنی ڈالے۔ یہ کتاب ایسے قاری کی تسکین کا موجب ہوگی۔ یہ سب سے پہلے اور سب سے اہم ایک معاشیات کی کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی معیشت کے عمومی خدوخال کی تحقیقات کرنے کیلئے، ایک معاشی نظریے کا استعمال کرتی ہے جو کچھ حالات کے تحت پھلتی پھولتی ہے اور کچھ دوسرے حالات کے تحت جامد ہو جاتی ہے۔ یہ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کی تاریخ کو اس نظریے کیلئے ایک آزمائشی میدان کے طور پر استعمال کرتی ہے۔ تاریخِ معاشی مفروضوں کیلئے بہترین آزمائشی میدان مہیا کرتی ہے: کیا کچھ واقع ہوا، یہ ہمارے پیچھے ہے۔، اور اس کے دور اس نتائج واضح ہیں۔ یہ بات یقیناً مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان طویل المدتی افتراق کے بارے میں صحیح ہے۔ معیشتوں کا ایک سیٹ آغاز میں خاصا پیچھے ہونے کے باوجود،

www.MashalBooks.org

طویل عرصے میں واضح طور پر بہت زیادہ کامیاب ہوا۔

یہ کتاب اس مسئلے سے ایک عام معاشی استدلال سے نمٹتی ہے۔ جب ماہرینِ معیشت یہ کہتے ہیں کہ کوئی ادراک ''عمومی'' ہے، تو ان کا مطلب ہوتا ہے کہ یہ بہت سی صورت ہائے حال پر لاگو ہوتا ہے، اور یہ کہ یہ ادراک مختلف مستعمل پیمانوں پر انحصار کرتے ہوئے مختلف نتائج دے سکتا ہے۔ اس کتاب کا ہدف ایک عمومی ادراک مہیا کرتا ہے، اس بارے میں کہ معاشی خوشحالی اور جمود بڑے طویل عرصوں پر محیط کیوں اور کیسے واقع ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ صرف مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کیلئے ہی فکرمندی کا موضوع نہیں ہے: اسی کتاب میں پیش کئے گئے دلائل مضمرات انسانی مصائب کو کم کرنے کے اُس مُشکل عمل کیلئے ہیں، جس کا تعلق پوری دنیا میں معاشی پسماندگی سے ہے۔ بہرحال، مغربی یورپ بھی کسی وقت معاشی طور پر ایک پسماندہ خطہ تھا۔ اور قرونِ وسطیٰ کے یورپیوں کی اوسط دولت آج کل کے دُنیا کے بہت سے غریب ترین حصوں سے بھی کم تر تھی۔ اگر ان میکانیوں کو سمجھ لیا جائے جن کے ذریعے مغربی یورپ نے ایسی غربت سے نجات حاصل کی۔ اور مشرقِ وسطیٰ بڑی حد تک حاصل نہ کر سکا، تو اس میں اکیسویں صدی کی ترقی پذیر دُنیا کی معاشی ترقی اور، اُس کے امکانات اور محدودات کیلئے مفاہیم پوشیدہ ہیں۔

لہٰذا مغربی یورپ اور باقی ماندہ دُنیا کے درمیان طویل مدتی افتراق کی تاریخ کو سمجھنا محض تاریخی دلچسپی کے لحاظ سے ہی اہم نہیں ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں اس بارے میں بھی ایک پیغام ہے کہ ہم دُنیا کو کس طرح سے دیکھتے ہیں اور اسے کس طرح تبدیل کر سکتے ہیں۔ باب دوم میں پیش کئے گئے معاشی ڈھانچے کو استعمال کرتے ہوئے یہ کتاب تاریخی ماضی کا کھوج لگاتی ہے، یہ معلوم کرنے کیلئے کہ وہ کیا عوامل تھے جنہوں نے مغربی یورپ میں کام کیا لیکن مشرقِ وسطیٰ میں کام نہ کیا..... لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ مغربی یورپ کے معاشی پودے کو اکھاڑ کر مشرقِ وسطیٰ میں لگا دینے سے اس کے سارے معاشی مسائل حل ہو جائیں گے۔ بلکہ بالکل اس کا اُلٹ سچ ہے: وہ حل جنہوں نے مغربی یورپ میں کام کیا وہ ایک مخصوص تناظر میں اُبھرے اور ارتقا پذیر ہوئے۔ اس بات کی حدود متعین کرنے کیلئے کہ گزشتہ تجربہ کس طرح حال کو روشنی بخش سکتا ہے، اس تناظر کو سمجھنا لازم ہے۔



نہ ہی یہ کتاب اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اپنے مقدر کو تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ درحقیقت اس کتاب کے ڈھانچے سے حاصل کیا جانے والا پہلا ادراک یہ ہے کہ کسی بھی معاشرے کی معاشی، سیاسی اور ادارہ جاتی ترقی کے راستے کے ساتھ بہت سے دوراہے ہوتے ہیں۔ جب کوئی معاشرہ کسی دوراہے میں کوئی ایک راستہ اپناتا ہے، تو وقت کے ساتھ ساتھ دوسری طرف کو واپس جانا زیادہ سے زیادہ مشکل ہوتا جاتا ہے۔ لیکن ہر وقت نئے دوراہے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات ناقابلِ پیش بینی اور ناقابلِ ادراک اسباب کی وجہ سے جیسا کہ نئی ٹیکنالوجیوں یا فطری حادثات کی وجہ سے..... اس بات کے، کہ معاشرہ ان مواقع کا کیا ردِعمل دے گا یا یہ کہ کب کوئی موقع پیدا ہوگا..... تاریخ جبری نہیں ہے۔ ہم اپنے تاریخی یا ادارہ جاتی ماضی کے غلام نہیں ہیں۔

یہ کتاب اسی بات کی طرف ہی اشارہ نہیں کرتی کہ اُس طرح کامیابی کا تجزیہ جو مغربی یورپ کو ہوا، صرف وہیں پر واقع ہو سکتا تھا۔ جنوبی کوریا اور تائیوان کی بیسویں صدی کی کامیابیوں مذہبی طور پر ایسے کسی دعوے کے خلاف شہادت دیتی ہیں۔ اس کی بجائے یہ کتاب اس بات کا ایک زیادہ باریک نقطہ نظر دیتی ہے کہ طویل المدّت معاشی کامیابی کیوں واقع ہوتی ہے، جبکہ عمومی خدّ وخال کی تلاش بار بار معاشی کامیابی سے مربوط ہوتی ہے۔

www.MashalBooks.org

# ترغیبات کے حوالے سے سوچنا

ماہرین معیشت ترغیبات کے حوالے سے سوچنے کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کتاب بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ ہر تاریخی موڑ پر یہ سوال پوچھتی ہے: متعلقہ فریقوں نے اُس طرح سے عمل کیوں کیا جس طرح سے کیا؟ دیئے جانے والے جواب کا نچوڑ اس کتاب میں یوں نکل آتا ہے: ''اُنہیں ایسا عمل کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔'' ترغیبات معاشرے کے بہت سے اوصاف سے پیدا ہوتی ہیں: سیاست، مذہب، سماجی معیارات، قوانین اور ثقافت ان میں سے چند ہیں۔ تفتیش یہیں پر ختم نہیں ہوسکتی: محض اُن ترغیبات پر توجہ دینا جن کا سامنا افراد کو ہوتا ہے آخری قدم ہے۔ یہ بہت اہم ہے کہ ایک قدم پیچھے کو ہٹا جائے اور پوچھا جائے: یہ ترغیبات سب سے پہلے وہاں کیوں تھیں؟ وہ ترغیبات جن کا سامنا لوگ کرتے ہیں مختلف جگہوں اور مختلف اوقات میں مختلف کیوں ہوتی ہیں اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل کیوں ہوتی ہیں؟ بعض اوقات وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل کیوں نہیں ہوتیں؟

ترغیبات کے حوالے سے سوچنے کا مطلب ہے طویل مدتی معاشی افتراق کے بارے میں سادگی پسندانہ خیالات کو رد کردینا۔ مثال کے طور پر اس خیال کو لیجئے کہ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے درمیان معاشی افتراق کی جڑ اسلام کی رجعت پسندانہ نوعیت'' ہے۔ یہ ایک عامی کا استدلال نہیں ہے۔ افتراق کی یورپ مرتکز توجیہات کی ایک طویل روایت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسلام کی ''قدامت پسندانہ'' ''متصوفانہ'' کیفیت نے تجسس کی حوصلہ شکنی کی اور خطرات کا سامنا کرنے میں۔

جدّت طرازی اور میکانکیت میں رُکاوٹ پیدا کی۔ (5) اس نقطۂ نظر کے مطابق اسلام جبلی



طور پر تجارت اور مالیات سے عناد رکھتا ہے۔ بلاشبہ بہت سے مقامات پر اور بہت سے اوقات میں مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے ایسے قوانین کی وکالت کی جنہوں نے معاشی ترقی کو روکا، جیسا کہ سود لینے اور چھاپہ خانے، عورتوں پر جبر کے قوانین کی اور ایسے قوانین کی جو عوامی تعلیم کی حوصلہ شکنی کرتے تھے اور وراثت اور شراکت داری کے قدیم قوانین کی ...... لہٰذا کم ازکم اسلام کی موجودگی اور معاشی ترقی کے مخالف قوانین میں ایک ''باہمی تعلق'' ضرور ہے۔

لیکن باہمی تعلق کا مطلب سبب ہونا نہیں ہے۔ ایک سادہ سی معاشی مثال، ''فطری دقیانوسیت'' پر انحصار کرتے ہوئے دلائل سے مسئلے کی وضاحت کرتی ہے۔ ذرا اس حقیقت پر غور کریں کہ عمر رسیدہ افراد ممکنہ طور پر کمپیوٹر کی ٹیکنالوجیوں کو بالغ افراد کی نسبت کم استعمال کرتے ہیں۔ بظاہر ایسا لگے گا کہ جیسے عمر رسیدہ افراد فطری طور پر زیادہ دقیانوسی ہوتے ہیں...... وہ ای میلز بھیجنے کی بجائے خطوط لکھنے کی روش پر قائم ہیں۔ تاہم یہ بہت ہی سادگی پسندانہ دلیل ہے۔ عمر رسیدہ افراد ترقی پسندانہ کمپیوٹروں کو اس وجہ سے کم استعمال نہیں کرتے کہ وہ بالغ افراد کی نسبت پُرانے طور طریقوں کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کم استعمال کرتے ہیں کہ ایک نئی ٹیکنالوجی کو سیکھنے کے اخراجات اور فوائد مختلف ہوتے ہیں۔ درحقیقت ہوسکتا ہے کہ وقت کے حوالے سے ایک ستر سال کے بوڑھے کیلئے انٹرنیٹ کا ماہر ہونا زیادہ مہنگا نہ ہو۔ لیکن ایک بوڑھے شخص کیلئے زندگی کے افق کا مختصر ہونا نا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انٹرنیٹ کی تعلیم کے فوائد کو مختصر تر وقت کیلئے استعمال کرسکیں گے، بلکہ اس کے وقت کے ساتھ منسلکہ اخراجات بھی فوائد کی نسبت بہت زیادہ ہوں گے۔ علاوہ ازیں کیونکہ ان کے دوستوں کا انٹرنیٹ پر آنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ لہٰذا بڑے نیٹ ورکوں کے ساتھ منسلکہ فوائد بہت کم ہوتے ہیں۔ لہٰذا عمر رسیدہ لوگ اکثر ایسے افعال کو اختیار کرتے ہیں جو زیادہ قدامات پسندانہ نتائج کی طرف لے جاتے ہوں، لیکن یہ چیز لازمی طور پر تبدیلی کی فطری مزاحمت کا نتیجہ نہیں ہوتی، اس کی بجائے ترغیبات کا ڈھانچہ ایسا ہے کہ عمر رسیدہ لوگوں کیلئے نئی ٹیکنالوجیوں کو سیکھنے کی ترغیب کم ہوتی ہیں۔

یہ کتاب معاشی تاریخ کے بارے میں ایسی ہی منطق کا اطلاق کرتی ہے۔ باب دوم ایک ایسا ڈھانچہ مہیا کرتا ہے جو ایسی منطق پر مبنی ہے'' جن کا سامنا متعلقہ کھلاڑیوں کو قوانین اور پالیسیوں پر سودے بازی کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ یہ ایسے حالات پر روشنی ڈالتا ہے جو ان

www.MashalBooks.org

کھلاڑیوں کو، ایسے قوانین اور پالیسیوں کا انتخاب کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ''دقیانوسی'' نتائج اُس وقت سامنے آتے ہیں۔ جب یہ حالات موجود نہ ہوں، یعنی تبدیل ہوتی ہوئی دُنیا کے باوجود قوانین اور پالیسیاں تبدیل نہ ہوں۔ لیکن یہ بتائج ہیں نا کہ ترجیحات۔ یہ کتاب، لوگوں کے کسی خاص گروہ کی ''قدامت پرستانہ فطرت'' کے کسی ہنگامی نظریے پر بھروسہ نہیں کرتی; اس کی بجائے یہ دکھاتی ہے کہ بعض لوگ قدامت پرستانہ طور پر عمل کیوں کرتے ہیں؟

مشرقِ وسطیٰ.....مغربی یورپ اختلاف کے تناظر میں، اس انداز سے سوچنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ قدامت پرستی ایک نتیجہ ہے جس کی تشریح کی جانی چاہیے..... یہ بذاتِ خود جمود کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگرچہ بلاشبہ اس بات کی شہادت موجود ہے جو اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ پہلی ہزاری کے ختم ہونے کے لگ بھگ اسلامی سیاسی اور مذہبی فکر زیادہ قدامت پرستانہ ہوگئی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ایک غلط راستہ اختیار کرتے ہوئے قدامت پرستانہ نقطۂ نظر کو معاشی جمود کے ساتھ وابستہ کردیں، اس کی بجائے پوچھے جانے والے صحیح سوالات یہ ہیں کہ بعض ثقافتیں بعض دوسری ثقافتوں کی نسبت زیادہ قدامت پرستانہ کیوں ہیں، اور کیا مشرقِ وسطیٰ میں کچھ ایسی ترغیبات تھیں جو آخرکار قدامت پرستانہ نتائج پر منتج ہوئیں، اس کا گہرا جواب یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم ثقافتی اختلافات سے آگے دیکھیں اور ترغیبات کے بنیادی محرکات کا تجزیہ کریں، خواہ وہ معاشی، مذہبی، سماجی یا سیاسی کیوں نہ ہوں۔ ترغیبات کہاں سے آتی ہیں؟ اگر یہ ثقافت سے نہیں آتیں تو کہاں سے آتی ہیں؟



# دلیل کا خلاصہ

باب دوم کتاب کے مرکزی ڈھانچے کو پیش کرتا ہے۔ یہ کسی معیشت میں اُن اداکاروں پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو مدوّن قوانین اور پالیسیوں کے سیٹ پر اثرانداز ہوتے ہیں: یعنی حکمران اور اُن کے کارندے۔ اس کے مرکزی خیالوں میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرے میں ایسے لوگ اور تنظیمیں ہوتی ہیں، جو اپنے تشخص یا وسائل تک رسائی کی وجہ سے، حکمرانوں کی قتدار میں رہنے پر مدد کرسکتی ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو توسیعی کارندے کہتا ہوں۔ یہ ڈھانچہ دو قسم کے توسیعی کارندوں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ جبری کارندے اور جواز بخشنے والے کارندے۔ جبری کارندے طاقت کے ذریعے اقتدار کو توسیع دیتے ہیں۔ لوگ اپنے حکمران کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ بصورتِ دیگر اُنہیں سزا کا سامنا کرنا پڑتا ہے..... جبکہ جواز بخشنے والے توسیعی کارندے جواز کے ذریعے اقتدار کو توسیع دیتے ہیں لوگ اپنے حکمران کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ وہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ مرد (یا بہت شاذ عورت) حکومت کرنے کا جائز حق رکھتا ہے یا رکھتی ہے۔

توسیعی کارندے حکمران کو بے شمار فوائد پہنچا سکتے ہیں، لیکن وہ بھی ایک قیمت پر آتے ہیں۔ حکمران اُن کی حمایت کے بدلے میں اُنہیں سودا بازی کی بساط پر جگہ دیتے ہیں۔ اس سودا بازی سے پیدا ہونے والے قوانین اور پالیسیاں ہر اداکار اور اس کی ترجیحات کی سودا بازی کی قوت کی عکاس ہوتی ہیں۔

مذہبی جواز بخشی حکمرانوں کیلئے خاص طور پر پُرکشش ہوتی ہے، کیونکہ یہ بلاخرچ ہوتی ہے۔ لہٰذا جب مذہبی پیشواؤں کے پاس اُن کے اقتدار کو جواز بخشنے کی صلاحیت ہو، تو وہ ایسے مذہبی پیشواؤں پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ایسی دُنیا میں، اگر قوانین کو، بدلتے ہوئے معاشی حالات

www.MashalBooks.org

کے تحت تبدیل کرنا مذہبی مقتدرہ کو نقصان پہنچاتا ہو، تو حکمران ایسا کرنے سے باز رہتے ہیں۔ نتیجۃً وہ لوگ جو، معاشرے کے قوانین اور پالیسیوں کی تجدید سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں، پیداکار، تاجر اور تجارتی کسان تبدیلی کیلئے بہت کم ترغیب محسوس کرتے ہیں۔ نا صرف یہ کہ حکمرانوں کا مذہبی ہیئت حاکمہ کے خلاف کھڑے ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسی درخواست کرنا بھی ایک گناہ ہوتا ہے نتیجۃً ، بیرونی دُنیا کی تبدیلی کے جواب میں، قوانین اور پالیسیاں تبدیل نہیں ہوتیں، اور نتیجہ معاشی جمود ہوتا ہے۔ یہ دلیل اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ دقیانوسیت اُن ترغیبات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کا سامنا متعلقہ اداکاروں کو ہوتا ہے نا کہ یہ خراب معاشی نتائج کا حتمی سبب ہوتی ہے۔

حاصلِ بحث یہ ہے کہ مختلف معاشروں کے مابین اور وقت کے ساتھ ساتھ معاشروں کے اندر، قوانین اور پالیسیوں کے اختلافات، توسیعی کارندوں کے تشخصات میں اختلافات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ اختلافات بذاتِ خود ان اختلافات کا نتیجہ ہوتے ہیں جو حکمرانوں کی طرف سے کارندوں کو استعمال کرنے کے خرچ اور حاصل شدہ فوائد میں ہوتے ہیں۔ وقت کے کسی مقررہ نقطے پر کسی معاشرے کے ''ادارے'' ان اخراجات اور حاصلات کو حکمرانوں پر نافذ کرتے ہیں۔ ادارے معاشرے کے وہ پہلو ہوتے ہیں جو ایسے ''کھیل کے قواعد'' وضع کرنے میں مدد دیتے ہیں جن کی پابندی تمام کھلاڑی کرتے ہیں تمام معاشروں میں متعدد ادارے ہوتے ہیں ..... مذہبی سیاسی، سماجی اور معاشی ..... جو سب کے سب، حکمرانوں اور اُن کے توسیعی کارندوں کے درمیان کھیلے جانے والے ''کھیل'' کی صورت گری کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

باب سوم، ڈھانچے کو مغربی یورپ اور مشرق وسطیٰ کی معاشی تاریخوں کی طرف لاتا ہے۔ ان تاریخی اسباب کا کھوج لگاتے ہوئے کہ اقتدار کے تشہیری ادارے دونوں خطوں میں مختلف تھے۔ یہ استدلال کرتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت کی پیدائش کے اردگرد کے حالات کے اُس طریقِ کار کیلئے اہم نتائج تھے جس میں اقتدار کی توسیع کی گئی۔

اسلام ساتویں صدی میں جزیرہ نمائے عرب میں پیدا ہوا، اور جوں جوں ابتدائی اسلامی سلطنتیں تیزی سے پھیلتی گئیں اس کی تشکیل ہوتی گئی۔ اسلامی اصول کے بہت سے پہلو اس ماحول کا جواب تھے۔ جس میں کسی حکمران کے اُس وقت تک حکومت کرنے کا اصول بھی شامل تھا



جب تک وہ اسلام پر عمل پیرا رہتا۔ دوسری طرف عیسائیت سلطنت رد ما میں پیدا ہوئی، اس طرح کہ اس کے پاس پہلے سے قائم شدہ، اچھی طرح کام کرتے ہوئے قانونی اور سیاسی ادارے تھے۔ اوائل عیسائیت نے کبھی قانونی یا سیاسی نظریے کا کوئی ڈھانچہ نہ بنایا، جو کہ ابتدائی اسلام کے مقابلے میں آتا محض اس وجہ سے کہ ابتدائی عیسائی مفکرین نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اقتدار کا مذہبی جواز یورپی تاریخ میں اہم نہ تھا۔ اس کا مفہوم محض یہ ہے کہ اسلام حکومت کو وراثت کے لحاظ سے جائز قرار دینے پر عیسائیت کی نسبت زیادہ آمادہ تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی توسیع اقتدار کے فوائد مشرق وسطیٰ میں مغربی یورپ کی نسبت زیادہ تھے۔ لہٰذا یہ ڈھانچہ اس بات کی پیش بینی کرتا ہے کہ، باقی ہر چیز مساوی ہونے کے باوجود، سودابازی کی بساط پر مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی مقتدرہ کی نشست اُس سے بڑی ہوگی جتنی مغربی یورپ میں ہوگی۔

یہ بات کہ سودابازی کی بساط پر کون بیٹھتا ہے، دو اسباب کی بنا پر اہم ہے (1) اسلام اور عیسائیت دونوں میں اصول موجود ہے جو معاشی معمولات کو متاثر کرتا ہے۔ (2) مذہبی اشرافیہ کے مفادات ہمیشہ قوانین اور پالیسیوں کی اُن اقسام سے لگا نہیں کھاتے جو معاشی کامیابی کو بڑھاوا دیتے ہیں..... باب چہارم اس ادراک کے ایک نتیجے پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک ایسے معاشی اصول کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہوتے جو اسلام اور عیسائیت میں مشترکہ ہے: قرضوں کے عوض منافع لینا (سود)۔ یہ باب اس ڈھانچے کو اس معاملے پر روشنی ڈالنے کیلئے استعمال کرتا ہے کہ سود کا اصول دونوں مذاہب میں مختلف کیسے ہوگیا۔ یہ اُن مختلف طریقوں کو بھی نمایاں کرتا ہے جن میں ان دونوں خطوں کی سیاسی اور مذہبی مقتدرہ نے ایک دوسرے کو متاثر کیا، اور اس چیز نے کس طرح جوابی طور پر سود کی اجازت دینے کیلئے حکمرانوں کی مرضی کو متاثر کیا۔ یہ باب ایسا دعویٰ نہیں کرتا کہ سود کے قوانین میں اختلافات ہی وہ وجہ تھے جن سے مغربی یورپ کی معیشتیں مشرقِ وسطیٰ سے آگے نکل گئیں۔ لیکن یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ پابندیاں یکسر خالی از علت نہیں تھیں۔ دونوں خطوں میں جس قسم کی مالی دستاویزات استعمال کی گئیں وہ اصولی اختلافات کی عکاسی کرتی تھیں۔ اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، اُنیسویں صدی سے پیشتر مشرقِ وسطیٰ میں بینکنگ کے اداروں کا فقدان تھا۔

باب پنجم چھاپہ خانے کی ترویج کا تجزیہ کرتا ہے یہ ڈھانچہ ایک تاریخی معمے پر روشنی ڈالتا ہے .....جبکہ 1450 میں جوہانس گٹنبرگ (Johnnes Gutenborg) کی طرف سے چھاپہ خانہ کی ایجاد کے بعد مغربی یورپ میں یہ بہت تیزی سے پھیلا، عثمانیوں نے اس کے استعمال پر تقریباً 250 سال تک پابندی لگادی۔ چھاپہ خانہ کے بارے میں مختلف ردِّعملوں کی دلیل بڑی سیدھی سادی ہے۔ چھاپہ خانہ مذہبی ہیئت حاکمہ کی علم کی ترسیل پر اجارہ داری کیلئے ایک خطرہ تھا۔ جو کہ معاشرے میں اُن کے اثر ورسوخ کا بنیادی ذریعہ تھا۔ لہٰذا یہ اُن کیلئے ایک محرک تھا جو انہیں مجبور کرتا تھا کہ وہ اس پر پابندی لگانے کیلئے سلطان کی حوصلہ افزائی کریں۔ سُلطان نے اُنہیں ممنون کیا کیونکہ مذہبی ہیئت حاکمہ موروثی اقتدار کو جائز قرار دینے والے اہم کارندے تھے، چھاپہ خانہ کی اجازت دینا اُن کی تباہی کا موجب بن جاتا۔ جبکہ عیسائی مذہبی پیشوا اس پوزیشن میں نہ تھے کہ وہ حکمرانوں سے چھاپا خانہ کو بند کرنے کیلئے کہتے، لہٰذا نتیجۃً یہ بہت تیزی سے پورے یورپ میں پھیل گیا۔

سود اور چھاپے خانے پر پابندیوں کے تجزیے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اسلام میں فطری طور پر کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس طرح کے ماحول کو پروان چڑھاتی ہو جو تجارت مخالف قوانین کی حمایت کرتا ہو۔ درحقیقت اوائلِ اسلام کے مذہبی اور سیاسی اصول خاصے لچکدار تھے اور بلکہ غالبًا افزائش کو پروان چڑھانے والے تھے۔ معاشی اور سماجی حالات کے تقاضوں کے مطابق مذہبی قانون کی تعبیر نو بار بار ہوتی رہتی تھی اور نتیجۃً مشرقِ وسطیٰ اسلام کے قیام کے بعد صدیوں تک ایک معاشی، ٹیکنالوجیاتی، اور ثقافتی راہنما تھا۔ بہت سے اسلامی قوانین جنہوں نے آخر میں معاشی ترقی کو روک دیا، ابتدائی اسلامی معیشت کی ضروریات سے مناسبت رکھتے تھے، لیکن، جوں جوں معاشی حالات نے ترقی کی، تو سیاسی اور مذہبی حکام کے درمیان اقتدار کو جواز بخشنے کے تعلق کا مزید معاشی ترقی پر بڑھتا ہوا اثر، روکنے کا عمل ثابت ہوا۔ سود پر اور الفاظ اور تصاویر کی مثل تیار کرنے پر پابندی لگاتے جیسے مذہبی اصول، جو قبل جدید معیشت کیلئے مسئلہ نہیں تھے۔ اب ایک ایسی رکاوٹ کے طور پر سامنے آگئے جس پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چھاپہ خانہ پچھلی ہزاری کی اہم ترین معلوماتی ٹیکنالوجی تھی، اور جہاں جہاں یہ پھیلا، وہاں مغربی معیشتیں بہت تیزی سے بڑھی پھولیں۔ لیکن چھاپہ خانہ کے



پھیلاؤ کے بالواسطہ نتائج اس سے بھی زیادہ اہم تھے۔ باب ششم ان میں سے ایک نتیجے کو نمایاں کرتا ہے: چھاپہ خانہ نے پروٹسٹنٹ اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ میں مدد دی۔ چھاپہ خانہ نے، وسیع پیمانے پر تیز رفتار اختلاف رائے کی گنجائش پیدا کی، اور اس طرح تحریکِ اصلاح کلیسا کی کامیابی کی راہ ہموار کی، جبکہ اس سے پہلے والی کلیسا مخالف تحریکیں ناکام ہوگئی تھیں۔ یہ باب اُن تجربی تجزیوں کی رپورٹ پیش کرتا ہے جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا شہروں میں غلبہ پانے کا بہت زیادہ امکان چھپی ہوئی کتب تک رسائی کے ذریعے پیدا ہوا۔ یہ کسی معاشرے کے طویل المدتی خطِ حرکت میں ایک ''دوراہے'' کا بہت اہم معاملہ ہے۔ اس طرح کی کلیسا مخالف تحریک کا، جو معلومات کے تیز رفتار بہاؤ پر انحصار رکھتی تھی، سلطنتِ عثمانیہ میں وقوع پذیر ہونے کا امکان بہت کم تھا۔ جہاں مطبوعہ کتب تک رسائی بہت کم تھی سلطنت عثمانیہ میں معلومات ٹیکنالوجی کے فقدان نے جو خیالات کی بہت تیز ترسیل کی اہلیت رکھتی تھی، قائم شدہ مفادات کو اقتدار پر اپنی گرفت رکھنے کا موقع فراہم کیا، اس طرح کہ اس نے صدیوں تک جامد صورتِ حال کے قائم رہنے کی راہ ہموار کردی۔ نتیجۃً، مذہبی مقتدرہ مشرقِ وسطیٰ میں صدیوں تک ایک طاقتور سیاسی قوت رہی، جبکہ مغربی یورپ میں اُن کا اثر رسوخ کمزور پڑ گیا۔

کتاب کا باقی ماندہ حصہ یہ استدلال کرتا ہے کہ تحریک اصلاح کلیسا کیوں، مغربی یورپ کے معاشی خطِ حرکت کیلئے اتنا اہم واقعہ تھا، اور کیتھولک یورپ اور مسلم مشرق وسطیٰ کے خط حرکت کیلئے مذہبی مقتدرہ کی ایسی ہی تباہی کا فقدان اہم تھا۔ بنیادی ادراک یہ ہے کہ تحریک اصلاح کلیسا نے بنیادی طور پر اُس طریقے کو بدل دیا جس میں اقتدار کی تشہیر کی جاتی تھی۔ مذہب کی پہلے سے کمزور جواز بخشی کی صلاحیت پروٹسٹنٹ ریاستوں میں اصلاحِ کلیسا کے بعد مزید کمزور ہوگئی، کیونکہ اس نے پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو اپنی حکومت کے توسیعی کارندوں کو تبدیل کرنے پر مجبور کردیا۔ سب سے عام ردِّعمل، اس معاشی اشرافیہ سے توسیع طلب کرنا تھا، جو پارلیمنٹ میں خدمات انجام دیتی تھی۔ معاشی اشرافیہ میری مُراد صرف وہ لوگ ہیں جو بنیادی طور پر تجارت میں مشغول ہیں۔ تاجر، ہنرمند افراد، صراف، تجارتی کسان، یا کوئی بھی اور شخص جو مارکیٹ کیلئے پیداکاری، یا مارکیٹ کے سودوں میں سہولت کاری میں مشغول ہوں۔ توسیع کا تبدیل کرکے معاشی اشرافیہ کے ہاتھ میں دینا ایک اہم پیش رفت تھی، کیونکہ اُن کی ترجیحات کا رُجحان اُن پالیسیوں کی طرف تھا، جو معاشی

خوشحالی کی نوید دیتی ہیں، جیسا کہ محفوظ ملکیتی حقوق اور عوام کی بہبود کا خیال رکھنا۔ نتیجۃً پروٹسٹنٹ حکمران اکثر ایسے قوانین اور پالیسیاں بناتے تھے، جو طویل المدتی معاشی خوشحالی کو بڑھاوا دیتی تھیں، کیتھولک یا مسلمان حکمرانوں کی نسبت بہت زیادہ۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاشی اشرافیہ زیادہ ''عوامی جذبہ رکھنے والی'' تھیں، بہ نسبت دوسرے توسیعی کارندوں کے اور لہٰذا وہ نیکی کے محرکات کے تحت عوامی مفاد میں پالیسیوں کی خواہش رکھتی تھی۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس، یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ معاشی اشرافیہ اپنے ہی مفادات کے حصول کی کوشش کرتی تھی، جو اتفاق سے اُن پالیسیوں کے ساتھ لگّا کھاتے تھے، جو وسیع تر معیشت کو بھی فائدہ پہنچاتے تھے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ وہ سب کچھ جو معاشی اشرافیہ کرتی تھی، معیشت کیلئے اچھا ہوتا تھا تاریخ معاشی اشرافیہ کی طرف سے کرایہ طلب کرنے کی مثالوں سے بھی بھری پڑی ہے۔ اس کے کہنے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ایسا سیاسی نظام جو کلی طور پر معاشی اشرافیہ کی طرف سے چلایا جائے معیشت کیلئے اچھا ہوگا۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظام جس میں معاشی اشرافیہ کو سودابازی کی بساط پر اہم نشست حاصل ہو، ایک ایسے نظام کی نسبت جہاں اُن کی کوئی آواز نہ ہو، بہتر معاشی نتائج کا حامل ہوگا۔

ابواب 7 اور 8 ان بیانات کی حمایت کیلئے متعلقہ تواریخ کو کھنگالتے ہیں۔ باب 7 دوسر کردہ پروٹسٹنٹ معیشتوں انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں ہونے والی بعد اصلاح کلیسا معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ باب 8 ایک کیتھولک، معیشت کا، جو پیچھے رہ گئی یعنی سپین کا اور ایک اُس وقت کی مشرقِ وسطیٰ کی معیشت، سلطنتِ عثمانیہ کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ محض معمولی تقابل نہیں ہیں۔ جنہیں یونہی اُٹھا کر استدلال کی تائید کیلئے پیش کر دیا گیا ہو۔ یہ غالباً فرانس کے علاوہ، جو کیتھولسزم، اسلام اور پروٹسٹنٹ ازم کی کسی شکل سے وابستگی رکھتا ہے۔ وقت کی اہم ترین معیشتیں تھیں۔

لہٰذا یہ ڈھانچہ اُس ''چھوٹے اختلاف'' کی بھی توجیہہ کرتا ہے جو شمال مغربی یورپ اور باقی ماندہ یورپ کے درمیان واقع ہوا، اور اس ''بڑے اختلاف'' کی بھی جو مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان واقع ہوا، یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ''مغربی یورپ کے بارے میں کچھ'' ایسا تھا، جو آخرکار معاشی خوشحالی پر منتج ہوا، جدید معیشت کا اُبھار کوئی بین مغربی یورپ مظہر نہ تھا...... یہ



بالکل ایک انگلیز یائی اور ڈچ مظہر تھا۔ اگرچہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ یہ ڈھانچہ ہر چیز کی تشریح کرتا ہے۔ یہ استدلال صنعت سازی سے پہلے رُک جاتا ہے۔ جو اپنے طور پر وضاحت طلب ہے۔ لیکن میں یہ دعویٰ ضرور کرتا ہوں کہ وہ مقامات جہاں جدید معیشت بالآخر جنم لیا، اُن کے ہاں سولھویں صدی کے اختتام تک بہت مختلف سیاسی معیشت کا توازن تھا ...... ایک ایسا توازن جو طویل المدتی معاشی ترقی کیلئے زیادہ سازگار تھا۔

یہ ڈھانچہ ویبر کے اُن سادگی پسندانہ نظریات کو جو ''پروٹسٹنٹ اخلاقیات'' کو معاشی خوشحالی کے ساتھ جوڑتے ہیں سر کے بل اُلٹ دیتا ہے (10) میکس ویبر (Max Weber) [2002]1905) نے یہ استدلال کیا کہ کیلوینی قضاوقدر کے فلسفہ نے اپنے ماننے والوں کو یہ ثابت کرنے پر آمادہ کیا کہ وہ محنت کرنے اور دُنیاوی کامیابی حاصل کرنے سے ''منتخب لوگوں'' میں سے ایک تھے۔ اس طرح ''سرمایہ دارانہ جذبہ'' پروٹسٹنٹ ممالک میں نفوذ کر گیا اور اُنہیں ایک مختلف معاشی راستے پر ڈال دیا، وہ مشاہدہ جس نے اس مفروضے پر اُبھارا، صحیح ہے: بہت سی پروٹسٹنٹ اقوام کو جدید معاشی ترقی میں فوقیت حاصل تھی۔ لیکن جہاں یہ کتاب اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ پروئسٹنٹ ازم اور معاشی ترقی میں ایک باہمی تعلق ہے، وہیں پر یہ، ثقافت یا مذہبی اصولوں پر مبنی سلسلۂ علل سے بہت مختلف علت کے بارے میں استدلال کرتی ہے۔ یہ اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ اصلاح کلیسا کی طرف سے پیدا کردہ سیاسی معیشت میں تبدیلیاں خاص طور پر سودابازی کی بساط پر مذہبی اشرافیہ کی بجائے معاشی اشرافیہ کی تقرری، وہ بنیادی عامل تھا جس نے پروئٹسنٹ ازم کو معاشی کامیابی کے ساتھ جوڑا۔ یقیناً اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جدید معیشت کو لازماً شمال مغربی پروئسٹنٹ یورپ میں ہی اُبھرنا تھا۔ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ اگر 1600 میں زندہ رہنے والے کسی شخص کو اس چیز میں انتخاب کرنا ہوتا کہ دُنیا کے کس حصے میں 150 سال بعد صنعت سازی اور اُس سے متعلقہ معاشی ترقی کا دھماکہ واقع ہوسکتا ہے۔ تو پروئسٹنٹ شمال مغربی یورپ ایک اچھا انتخاب ہوتا۔ (11)

www.MashalBooks.org

# دوسری توضیحات

''مغرب کے عروج'' کے بارے میں اس کتاب میں پیش کی گئی توضیح اُس واحد توضیح سے مختلف ہے جو عام ہے۔ مغرب کا عروج اُن بڑے موضوعات میں سے ایک ہے جس سے معاشی تاریخی دان نمٹتے ہیں، اور نتیجتاً اس کے اسباب کی تفہیم کو ہماری طرف سے آگے بڑھانے کے سلسلے میں بہت سے الفاظ وقف کئے گئے ہیں۔ بہت سے موجودہ مفروضات اس مفروضے کی جو اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے بہت عمدہ طریقے سے تکمیل کرتے ہیں۔ ایسی توضیحات، مغرب کے عروج یا کسی دوسری جگہ پر نسبتاً جمود کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں، جو ایسی توضیحات پیش کرتے ہوے جو ان میکانیوں کی مضبوط کرتے ہیں جن پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسی توضیحات بھی ہیں جو اس کتاب میں پیش کی گئی توضیحات کی واضح طور پر نقیض ہیں۔ میں نے نیچے ان کا جائزہ لیا ہے اور یہ نشاندہی کی ہے کہ میں کیوں یہ مانتا ہوں کہ میری توضیحات کامیاب ہیں اور ان کی توضیحات ناکام ہیں۔



# تکمیلی مفروضہ جات

''مغرب کے عروج'' کی توضیحات، جو اُس توضیح سے جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ وہ ایونر گریف (Avner Greif) ڈگلس نارتھ ڈگلس نارتھ (Douglass North) اور تیمور کُران (Timur Kuran) کی ہیں۔ گریف اور نارتھ دونوں، اداروں کے معاشی مفاہیم کو سمجھنے کیلئے مفید ڈھانچہ مہیا کرتے ہیں۔ گریف مضامین کے ایک سلسلے اور اپنی کتاب Institutions and the path to the Modern Economy میں یہ دکھاتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مرکزی سیاسی اور قانونی اداروں کی غیر موجودگی میں کس طرح غیر مرکزی اداروں نے تجارت کو سہل بنانے کیلئے کام کیا۔ گریف بنیادی طور پر اُن معاشی اداروں پر توجہ مرکوز کرتا ہے جو ریاست سے باہر اُبھرے اور اس پر کہ ان اداروں نے کس طرح معاشی تبادلے کو سہل بنایا۔ موجودہ کتاب کا فوکس معاشی زندگی کے ایک مختلف حصے پر ہے: اُن ترغیبات پر جن کا سامنا مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے بنیادی سیاسی اداکاروں کو ہوا۔ گریف کی طرف سے تجزیہ کی گئی ادارہ جاتی تبدیلیاں اُن تاریخی عوامل کی اہم پیشرو تھیں جن کا کھوج اس کتاب میں لگایا گیا ہے۔ لہٰذا گریف کا کام میرے استدلال کیلئے ایک ضروری تکملہ فراہم کرتا ہے۔

گریف کی طرف سے مطالعہ کیا گیا ادارہ جاتی اختلافات کا ایک سیٹ جو واضح توجہ کا متقاضی ہے، وہ ہے جن کا تعلق خاندانی ڈھانچے سے ہے۔ یورپیوں کا خاندانی ڈھانچہ قرونِ وسطیٰ کے کلیسا کی پالیسیوں کی پیداوار تھا۔ جس نے رشتہ داری کے تعلقات کو کمزور کرنے کیلئے کچھ معمولات کی حوصلہ شکنی کی (متبنی بنانا، کثیر الازدواجی) دوبارہ شادی، ہم جدّ لوگوں کے درمیان شادی) جیک گُڈی (Jack Goody)(1983)، کے مطابق کلیسا نے یہ پالیسیاں اس اُمید کے

ساتھ نافذ کیں کہ لوگ اپنی موت کے بعد اپنی جائیدادوں کو اپنے رشتہ داروں کی بجائے کلیسا کو عطیہ کریں گے۔ (12) اس کے مقابلے میں مشرقِ وسطیٰ میں رشتہ داری کے تعلقات بہت اہم تھے۔ جہاں ہم جدّ لوگوں میں شادی بہت عام تھی۔ گریف (1994a, 2006a, 2006b) یہ استدلال کرتا ہے کہ نتیجتاً یورپی ثقافت ''انفرادیت پسندانہ'' ہوگئی بہ نسبت مشرقِ وسطیٰ کی ثقافت کے جو زیادہ ''اجتماعیت پسندانہ'' تھی۔ لہٰذا یورپیوں نے ایسے ادارے تخلیق کئے جنہوں نے گروپ سے باہر اعتماد پیدا کیا، کیونکہ مرکزی خاندان اتنی چھوٹی اکائی کا تھا کہ باہمی تبادے سے کوئی فوائد بہم نہیں پہنچا سکتا تھا۔ (13) اس چیز نے مشرقِ وسطیٰ کو اُس وقت فائدہ پہنچایا جب تجارت کا دائرہ محدود تھا، کیونکہ رشتہ داروں کے گروہ میں تجارت بغیر کسی مزید ادارہ جاتی پیشرفت کے واقع ہوسکتی تھی۔ تاہم جب ایک مرتبہ بعد کے قرونِ وسطیٰ کے یورپی معاشروں نے ایسے ادارے قائم کر لیے جو رشتہ داروں کے گروہ سے آگے بڑھ کر اعتماد کو سہل بناتے تھے۔ یہ دلائل اس کتاب میں پیش کئے گئے دلائل کے ساتھ کلی طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ وہ یہی دلیل اس بات کیلئے استعمال کرتے ہیں کہ اسلام قبل جدید تناظر میں معاشی ترقی کیلئے کیوں مفید رہا ہوگا: اس نے (اسلام نے) مسلمانوں کو اُمہ کے تصور کے ذریعے باہم مربوط رکھا، جو پوری اسلامی برادری کو ایک خیال کرتا ہے۔ اور گریف کی، یورپین معیشت کی حتمی کامیابی کیلئے دلیل بڑے عمدہ طریقے سے میری توضیح کی تکمیل کرتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مضبوط رشتہ داری کے تعلقات نے، مشرقِ وسطیٰ میں آخر کار غیر شخصی تبادلے کی حوصلہ شکنی کی ہو، لیکن اکیلا یہ امر اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ معاشی اشرافیہ، سودابازی کی بساط پر کیوں کبھی کوئی نشست حاصل نہ کرسکی۔ اس کتاب میں پیش کی گئی دلیل اس خلا کو پُر کرتی ہے۔ یہ استدلال کرتے ہوئے کہ معاشی اشرافیہ کو سودابازی کی بساط پر کبھی کوئی جگہ اس لئے نہ مل سکی کہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران، اسلام کی جواز بخشی کی قوت کی وجہ سے اتنے مضبوط تھے کہ وہ انہیں خارج کرسکتے تھے۔

تصانیف کا دوسرا سیٹ، جن سے یہ کتاب جذبہ یا ادراک حاصل کرتی ہے، ڈگلس نارتھ (Gouglass North) کی اداروں کے بارے میں تصانیف ہیں، خاص طور پر اُس کی کتاب 'معاشی تاریخ میں ساخت اور تبدیلی' (Structure and Change in Economic History) اور 'ادارے' ادارہ جاتی تبدیلی اور معاشی کارکردگی، (Institutions, Institutional



Change and Economic Performance) نارتھ کی تصانیف کا مرکزِ توجہ سیاسی اداروں کو حقوق ملکیت کے ساتھ جوڑنا ہے۔ شمال مغربی یورپ میں ان اداروں کا اُبھار بلاشبہ اہم تھا، اور وہ اس کتاب میں پیش کئے گئے نظریہ میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ نارتھ نے اس مجموعۂ تحریرات میں اپنا حصہ ایک بنیادی مضمون میں بیری وائین گاسٹ (Barry Weingast) کے ساتھ مل کر ڈالا (1989)، جو اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ انگلستان میں 1688 کے سنہری انقلاب کے بعد انتظامی حاکمہ پر ادارہ جاتی پابندیوں کا نفاذ ایک فیصلہ کُن موڑ تھا، کیونکہ اس نے دولتمندوں کو ایک اضافہ سیاسی آواز مہیا کی، نارتھ، جان والس (John Wallis) اور وائین گاسٹ، اپنی کتاب تشدد اور سماجی نظام (Violence and Social Orders) میں اس دلیل کو مزید پھیلاتے ہیں، اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ غیر شخصی اور غیر جانبدار قانونی اور معاشی اداروں تک رسائی کو کھولنا معاشی ترقی کی بنیاد ہے۔ ان کے خیال میں کھلے عام رسائی اہم ہے، کیونکہ یہ آبادی کے زیادہ بڑے حصے کیلئے، وسائل کو مستعدی سے استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ڈارون اسیم اوگلو اور جیمز رابنس (2012) اپنی کتاب قومیں کیوں ناکام ہوتی ہیں (Why Nations Fail) میں ایسی ہی دلیل پیش کرتے ہیں۔ وہ استدلال کرتے ہیں کہ وہ حکومتیں جو استحصال کی اجازت دیتی ہیں، وہی معاشی ترقی میں بنیادی تاریخی رکاوٹیں ہیں۔ یہ تمام دلائل ان دلائل سے جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ہیں مطابقت رکھتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ کتاب سن 1600 کو اپنے اختتامی نقطے کے طور پر اختیار کرتی ہے میرے استدلال کا ایک مفہوم یہ ہے کہ 1600 تک مغربی یورپ کے بعض حصے ایسے تھے جو اسی جذبے میں جو نارتھ اور دوسروں نے بیان کیا ہے ایک معاشی اُڑان بھرنے کیلئے تیار ہو رہے تھے۔ لہٰذا یہ کتاب اُن کے دلائل کی محض چند صدیاں پیچھے تک پیروی کرتی ہے۔ اس بات پر توجہ دیتے ہوئے کہ ایسے واقعات کا امکان انگلستان میں واقع ہونے کا ہی زیادہ تھا۔ بہ نسبت مثلاً سلطنت عثمانیہ کے۔

اس کتاب میں اختیار کیا گیا نقطۂ نظر تیمور کران کی اہم تصانیف کے ساتھ مماثلت رکھتا ہے۔ اپنے مقالات کے ایک سلسلے میں اور اپنی کتاب ''طویل انفراج'' (The Long Divergence) میں، کُران یہ استدلال کرتا ہے کہ اسلامی قانون کے متعدد ایسے پہلو تھے، جنہوں نے قبل جدید کے معاشی ماحول میں تجارت کو اُبھارنے میں مدد کی، لیکن جونہی یہ ماحول

www.MashalBooks.org

تبدیل ہوا تو معاشی ترقی کو دبا دیا۔ وہ بھی اس کتاب میں استعمال کی گئی ترکیب کی مانند ایک ترکیب استعمال کرتا ہے، اور ایک ایسی توضیح کی تلاش کرتا ہے، جو ان دونوں باتوں کی وضاحت کرے کہ ابتدائی مشرقِ وسطیٰ کی معیشتیں کیوں کامیاب ہوئیں اور آخر کار مغربی یورپ آگے نکل گیا۔ کُران بنیادی طور پر مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں قانونی تبدیلی کی طلب یا اُس کے فقدان پر توجہ مرکوز کرتا ہے، جبکہ میرا استدلال بنیادی طور پر اس کے رسد پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ (14) لہٰذا ہمارے کام ایک دوسرے کے لازمی تکملات ہیں: طلب کے پہلو کو سمجھنا بغیر رسد کے پہلو کے مکمل ادراک کے ناممکن ہے اور اس کے برعکس بھی۔ جیسا کہ گریف اور نارتھ کی تصانیف کا معاملہ ہے۔ کُران بعد میں بھی وہی بڑے سوالات پوچھ رہے ہیں، لیکن اُن کے مختلف حصوں سے نمٹتے ہیں۔

جین لوئیٹن وین زینڈن (Jan Luiten Van Zanden) اپنی کتاب 'صنعتی انقلاب کا طویل راستہ' (The Long Road To the Industrial Revolution) میں گریف، کُران اور نارتھ اور بہت سے دوسرے لوگوں کے ادراکات کو استعمال کرتا ہے۔ وین زینڈن یہ استدلال کرتا ہے کہ ایک خاص مظہر۔ ''یورپی شادی کا انداز''..... نے اُس صنعتی تشکیل میں اپنا حصہ ڈالا، جو ابتدائی جدید مغربی یورپ میں واقع ہوئی، اور اسے باقی ماندہ دُنیا کے مقابلے میں نمایاں کرنے میں مدد دی۔ خاص طور پر، وین زینڈن اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ شمال مغربی یورپیوں کے مردوں اور عورتوں کا زندگی میں دیر سے شادی کرنے کے رُجحان نے اُنہیں زیادہ انسانی سرمایہ اکٹھا کرنے کی ترغیب دی، جو اس بات کا ایک اہم تعین کار تھا کہ ادارے کس طرح ارتقا پذیر ہوئے۔ (15) گریف کی طرح وین زینڈن بھی قرونِ وسطیٰ کے آخری دور (950-1350) میں یورپ کے معاشی عروج میں، غیر مرتکز ادارہ جاتی پیشرفتوں کی اہمیت کے حق میں استدلال کرتا ہے۔ ایسی پیشرفتوں کے بغیر، اس کتاب میں بحث کئے گئے بہت سے طریق ہائے عمل واقع نہ ہو سکتے۔ زیرِ نظر کتاب کی مانند وین زینڈن بھی چھاپہ خانے اور تحریکِ اصلاح کلیسا کی اہمیت پر زور دیتا ہے، اگرچہ اُس کا سروکار زیادہ تر انسانی سرمائے کے نتائج سے ہے، اور میرا سیاست پر اُن کے اثرات سے۔

مفروضات کا ایک دوسرا سیٹ جو سیاسی اور قانونی اداروں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ



استدلال کرتا ہے کہ مالی اور قانونی صلاحیت.....ٹیکس لگانے اور قانون مہیا کرنے کی طاقت..... نے مغرب کے عروج میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس استدلال کا جدید شکل میں سُراغ چارلس ٹلی (Charles Tilly) میں ملتا ہے۔ جو یہ استدلال کرتا ہے کہ باہمی دفاع اور جنگ نے حکومتوں کیلئے مالیات کی پیداوار میں سرمایہ کاری کرنے کیلئے حکومتوں کیلئے ترغیبات پیدا کیں۔ ٹلی کا اکثر حوالہ دیا جانے والا (1975, P.42) بیان یہ ہے ''جنگ نے ریاست کو بنایا اور ریاست نے جنگ کو، (16) یہ بات بلاشبہ صحیح ہے کہ یورپ میں مالی، قانونی اور ریاستی صلاحیت نے ریاستوں اور معاشی مقدروں کی ترقی میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ (17) لیکن اس تحریری مجموعے کی ایک خامی یہ ہے کہ یہ ایک ایسے حکمران کو فرض کر لیتا ہے جو ٹیکس کے حصول کی کوششوں یا قانونی دائرہ کار کے انتخاب کا اختیار رکھتا ہے، بغیر اس بات کا گہرا کھوج لگائے کہ اول اس حکمران کے پاس ایسا کرنے کی طاقت کیوں ہے۔ اس کمی کا جواز پیش کیا جاتا ہے:۔ کسی بھی تجزیے کو کہیں نہ کہیں سے شروع ہونا ہوتا ہے، اسی حکمران کو فرض کرنا زیادہ تر تاریخی صورتِ حال میں ایک مناسب مقام ہوتا ہے۔ لیکن اس کتاب میں پیش کیا گیا استدلال اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ انداز جس میں حکمرانوں کے اقتدار میں کی جاتی ہے، پالیسیوں کی اُن اقسام کیلئے جو وہ اختیار کرتے ہیں، اہمیت رکھتا ہے۔ اور حتمی طور پر مالی اور قانونی صلاحیت کے فوائد اُٹھانے کی قابلیت کیلئے بھی اگرچہ میں نے مالی صلاحیت میں سرمایہ کاری کو حکومت کی توسیع کے تعلق سے صرف بالواسطہ طور پر بیان کیا ہے (ابواب 7 اور 8 میں) لیکن یہ واضح طور پر اس سے مترشح ہوتا ہے کہ دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ (18)

یورپ کی منفرد تاریخ پر مبنی توضیحات کا ایک متعلقہ سیٹ اس حقیقت پر توجہ مرکوز کرتا ہے کہ یورپ نسبتاً چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا، جو اکثر برسرِ پیکار رہتی تھیں، جبکہ دُنیا کے بیشتر حصے بڑی بڑی سلطنتوں کے ماتحت تھے جنہیں کم سیاسی مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پال ایم کینیڈی (Paul M. Kennedy) (1987) کی طرف سے اُس کی کتاب 'عظیم طاقتوں کا عروج و زوال' (The Rise and Fall of the Great Powers) میں قائم بنیادی تصور یہ ہے کہ مغرب میں جنگ کی مسلسل طلب نے وہ محرکات پیدا کئے جنہوں نے عسکری ٹیکنالوجی کو باقی ماندہ دُنیا کی نسبت ایک مختلف شرح سے ترقی پر اُکسایا، جس نے جواباً یورپ کو سولھویں صدی میں

www.MashalBooks.org

شروع ہونے والی نوآبادیات سازی میں بالادستی عطا کی۔ اس مفروضے کا ایک اور زیادہ باریک متن وہ ہے جو فلپ ہافیمین (Philip Halfman 2015) نے اپنی کتاب 'یورپ نے دُنیا کو کیوں فتح کیا، (Why Did Europe Conquer the World?) میں پیش کیا۔ جس میں استدلال کرتا ہے کہ یورپی حکمرانوں کے درمیان مقابلہ صرف اُسی وقت عسکری ٹیکنالوجی کی بہتریوں پر منتج ہوا جب اس کا اختلاط بارود کے ساتھ ہوا، جو یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے اواخر میں پہنچا۔ (19) تاہم زیرِ نظر کتاب میں اہم ادراکات میں سے ایک یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے لوگوں نے آخر کار اس وجہ سے نقصان اُٹھایا کیونکہ اُن کے حکمران مضبوط تھے۔ اُن کے اقتدار کی مضبوطی نے، جو کہ جزوی طور پر مذہبی جواز بخشی کی وجہ سے تھا، اُنہیں اس بات کی اجازت دی کہ وہ معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کے بغیر بڑی بڑی سلطنتیں بنالیں۔ مغرب میں معاملہ اس کے برعکس تھا، جہاں حکمران، مذہبی جواز بخشی کی پست سطح کی وجہ سے نسبتاً کمزور تھے۔ یہ دلیل، یورپ کی شکستگی کے مجموعۂ تحاریر کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ یہ یورپ کی شکستگی کی توضیح کرتی ہے۔ (20) بلاشبہ یہ اس مجموعۂ تحاریر سے آگے جاتی ہے، کیونکہ یہ درونِ یورپ طویل المدتی معاشی نتائج کے اختلافات کا ایک احوال مہیا کرتی ہے۔ جدید معیشت شمال مغربی یورپ، نا کہ محض یورپ میں پیدا ہوئی۔ کلی طور پر مغربی شکستگی پر مبنی دلیل میں اس کی توجیہ کرنا مشکل ہے۔

مفروضات کا ایک مختلف سیٹ فنِ خطابت، دانشوری اور خردافروزی کے معاشی اثرات پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ اس مجموعۂ تحاریر میں سے ایک موثر مثال ڈیرڈر میکلوسکی (Deirdre McCloskey) کی کتاب 'اُمرا کا وقار' (Bourgeois Dignity) کی ہے، جو اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ لوگوں کا گفتگو کا طریقہ اہمیت رکھتا تھا..... خصوصی طور پر زبان میں ایک تبدیلی، خاص طور پر انگلستان اور نیدر لینڈز ہیں جو کہ کاروبار اور تجارت کیلئے بہت زیادہ سازگار تھی، ذہنوں کو تبدیل کرنے میں بہت بنیادی ثابت ہوئی اور اس نے ذہین اور دولت مند افراد کو اُن تجارتی سرگرمیوں پر اُکسایا جو اس سے پہلے کمتر خیال کی جاتی تھیں۔ جوئیل موکائیر (Joel Mokyer) (2002,2009) ایک تکمیلی دلیل پیش کرتا ہے، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ سوچنے اور علم حاصل کرنے کے نئے طریقوں نے، خاص طور پر سترھویں۔ اٹھارویں صدی کی تحریک خردافروزی کے اشتراک سے، پیداکاروں اور کاروباری لوگوں کے زیادہ کارگر تکنیکوں



کے تجربات کرنے کے رویے کو تقویت دی۔ میکلوسکی اور موکائر دونوں جدید معیشت کی ترقی کے اہم پہلوؤں کی واضح طور پر نشاندہی کرتے ہیں۔ ایک ایسی جدید معیشت کا تصور کرنا مشکل ہے جس میں کاروبار میں ایک پُرتجسس اور تجرباتی جذبے کا فقدان ہو یا تجارت میں ملوث لوگ نچلی ذات کے افراد ہوں لیکن پھر بھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ ان دلائل میں سب سے بڑا محرک کونسا ہے۔ کیا یہ بات ممکنہ طور پر ٹھیک ہوسکتی ہے کہ تاجروں کے بارے میں رویوں میں تبدیلی ان طبقات کی دولت و طاقت میں ایک وقت ترقی کے بغیر واقع ہوسکتی تھی؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ تحریکِ خردافروزی اور دوسری دانشورانہ تحریکیں معاشی اور سیاسی حالات کا ردِعمل ہوں؟ اس کتاب میں پیش کئے گئے دلائل، اُن حالات کا ادراک مہیا کرکے جنہوں نے پہلے پہل ان تحاریک کو ممکن بنایا، ان مسائل پر روشنی ڈالنے میں مدد کرتے ہیں۔

www.MashalBooks.org

# متضاد مفروضے

اس کتاب میں پیش کئے گئے مفروضے کے متضاد مفروضات کا اہم ترین سیٹ ثقافت میں اختلافات پر مرکوز ہے۔ میں نے پہلے ہی بنیادی مسائل کو، ثقافت پر مبنی توضیحات کے ذریعے بیان کیا ہے۔ وہ اکثر اوقات سبب کے ساتھ اُس کا تعلق جوڑ کر معاملے کو اُلجھا دیتے ہیں۔ وہ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ثقافت ہی مسئلے کا سبب ہے جبکہ حقیقتاً یہ اُن گہری قوتوں کا ایک نتیجہ ہے، جو بیک وقت معاشی اور سیاسی اختلافات کو بھی متاثر کرتی ہیں، بلاشبہ ثقافت کا معاشی نتائج میں اہم حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اس قسم کے مفروضات ثقافت کو ایک غیر متبدل چیز کے طور پر لیتے ہیں۔ اس طرح کے استدلال کی ایک اہم مثال پھر میکس ویبر (Max Weber) کی طرف سے آتی ہے (1922)، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے مشرقِ وسطیٰ کی نسبتاً معاشی کمزوری کو اسلام کی ''قدامت پسندانہ فطرت'' کے ساتھ منسوب کیا۔ اس طرح کے دعویٰ کی تائید ڈیوڈ لینڈر (David Landes)(1998 ch.24)، ایرک جونز (Eric Jones)(1981,PP.179-84) اور جوئیل موکائر (Joel Mokyr) (1990, PP.205-6) کی تازہ ترین ضخیم تواریخ میں بھی کی گئی ہے، جو ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی پر لکھی گئی اس شاندار کتاب میں یہ بتاتا ہے کہ زیادہ قدامت پسندانہ نقطۂ نظر کی طرف تبدیلی نے مشرقِ وسطیٰ کی طویل المدت تکنیکی پسماندگی میں کردار ادا کیا۔ (21) زیرِ نظر کتاب ایک متبادل توضیح پیش کرتی ہے: قدامت پسندی کسی معاشرے کی کوئی پیدائشی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ تبدیلی کی ترغیب کے فقدان پر مبنی ایک نتیجہ ہے۔ (22)

گریگوری کلارک کی بہت باریک بینی سے تحقیق کی گئی کتاب ''خیرات کو الوداع'' (A



Farewell to Alms) ثقافتی استدلال کا ایک مختلف گوشہ پیش کرتی ہے۔ کلارک یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ شرفا اور متوسط طبقے کی اقدار اواخر قرونِ وسطیٰ اور اوائل جدید دور میں آہستہ آہستہ پورے انگلستان میں اس لئے پھیل گئیں کہ امیر لوگوں کے ہاں غریب لوگوں کی نسبت افزائشِ نسل کی شرح زیادہ تھی اور یہ چیز دُنیا میں اور کہیں واقع نہیں ہوئی۔ کیونکہ زیادہ امیرانہ پسِ منظر کے لوگ معیشت کی تمام سطوح میں پھیل گئے، لہٰذا سرمایہ داری سے متعلق خوبیاں اُن کے ساتھ ساتھ پھیل گئیں۔ جس نے انگلستان کیلئے، مالتھس کے مستقل گزارے کی آمدنی کے جال سے بچ نکلنے کی گنجائش پیدا کر دی۔ کلارک کے نظریے کے مطابق ادارے جدید دولت کی ترقی میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔ یہ ایک دلچسپ مفروضہ ہے جس نے اس ''بڑے سوال'' کے بارے میں کہ کچھ لوگ دولتمند اور کچھ غریب کیوں ہیں، ایک اہم بحث کو چمکا دیا ہے۔ (23) لیکن یہ دلیل کے ایک اہم پہلو سے مناسب طور پر نہیں نمٹتی: جدید معاشی ترقی کا آغاز ایک شمال مغربی یورپ کا مظہر تھا۔ کلارک کی دلیل انگلستان پر تولاگو ہوتی ہے لیکن باقی ماندہ مغربی یورپ پر نہیں۔ اور یہ اُن واضح اختلافات کے وضاحت نہیں کر سکتی جو 1750 تک سلطنتِ عثمانیہ اور شمال مغربی یورپ، نہ کہ محض انگلستان کے درمیان پیدا ہوئے۔

ایک اور توضیح جو کہ دانشور طبقہ کی بجائے مقبولِ عام پریس میں زیادہ حاوی ہے۔ یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے معاشی جمود اور سیاسی تشدد کی وجہ مغربی سامراجیت ہے۔ اس نظریے کے مطابق اُنیسویں اور بیسویں صدی میں شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کی یورپی طاقتوں کے ہاتھوں لوٹ مار نے اس خطے کی معاشی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کی۔ اس دلیل کا ایک بہت مقبول متبادل یہ ہے کہ 1916 کے سائیکس۔ پکاٹ (Sykes-Picot) معاہدے نے، جس کے تحت، قبائلی۔ نسلی یا مذہبی شناختوں کا خیال کئے بغیر نقش گری کی گئی، ان داخلی کشاکشوں کیلئے میدان ہموار کر دیا جن سے یہ خطہ ابھی تک باہر نہیں آ سکا۔ یہ تصور اُن لوگوں کیلئے بڑا دلکش ہے، جو مشرقِ وسطیٰ کے سیاسی، مذہبی اور معاشی رہنماؤں کو اس معاشی جمود میں کردار ادا کرنے سے مبرا کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ یورپی طاقتوں کے دلوں میں مشرقِ وسطیٰ والوں کے بہترین مفادات کا خیال نہیں تھا..... اور یہ کہ بیسویں صدی کی مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی معیشت کی جڑیں سامراجیت میں ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا بہت دشوار ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے مسائل کا بنیادی منبع سامراجیت ہے۔

www.KitaboSunnat.com

ایسی توضیحات اُن کے جواب کی نسبت زیادہ اہم سوال پیدا کرتی ہیں (جن پر تیمور کُران نے بھی توجہ دی ہے): مغربی یورپی طاقتیں پہلے پہل مشرقِ وسطیٰ کو نوآبادیات بنانے میں کیوں کامیاب ہوئیں؟ سامراجیت معاشی اختلافات کی بنیادی وجہ نہیں ہوسکتی، بلکہ یہ دوسری تاریخی طور پر دور دراز معاشی اور سیاسی اسباب کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔

ایک اور مفروضہ، جو اس کتاب میں بیان کئے گئے بہت سے مظاہر کی وضاحت نہیں کرسکتا، وہ جیرڈ ڈائمنڈ (Jared Diamond) کا ''جغرافیائی مفروضہ'' ہے جو ''بندوقیں جراثیم اور فولاد'' (Guns , Germs, and Steel) میں پیش کیا گیا ہے۔ ڈائمنڈ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ زمین کے ٹکروں کی شکل، بعض خاص جانوروں کو پالتو بنانے کی صلاحیت، اور فصلوں کی عطا کے معاشروں کی وقت کے ساتھ ساتھ تشکیل پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیفرے سیکس (Jeffrey Sachs) (2001) یہ استدلال کرتا ہے کہ بیماری کا ماحول۔ خوراک پیدا کرنے کی صلاحیت اور توانائی کے وسائل اس بات کی توضیح کرنے میں مدد کرتے ہیں کہ گرم آب وہوا والے خطوں کی کارکردگی معتدل آب وہوا والے خطوں سے کیوں کم تر رہی۔ مفروضات کا ایک اس سے منسلک سیٹ، سٹینلے اینگرمین (Stanley Engerman) اور کینیتھ سوکولوف (Kenneth Sokoloff) (1997, 2000) کا ہے، جو یہ استدلال کرتا ہے کہ وسائل کی فراہمی نے نئی دُنیا کے مختلف خطوں میں معاشی راستوں کو تشکیل دینے میں مدد دی۔ اگر جغرافیہ ہی طویل المدت معاشی کامیابی کا تعین کار ہے، تو یہ سمجھنا دشوار ہے کہ دُنیا کے کچھ خطے ایک وقت میں اتنے آگے ہوتے ہیں اور بعد میں وہی خطے کیوں اتنے زیادہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ بہرحال جغرافیہ تو عملاً ایک مستقل چیز ہے۔ لہٰذا جغرافیائی مفروضے میں، اس کتاب میں اُٹھائے گئے بنیادی سوال کا جواب دینے میں مشکل ہے: کہ مشرقِ وسطیٰ اتنے طویل عرصے تک مغربی یورپ سے اس قدر آگے کیوں تھا اور آخر کار اس قدر پیچھے کیوں رہ گیا؟ (26)

ایک آخری استدلال جو بحث کا استحقاق رکھتا ہے۔ وہ ہے جسے برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) نے اپنے سفرِ حیات کے آخری حصے میں اپنی کتاب ''کیا غلط ہوا؟'' (What Went Wrong?) میں پیش کیا، لیوس یہ استدلال کرتا ہے کہ اسلامی دُنیا میں مذہب اور ریاست کے درمیان عدم تفریق کا اسلامی معیشتوں پر ایک طویل المدت نقصان دہ اثر ہوا۔ یہ حقیقت، زیرِ نظر



کتاب میں بھی استدلال کا مرکزی نکتہ ہے، اگرچہ اس سے اخذ کردہ نتیجہ لیوس کے اخذ کردہ نتیجے سے مختلف ہے۔ لیوس یہ استدلال کرتا ہے کہ اسلام میں مذہب اور ریاست میں تفریق اس لئے نہیں تھی کیونکہ محمد (ﷺ) نے مقدس سرزمین کو اپنی زندگی میں ہی فتح کرلیا اور پہلی اسلامی ریاست کے سربراہ بن گئے۔ اس لئے ''سیکولرزم'' کا تصوّر اسلامی ممالک میں اجنبی اور ناقابلِ تصور رہا۔ لیوس آگے جا کر یہ استدلال کرتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرتی خصوصیات جو مغرب میں سیکولرزم کے ساتھ وابستہ ہیں۔ شہری معاشرہ اور نمائندہ حکومت..... وہ اسلامی دُنیا میں کبھی ارتقا نہیں پاسکیں۔ لیوس کی دلیل قدرے زیادہ سادگی پسندانہ ہے۔ ایک تصور ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک محض اس وجہ سے ناقابلِ تصور رہے کیونکہ یہ ابتدائی اسلامی اصول کا حصہ نہیں تھا؟ مذہبِ اسلام اور مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں کا سیاسی ڈھانچہ دونوں پچھلے چودہ سو سال میں متعدد محاذوں پر تبدیلی کا شکار ہوئے ہیں، خاص طور پر اسلام کی پہلی چار صدیوں میں۔ اسلام میں کوئی ایسی فطری چیز نہیں ہے جو اُس طریقے سے تبدیلی میں خارج ہو جس طرح لیوس بیان کرتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس کا ایک جواب مہیا کرتی ہے جہاں لیوس کے ہاں اس کا فقدان ہے۔ محض یہ فرض کرنے کی بجائے کہ یہ اختلافات کہ حکمرانوں نے کس طرح عیسائیت یا اسلام کو استعمال کیا، نظام کے اندر ہی ''جُڑے ہوئے'' ہیں، یہ ہمیں اس چیز کی ایک توضیح مہیا کرتی ہے کہ حکمرانوں اور مذہبی حکام کے درمیان جواز بخشی کا تعلق وقت کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ لیوس کے برخلاف، میری توضیح محض اس یورپ مرتکز مفروضے پر انحصار نہیں کرتی کہ مشرق محض اپنے طور طریقوں میں پھنسا رہا۔ اس کی بجائے میرا استدلال یہ ہے کہ جہاں ہم کوئی تبدیلی نہیں دیکھتے، تو اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ وہاں کوئی فطری قدامت پسندی ہے یا کوئی متبادل ''ناقابلِ تصور'' ہے۔ بلکہ اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات متعلقہ کھلاڑیوں کی اکثریت کے مفاد میں ہوتی ہے کہ وہ جمود کی صورتِ حال کو برقرار رکھیں۔

www.PakistaniBooks.org

# اس کتاب کے مخاطب.....اور ایک وضاحت

یہ کتاب اس بیان کا ایک ادراک مہیا کرتی ہے جو اس کے ذیلی عنوان میں پیش کیا گیا ہے: مغرب کیوں امیر ہو گیا اور مشرقِ وسطیٰ کیوں نہیں۔ یہ اس سوال سے نمٹتی ہے کہ جدید دولت کہاں سے آئی، اور اس کی بنیادیں مغرب میں کیوں تھیں اور کہیں اور کیوں نہیں۔ یہ اُن اہم ترین سوالات میں سے ایک ہے جو معیشت دان اور معاشی مورخین اُٹھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس قدر لوگوں نے ماضی میں اس کے ساتھ نمٹا ہے اور مستقبل میں بھی نمٹتے رہیں گے، ایک تسلی بخش جواب کے ایسے مفاہیم ہیں جو محض تاریخی تجسس سے بہت آگے جاتے ہیں۔ اولین اور اہم ترین، جدید دولت کی بنیاد کی بہتر تفہیم، ماہرین، معاشیات، خاص طور پر ترقیاتی ماہرین معاشیات اور معاشی مورخین کیلئے بنیادی دلچسپی کا موضوع ہے۔ سیاسی دانشور اس بات میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ حکمرانوں اور سیاسی اداروں نے اس عمل میں کیا کردار ادا کیا جس نے جدید معیشت کو جنم دیا۔ میں بھی مذہبی اصول اور معاشی نتائج کے درمیان براہِ راست تعلق کے سادہ لیکن غلط دعووں کو مسترد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ مذہبی علما کیلئے بھی اُس حد تک دلچسپی کا موضوع ہے۔ جس حد تک وہ معاشی استدلال کو سُننے کیلئے تیار ہیں۔ اوّل اور اہم ترین یہ کہ اس کتاب کے اس چیز کے بارے میں ایسے مفاہیم ہیں کہ جو اکیسویں صدی کی سب سے جاندار کہانیوں میں ایک بننے کا امکان رکھتی ہے: یعنی سیاست اور معاشیات میں اسلام کا کردار۔ یہ موضوع ہر اس شخص کیلئے دلچسپی کا باعث ہوگا جو مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی معیشت کے بارے میں سوچتا ہے، یا اُس اہم کردار کے بارے میں سوچتا ہے جو مشرقِ وسطیٰ، اکیسویں صدی کی مغربی سیاسی معیشت میں ادا کرے گا۔ اس موضوع میں دلچسپی کی وسعت واضح طور پر محض نظریاتی چیز ہونے سے بہت آگے ہے اور



میں نے یہ کتاب اس انداز سے لکھی ہے جو اس کی عکاسی کرتا ہے۔ ممکنہ حد تک میں نے معاشیات کی گنجلک زبان استعمال کرنے سے گریز کیا ہے اور میں نے تمام مساواتوں کی جگہ الفاظ استعمال کئے ہیں۔

جب کبھی بھی کوئی معاشیات دان عام قارئین کیلئے لکھتا ہے، تو ایسے طریقے سے احتراز کرنا مشکل ہوتا ہے جو غلط تعبیر کو روک سکے۔ یہ بات اس وقت اور بھی زیادہ صحیح ہوتی ہے جب کوئی شخص مذہب پر لکھ رہا ہو، جو کہ ایک ایسا موضوع ہے، جس کے بارے مین بہت سارے لوگوں کے پہلے سے سوچے ہوئے خیالات ہوتے ہیں جو وہ اس کا جواب چاہتے ہیں۔ میں نے پوری کتاب میں ایسی کسی غلط تعبیر کے امکان کو روکنے کی کوشش کی ہے جہاں کہیں بھی یہ موزوں ہے، اور میں نے آخری باب میں استدلال کے بڑے بڑے ناقص تصورات پر دوبارہ غور کیا ہے۔ لیکن ایک ناقص تصور ایسا ہے جو اس تعارفی باب کے اخیر پر غور کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ کتاب کسی طرح مذہب کے خلاف مذمتی تحریر نہیں ہے۔ نا ہی یہ اسلام کے خلاف مذمتی تحریر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ کتاب اس بات کی ایک توضیح تلاش کرتی ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کیوں مغربی یورپ سے پیچھے رہ گیا، اور اس کی یافت یہ ہے کہ ''سیاست میں سے مذہب کو اخذ کرنے'' کا اس عمل میں ایک بڑا کردار ہے۔ لیکن اسلام یا عیسائیت میں فی نفسہٖ ایسی کوئی بات نہیں ہے جو ان اختلافات کی تہہ میں ہو، سوائے ان کی حکومت کو جواز بخشنے کی صلاحیت کے۔ نا ہی مذہب سے مخصوص کوئی چیز ایسی ہے جو معاشی نتائج کیلئے ''بری'' ہو۔ کسی بھی قوت کی طرف ایسے مفادات کی تشہیر جو وسیع تر معاشی کامیابی سے لگا نہ کھاتے ہوں، ممکنہ طور پر ایسے قوانین اور پالیسیوں پر منتج ہوگی جو طویل المدت معاشی خوشحالی کیلئے نقصان دہ ہوں گے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ کتاب کسی متنازع موضوع سے نمٹتی ہے تو یہ سوائے اس کے کہ یہ ایک معیاری معاشی تصنیف ہو کوئی خفیہ ایجنڈا نہیں رکھتی یہ نہ تو اسلام کی حامی یا اسلام مخالف ہے نہ ہی مذہب کی حامی یا مذہب مخالف ہے۔ یہ محض ایک استدلال ہے جو معاشی منطق کو، جدید معیشت کی اصل کی ہماری تفہیم کو بہتر بتاتا ہے اور اس بات کی تفہیم کو کہ جہاں اس نے عروج حاصل کیا اور جہاں نہیں کیا، اُس کے اسباب کیا تھے۔

www.MashalBooks.org

# حصہ اوّل

## حکمرانی کی توسیع: معاشی کامیابی
## اور
## جمود کا ایک نظریہ

www.MashalBooks.org

# (2)

# حکمرانی کی توسیع

تعارفی باب نے ایک اہم معمہ پیش کیا: مشرقِ وسطیٰ کی معیشتیں اسلام کے پھیلاؤ کے صدیوں بعد تک مغربی یورپ کی قیادت کرنے کے بعد، کیوں اُن سے پیچھے چلی گئیں؟ یہ باب اس سوال کا جواب دینے کیلئے ایک ڈھانچہ مہیا کرتا ہے۔ نقطۂ آغاز، ایک اہم ترین معاشی کلیہ سے ہوتا ہے۔ لوگ ترغیبات کا جواب دیتے ہیں۔ ایک قدم مزید گہرائی میں جانے سے یہ سوالات اُبھرتے ہیں: کونسی ایسی ترغیبات ہیں جن کی موجودگی معاشی کامیابی کی طرف اور عدم موجودگی معاشی جمود کی طرف لے جاتی ہے؟ مختلف معاشروں میں ترغیبات مختلف کیوں ہوتی ہیں؟ اُن ترغیبات کا تعین کونسی چیز کرتی ہے جن کا سامنا لوگ کرتے ہیں؟

اُن ترغیبات کی صورت گری کرنے میں جن کا سامنا افراد کرتے ہیں متفرق قسم کی معاشرتی خصوصیات ہوتی ہیں مثال کے طور پر مذہب لوگوں کے اندر بعض چیزیں کرنے اور بعض چیزیں نہ کرنے کی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ اسلام مسلمانوں کے اندر سور کا گوشت کھانے اور الکوحل پینے کی ترغیبات کی نفی کرتا ہے۔ اور یہ ایسا، ان افعال پر ایک ''قیمت'' عائد کرکے کرتا ہے۔ یہ قیمتیں اندرونی (اللہ کو ناراض کرنے کا خوف) بھی ہوتی ہیں اور سماجی بھی (مسلمان کیا خیال کریں گے؟) نکتہ یہ نہیں ہے کہ مسلمان کبھی سُور کا گوشت نہیں کھاتے یا شراب نہیں پیتے؛ محض یہ ہوتا ہے کہ اُن کیلئے ایسا کرنا، غیر مسلموں کی نسبت مہنگا ہوتا ہے اور لوگ اُن افعال کو جو زیادہ مہنگے ہوں کم کرتے ہیں۔

یہ کتاب اُن ترغیبات کی اقسام پر توجہ مرکوز کرتی ہے جو کسی معاشرے کے معاشی نتائج کی



تشکیل کرتے ہیں۔ مرکزی توجہ اُن ترغیبات پر ہے جو اُن قوانین اور پالیسیوں کی تشکیل کرتے ہیں جو کوئی معاشرہ بناتا ہے۔ قوانین اور پالیسیوں کے مشمولات، ساتھ ہی ساتھ وہ طریقے جن سے اُنہیں نافذ کیا جاتا ہے اس بات کے اہم ترین تعین کار ہوتے ہیں کہ آیا ایک معاشرہ معاشی طور پر کامیاب ہے یا نہیں۔ جب وہ قوانین اور پالیسیاں جو کاروبار کو تقویت دیتی ہیں، غیر جانبدارانہ طور پر لاگو کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر وہ جو حقوقِ ملکیت جدّت طرازی، عوامی اشیا میں سرمایہ کاری، معقول ٹیکسوں کا نفاذ، اظہار، اخبارات اور معلومات کی آزادی کو تقویت دیتی ہیں..... تو لوگ ممکنہ طور پر اونچے درجے کے پیداکاری کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔(1)

کاروبار کو تقویت دینے والے قوانین اور پالیسیاں معاشی ترقی کے بیج بوتی ہیں۔ جب سرمایہ کار اپنے سرمائے کا رُخ اس کے اونچے درجے کے پیداکاری کے استعمال کی طرف موڑتے ہیں، جو مستقبل میں زیادہ صرف کی گنجائش پیدا کرتے ہیں، تو پیداوار ابڑھتی ہے۔ جب بڑھتی ہوئی پیداکاری کی سرگرمیوں میں سرمایہ کاری واقع ہوتی ہے۔ تو یہ عمل اپنے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرکب ہوتا جاتا ہے ..... اس کے برعکس، جب قانون ساز ایسے قوانین اور پالیسیاں بناتے ہیں جو کاروبار کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں ..... مراعات یافتہ شہریوں کو عطیات بھاری بھر کم ٹیکسوں کا نفاذ، حقوقِ ملکیت کا غلط استعمال، آزاد منڈیوں پر سخت پابندیاں، یا جنگ کا ماحول .....تو لوگ ممکنہ طور پر یا تو کم پیداواری کاروباروں میں سرمایہ کاری کرتے ہیں یا سرے سے سرمایہ کاری ہی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر جب دسویں صدی میں اسلامی مرکز میں حقوقِ ملکیت کمزور ہوئے تو پن چکیاں اور تعمیراتی کرینیں عملاً غائب ہوگئیں۔ یہ سرمایہ کاری کی ٹھیک ٹھیک وہ قسمیں ہیں جو صرف اُس صورت میں اچھا فائدہ دیتی ہیں جب اُن کے کرایے کے حقوق لمبے عرصے تک محفوظ ہوں۔ ان کی غیر موجودگی نے امکانی پیداوار ای منافع جات کے حصول کو روک دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس سے پیدا ہونے والے نقصانات اور بھی بڑھتے گئے، کیونکہ ان معیشتوں نے کبھی باہمی رضامندی سے معاملات فوائد احساس نہ کیا۔

کاروبار کو ترقی دینے والے قوانین اور پالیسیاں بعض علاقوں میں کیوں ظہور پذیر ہوتی ہیں اور بعض دوسرے علاقوں میں کیوں نہیں؟ جیسا کہ بعد کے ابواب یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کاروبار دوست

www.MashalBooks.org

قوانین اور پالیسیاں صنعتی انقلاب سے پہلے مغربی یورپ کے بعض حصوں میں بہت زیادہ عام ہوگئیں، لیکن مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں نے شاذ ہی ایسے قوانین اور پالیسیاں بنائیں۔ یہ سمجھنے کیلئے کہ ایسا معاملہ کیوں تھا، پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قوانین اور پالیساں کہاں سے آتے ہیں اور وہ مختلف علاقوں میں مختلف کیوں ہو سکتے ہیں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ قوانین اور پالیسیوں کے مافیہ کو تخلیق اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھنے والے بہت سے گروپ ہوتے ہیں اور یہ سمجھنے کیلئے کہ کسی قسم کے قوانین اور پالیسیاں ظہور پذیر ہوتے ہیں، یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ گروپ کس طرح باہمی تعامل کرتے ہیں۔ یہ باب ان تعاملات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، اور اس بات کا کھوج لگاتا ہے کہ ان گروپوں کی آواز کیوں اور کیسے سُنی جاتی ہے، اور یہ چیز کیوں بعض خاص قسم کے قوانین اور پالیسیوں میں فتح ہوتی ہے۔

قوانین اور پالیسیوں کے مافیہ کی تہہ میں موجود قوتوں کی تحقیق کو سیاسی اداکاروں کے سیاسی محرکات اور اُن پابندیوں پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جن کا وہ سامنا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آمر بھی اپنی مرضی کے قوانین اور پالیسیاں نہیں بنا سکتے اُن کے بھی آئین ساز ادارے ہوتے ہیں جن کے آگے وہ جواب دہ ہوتے ہیں، اور شہری بھی بعض قوانین کے خلاف بغاوت کر دیتے ہیں۔ (3) سیاسی اداکاروں کی طرف سے کئے گئے فیصلوں کا تجزیہ کرنے کا سادہ ترین طریقہ لاگتوں اور منافع جات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بعض خاص قوانین یا پالیسیاں بنانے سے سیاسی حکام کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں؟ اُن کے نقصانات کیا ہیں؟ صرف اُس وقت جب فوائد نقصانات سے بڑھ جائیں گے، کوئی سیاسی اداکار کسی قانون یا پالیسی کو بنانے کیلئے جدوجہد کرے گا۔

لیکن متعلقہ کھلاڑی کون سے ہیں؟ وہ کس طرح اور کیوں حکمرانوں کو روک سکتے ہیں؟ تاریخی طور پر، یوروپی بادشاہوں کو قوانین اور پالیسیوں کیلئے مذہبی حکام، پارلیمنٹ میں فوجی اور زمیندار اشرافیہ، اور کبھی کبھار، شہری علاقوں کے کاروباری عمائدین سے گفت وشنید کرنا پڑتی تھی۔ جبکہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران، مذہبی حکام کے ایک ملغوبے، فوجی شخصیات، اور قبائلی طاقت کے دلالوں سے گفت وشنید کرتے تھے۔ ان دونوں خطوں میں کھلاڑی مختلف کیوں تھے؟ حکمرانوں کے ان کھلاڑیوں کے ساتھ باہمی تعاملات کیوں مختلف تھے؟ سب سے اہم بات یہ کہ اس کا مطلب ان خطوں کی معاشی قیمت کیلئے کیا تھا؟ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے درمیان پریشان کُن ''مقدروں کے پلٹے'' سے نمٹنے کیلئے ان سوالات کا جواب دینا ضروری ہے۔



## قوانین اور پالیسیاں کون بناتا ہے اور اُن کی پیروی کیوں کی جاتی ہے؟

اس بات کو سمجھنے کیلئے کہ قوانین اور پالیسیاں کہاں سے آتی ہیں اور وہ مختلف خطوں میں مختلف کیوں ہوتی ہیں، متعدد سوالات کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کون سے فریق قوانین اور پالیسیاں بناتے ہیں؟ اُن کے مفادات کیا ہیں؟ قوانین اور پالیسیوں پر جدوجہد میں ہر فریق کی سودابازی کی طاقت کیا ہے؟ لوگ قوانین اور پالیسیوں کی اطاعت کیوں کرتے ہیں؟

یہ باب ان سوالات کا جواب اشرافیہ کے ادا کئے جانے والے کردار پر، جو وہ قوانین اور پالیسیوں کے بنانے میں اور دوسروں کو ان کی پیروی کرنے پر اُکسانے میں ادا کرتے ہیں، توجہ مرکوز کر کے دیتا ہے۔ میں اشرافیہ کی تعریف اس طرح سے کرتا ہوں کہ وہ لوگ جو اُن لوگوں کے عمل کرنے کے طریقے کو متاثر کر سکتے ہیں جنہیں وہ نہیں جانتے۔ (4) یورپی اور مشرقِ وسطیٰ کی زیادہ تر تاریخ میں مذہبی حکام اہم ترین اشرافیاؤں میں سے تھے۔ اُن کے فرامین لوگوں کو چھوٹی چھوٹی چیزوں جیسا کہ رمضان میں روزے رکھنے اور غریبوں کو خیرات دینے پر اُکساتے ہیں اور صلیبی جنگ یا ایک مقدس جنگ لڑنے جیسی بڑی بڑی چیزیں کرنے پر بھی اُکساتے ہیں۔ اشرافیاؤں کی دوسری اقسام کی بھی تاریخی اور ہم عصر تاریخ میں کثرت ہے۔ قبائلی بزرگ تنازعات طے کرنے اور مشورہ دینے کیلئے اپنی عقل اور اخلاقی قوّت کو استعمال کرتے ہیں۔ فوجی اشرافیہ دوسرے لوگوں کو وہ کام کرنے پر راغب کرنے کیلئے جو وہ ویسے نہیں کرتے، طاقت کا استعمال کرتی ہے اور معاشی اشرافیائیں اثر رسوخ حاصل کرنے کیلئے اپنے سرمائے کو استعمال کرتی ہیں کیونکہ اشرافیائیں دوسروں کو متاثر کر سکتی ہیں، لہٰذا وہ اُن قوانین اور پالیسیوں کی تشکیل کرنے میں مدد دے سکتی ہیں جن کی پیروی لوگ کرتے ہیں لہٰذا یہ مختلف قسم کی اشرافیاؤں کے درمیان باہمی تعامل ہوتا ہے جو قوانین اور پالیسیوں کو چلاتا ہے۔

لوگ کسی اشرافیہ کی طرف سے بنائے گئے ہر قانون اور پالیسی کی پیروی نہیں کرتے۔ مثال

www.MashalBooks.org

کے طور پر جب انگلستان کے بادشاہ چارلس اوّل نے (1625-1649) جہازی ٹیکس .....جو کہ ایک ایسا ٹیکس تھا جسے پارلیمنٹ کی حمایت حاصل نہیں تھی۔ جسے وسیع پیمانے پر ناجائز سمجھا جاتا تھا .....وصول کرنے کی کوشش کی تو اس ٹیکس سے لوگوں نے بڑے پیمانے پر پہلو بچایا اور اُمرانے کھلے بندوں اسے ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ چارلس اوّل کی رعایا نے کیوں بعض صورتوں میں قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کی اور بعض میں کیوں نہیں؟ حکمرانوں کو کونسی چیز روکتی ہے؟ وہ لوگوں کو قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کرنے پر کیسے قائل کرتے ہیں؟

ان سوالات کے جوابات اس ڈھانچے کیلئے بنیادی ہیں جو اس باب میں تجویز کیا گیا ہے۔ وہ تحقیق جو میں نے ایونر گریف (Avner Greif) کے ساتھ مل کر کی (Greif and Rubin 2015) ان جوابات کا کچھ ادراک مہیا کرتی ہے۔ ہمارا استدلال یہ ہے کہ دو ایسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر لوگ قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کرتے ہیں (قوانین اور پالیسیوں کو اب کے بعد میں ''ضابطے'' کہوں گا): اس وجہ سے کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ اُس شخص کو جو انہیں مدوّن کرتا ہے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، اور اس وجہ سے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ ان ضابطوں کی پیروی نہیں کریں گے تو اس کا نتیجہ سزا ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں لوگ کسی ضابطے کی پیروی اُس صورت میں کرتے ہیں، کہ یا تو حکمران ''جائز'' ہو یا اسی وجہ سے کہ وہ کسی قسم کا جبر کر سکتا ہو۔ یا ان میں سے دونوں ہوں۔ لہٰذا ضابطوں کے دو پہلو اس بات کی توضیح کرتے ہیں کہ لوگ اُن کی پیروی کیوں کرتے ہیں: اُنہیں کون ''بناتا'' ہے اور ''اُن کا نفاذ'' کون کرتا ہے۔

بعض ضابطوں کے بارے میں یہ سمجھنے کے لئے لوگ کیوں اُن کی پیروی کرتے ہیں، اتنا جاننا کافی ہوتا ہے کہ اُنہیں کون مرتب کرتا ہے۔ اگر ضابطے کو مرتب کرنے والا شخص ایک ایسا شخص ہے جس کے بارے میں وسیع پیمانے پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ اسے ایسا کرنے کا جائز حق ہے، تو پھر لوگ اس ضابطے کی پیروی کریں گے کیوں کہ اُنہیں یقین ہوگا کہ ایسا کرنا صحیح ہے۔ (5) مثال کے طور پر یورپی بادشاہ تاریخی طور پر ایسے اعلانات یا احکامات جاری کرتے تھے جن کی پیروی اُن کی رعایا، اُس وقت تک کرتی تھی، جب تک وہ اعلانات اُن حدود میں ہوتے تھے جن کے کرنے کا حق اُس جائز بادشاہ کو ہوتا تھا۔ اسی طرح عثمانی سلطان اکثر اوقات اسلامی قانون کی تکمیل کیلئے فرامین جاری کرتے تھے۔ یہ فرامین قانون کی ایک ہیئتِ حاکمہ بناتے تھے، جسے ''قانون''



کہا جاتا تھا، جس کی سند بڑے پیمانے پر سلطان کی جائزیت کی وجہ سے ہوتی تھی۔ جدید ترین جمہوریتوں میں، شہری اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ منتخب شدہ اہل کار اس لئے باجواز ہیں کیونکہ وہ ''عوام کی مرضی سے، حکومت میں ہیں، اور لہٰذا اُنہیں قانون سازی کا حق ہے۔ لوگ ہر قسم کے مذہبی ضابطوں کی پیروی اس لئے کرتے ہیں کیونکہ ایک جائز مذہبی ہیئتِ حاکمہ اس کی حمایت کرتی ہے۔ عیسائی صوم الکبیر (چالیس دن کے روزے) کے دوران بعض معمولات سے پرہیز کرتے ہیں اور مسلمان رمضان کے دوران روزے رکھتے ہیں کیونکہ اُنہیں یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کا کرنا ''صحیح'' ہے۔ ایسے معاملات میں حاکم شخصیت کی نافرمانی کرنے کے اجازت نامے ہو سکتے ہیں، لیکن قانون کی پیروی کی حوصلہ افزائی کرنے کیلئے ایسے اجازت ناموں کی ہمیشہ موزوں ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ، افراد ایسے ضابطوں کی پیروی اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں کسی ایسی شخصیت نے مدون کیا ہے، جنہیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ طرزِ عمل کے بعض ضابطے متعین کر سکیں۔

دوسری صورتوں میں، ضابطوں کا نفاذ اس بات کا بہت زیادہ تعین کار ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی پیروی کیوں کریں، قطع نظر اس کے کہ اُنہیں کون مرتب کرتا ہے۔ قانون کو توڑنا اس وقت بہت مہنگا ہوتا ہے جب ایسا کرنا، قید، جسمانی تشدد یا دولت کی ضبطی پر منتج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حکمران اکثر اوقات پولیس اور عسکری نفری پر سرمایہ کاری کرتے ہیں، خصوصاً اگر اُن کی جائزیت کمزور ہو۔ کسی کو، ایسے کمزور جائزیت والے حکمرانوں کی مثالیں دیکھنے کیلئے، جو طاقت کے استعمال سے اپنی حکومت کو سہارا دیتے ہیں، قبل عرب بہار کے مشرقِ وسطیٰ کی آمرانہ ریاستوں سے زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب لوگ ضابطوں کی اطاعت جبر سے کرتے ہیں، تو اس وقت تک جب تک ضابطوں کو توڑنے سے منسلک سزا باوثوق ہو تو ضابطوں کو مرتب کرنے والے شخص یا تنظیم کی شناخت بے معنی ہو جاتی ہے۔

عموماً صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ ضابطوں کی پیروی کی حوصلہ افزائی کی جائزیت اور جبر جڑواں طور پر کام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ حکمرانوں کی طرف سے عائد کئے گئے ضابطوں کی پیروی اس لئے کرتے ہیں کہ وہ یہ یقین رکھتے ہیں کہ حکمرانوں کو قوانین نافذ کرنے کا اختیار ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ ان قوانین کو توڑیں گے تو اُن کی سزا کیا ہوگی۔ لیکن یہ جاننا کہ

لوگ قوانین کی پیروی کیوں کرتے ہیں اور وہ کس قسم کے قوانین کی پیروی کرتے ہیں، مجموعی کہانی کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ اگر مدوّن کئے جانے والے قوانین اور پالیسیوں کی پیروی ایک حد تک بھی کی جاتی ہے تو پھر بھی یہ اس چیز کی خاصی گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ کہ قوانین کی وسیع حدود کو کامیابی سے لاگو کیا جا سکتا ہے اور یہ حدود بڑھتی جاتی ہیں، جوں جوں حکمران جائزیت یا جبر کی طاقت حاصل کرتا جاتا ہے۔ لہٰذا اب دوسرا سوال یہ ہے کہ: کون سے ایسے قوانین اور پالیسیاں ہوتی ہیں جنہیں حکمران بہت سے دستیاب امکانات میں سے انتخاب کرتے ہیں؟

اس سوال کو پوچھنے کا زیادہ ''معاشیاتی'' طریقہ یہ ہے: حکمرانوں کو افادیت کیا چیز مہیا کر ہے؟ تاریخی طور پر حکمران کئی اہداف حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے: ٹیکس محاصل کو بڑھ علاقے فتح کرنا، اپنی شان وشوکت سے لطف اندوز ہونا، اپنی رعایا کو حفاظت مہیا کرنا اور را دہندگان کو مراعات مہیا کرنا۔ اس کو سادہ بناتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام اقدامات مقصد ایک ہدف حاصل کرنا ہوتا ہے: ''حکمرانی کی توسیع'' اس کو سادہ طریقے سے بیان کیا جا تو یہ ہے کہ کوئی بھی عامل جو کسی حکمران کو اقتدار میں رکھتا ہے اُس کے اقتدار کی توسیع ہے۔(6)

اس کا لبِّ لباب یہ ہے کہ حکمران، اُن ضابطوں کے سیٹ میں سے جس کی لوگ پیر کرتے ہیں، صرف اُنہی ضابطوں کو چُنتے ہیں جو ان کی حکمرانی کو بہترین طور پر توسیع دیتے ایک خاص طور پر افسوسناک مثال وہ معمول ہے جو متعدد عثمانی سلطانوں کی طرف سے اپنا یعنی یہ کہ وہ اپنے سوتیلے بھائیوں کو اقتدار میں پہنچنے پر قتل کروا دیتے تھے۔ نئے سلطانوں کے اپنے رشتہ داروں مروا دینے کا محرک اُن مخالف دھڑوں کو جو تخت کے دعویدار ہوں، سلطان عہد کے دوران تشکیل پانے سے روکنا ہوتا تھا..... دوسرے لفظوں میں اس امکان کو بڑھانا کہ نیا سلطان اقتدار میں قائم رہے۔ اقتدار کو طول دینے کی کم ڈرامائی لیکن زیادہ پھیلی ہوئی مثالوں میں سے، جن میں قوانین اور پالیسیاں اپنے اقتدار کو توسیع دینے کیلئے بنائے جاتے تھے۔ یہ شامل ہیں: فوجی قوت کو مضبوط بنانا، عوامی مفاد کی ایسی چیزوں پر خرچ کرنا جیسا کہ سڑکیں، پُل، پارک، اور تعلیم؛ معاشی، مذہبی اور سیاسی اشرافیاؤں کو مراعات یافتہ سرکاری عہدے دینا؛ اور اُن لوگوں کو قید میں ڈالنا جو سرِ عام حکومت کی مخالفت کریں۔



خلاصہ کلام یہ ہے کہ، حکمران بنیادی طور پر اپنے اقتدار کو توسیع دینا چاہتے ہیں، اگرچہ اُن کے اور بھی محرکات ہو سکتے ہیں۔ اقتدار کو توسیع دینے کا بنیادی ذریعہ وہ ضابطے ہوتے ہیں جو اس چیز کے امکان کو بڑھاتے ہیں کہ ان کا اقتدار قائم رہے۔ لوگ ان ضابطوں کی اطاعت اس لئے کرتے ہیں کہ حکمران باجواز ہے اُسے کچھ جبر کی قوت حاصل ہے، یا دونوں چیزیں ہیں۔(7)

**شکل 2.1:** اس دلیل کا خلاصہ بیان کرتی ہے۔

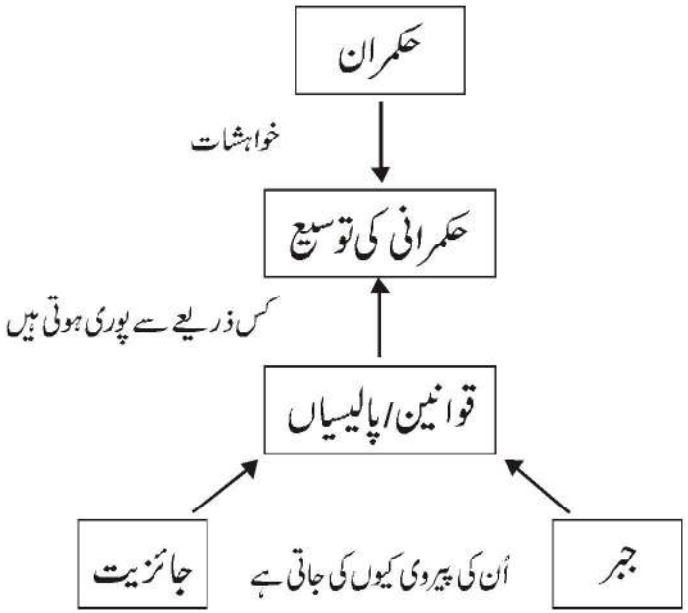


**شکل 2.1:** حکمرانوں کی خواہشات اور وہ کیسے پوری ہوتی ہیں۔

گزشتہ بحث نے اس عمل کے ایک اہم پہلو کو چھوڑ دیا ہے: حکمران جائزیت اور جبر کیسے حاصل کرتے ہیں۔ جائزیت اور جبر کو متوسط اچھائیاں سمجھنا مفید ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک پیداواری عمل کا نتیجہ ہیں، جبکہ ایک اور عمل ایسا ہے جس میں یہ حکمرانی توسیع کی پیداوار میں ایک اندواختہ کا کام کرتے ہیں۔ جائزیت متعدد ذرائع سے آسکتی ہے۔ ایک ذریعہ وہ ہے جسے

میکس ویبر نے ''حاکمیت کی روایتی بنیادیں'' کہا ہے، جو ان وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے عقائد پر مبنی ہوتی ہے جو معاشرے کی روایات میں مانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر پوری دنیا کے معاشروں میں کسی تخت کا وراث ہونا تاریخی طور پر روایتی جائزیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ رعایا ایک وارث کے بارے میں یہ سوچتی ہے کہ اُسے حکومت کرنے کا ایک ایسا حق حاصل ہے جو غیر وارثین کو نہیں ہے۔ جائزیت کا ایک اور ذریعہ وہ ہے جسے ویبر ''حاکمیت کی کرشماتی بنیادیں'' کہتا ہے، جو شخصی خصوصیات اور کامیابیوں پر مبنی ہوتی ہیں، ایک مضبوط شخصیت یا کامیابی کا اچھا ریکارڈ کسی راہنما کو جائزیت عطا کرسکتا ہے، جب یہ اُس کے عوام کی وابستگی کو مضبوط کرتا ہے۔ چنگیز خان، نپولین، سکندرِ اعظم، ایلزبتھ اوّل اور صلاح الدین، یہ تمام اُن افراد کی مثالیں ہیں جنھوں نے اپنی جائزیت کو جزوی طور پر اپنی شخصیتوں اور کامیابیوں سے تقویت دی۔

بیرونی افراد کیلئے بھی حکمران کو جائزیت عطا کرنا ممکن ہوتا ہے: کوئی بھی فرد یا گروپ جو حکمران کے حقِ حکمرانی میں رعایا کے اعتقاد کو بڑھاوا دے سکتے ہیں ''جائزیت بخشنے والے عاملین کہلاتے ہیں۔ (8) جائزیت بخش عاملین وہ افراد یا گروہ ہوتے ہیں، جن کی طرف لوگ ان کی کسی ایسی خصوصیت کی وجہ سے جس سے وہ اُن کی راہنمائی حاصل کرنے کو اہم سمجھتے ہیں، ان کی طرف رہنمائی کیلئے رجوع کرتے ہیں، جائزیت بخش عاملین اپنی تعریف کے اعتبار سے اشراف ہوتے ہیں کیونکہ وہ لوگوں کے عمل کے طریقے کو متاثر کرسکتے ہیں۔

تاریخی طور پر جواز بخش عاملین کی اہم ترین اقسام مذہبی حکام کی تھی (2) قرونِ وسطیٰ کا کیتھولک چرچ ایک بادشاہ کو ایک شہنشاہ بنا سکتا تھا: مثال کے طور پر عام طور پر پوپ روم میں مقدس رومی شہنشاہ کی تاجپوشی کرتا تھا۔ پوپ نے سپین کے فرڈینڈ اور ایزابیلا کو ''کیتھولک شہنشاہ کا نام دیا، جب اُنہوں نے ''وحشی مسلمانوں کو سپین سے نکال دیا اور مذہبی عدالت کو یہودیوں اور نو مذہب یہودیوں کو نکالنے کیلئے استعمال کیا، دورِ وسطیٰ کے اور اوائل جدید دور کے مشرقِ وسطیٰ کے حکمران بھی اپنی جائزیت کو بڑھاوا دینے کیلئے مذہبی حکام کو استعمال کرنے کیلئے مشہور تھے۔ وہ کوئی متنازع چیز کرنے سے پہلے اہم مفتیوں سے فتوے حاصل کرتے تھے، کیونکہ فتوے اس بات کا زوردار اعلان ہوتے تھے کہ مسلمانوں کو حکمرانوں کی پالیسیوں کی پیروی کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر، مشہور عثمانی مفتی ابو مسعود (1490-1574) کو سلطان نے ایسے متنازع اقدامات پر



فتوے دینے کی درخواست کی جو کہ وینس کے لوگوں پر حملے کرنے کی اجازت دینے سے لے کر کافی کے استعمال کو قبولیت بخشنے تک کو محیط تھے، اور عباسی خلیفہ المنتصر (عہد 861-62) نے اپنے والد حکمران خلیفہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنانے سے پہلے چوٹی کے عراقی مذہبی علما سے ایک فتویٰ حاصل کیا۔ (10)

کوئی بھی اشرافیہ جو لوگوں کی حکمران کی پیروی کرنے کی اُن کی ذمہ داری کے بارے میں رائے کو متاثر کرنے کی طاقت رکھتی تھی، بطور جائزیت بخش عامل کے کام کرسکتی تھی۔ مقامی اشرافیائیں، جیسا کہ قبائلی بزرگ یا زمیندار اشرافیہ، اکثر اوقات جائزیت بخش عامل کے طور پر کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ حکمران کو جائزیت عطا کرسکتی ہیں کیونکہ اُن کا مقامی آبادی پر اثر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر عثمانی سلطان، سترھویں صدی کے بعد اپنی حکمرانی کو صوبوں میں توسیع دینے کیلئے مقامی بااثر افراد کو استعمال کرتا تھا۔ بااثر افراد کے پاس قبائلی یا عسکری روابط کی وجہ سے مقامی طاقت ہوتی تھی اور اس طرح وہ ٹیکس اکٹھا کرنے اور نظم وضبط مہیا کرنے کے قابل ہوتے تھے جو کہ سلطان بصورتِ دیگر مہیا کرنے سے قاصر ہوتا تھا۔ اس قسم کے جائزیت بخش عاملین کے اندر اُس بنیاد پر، جسے ویبر (1922) نے ''عقلی بنیادیں'' کہا، حکومت کو جائز قرار دینے کی طاقت ہوتی ہے، جو ''مدوّن شدہ ضابطوں کے قانونی جواز پر اور ایسے ضابطوں کے تحت حاکمیت پر بٹھائے گئے لوگوں کے ایسے ضابطوں کے تحت احکامات جاری کرنے کے حق پر انحصار کرتی ہے۔

حکمران اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کیلئے جبری عاملین کو بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ یہ وہ افراد یا گروہ ہوتے ہیں جن کے پاس جبر کے ذریعے قوانین اور پالیسیوں کو نافذ کرنے کی طاقت ہوتی ہے...... جبری کارندوں کی مثالوں میں، عسکری اشرافیہ، پولیس اہل کار اور جنگی سردار شامل ہیں۔ ایسے افراد حکمران کی مرضی کو طاقت کے ذریعے نافذ کرتے ہیں، اکثر اوقات حکمرانوں کے غیر مقبول پالیسیاں بنانے کے بعد۔ مثال کے طور پر، عثمانی سلطانوں نے اپنی گھوڑ سوار فوجی اشرافیہ کو ''ٹیمار'' نظام کے تحت زمین کے بڑے بڑے قطعات دیئے۔ اور اس کے بدلے میں موخر الذکر لوگ ٹیکس اکٹھا کرتے اور انصاف مہیا کرتے تھے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے نوّابوں کے پاس طاقت کی مقامی اجارہ داری تھی۔ جسے وہ، زمین کے پھل وصول کرنے کے حق کے بدلے میں، مقامی طور پر حفاظت مہیا کرنے اور نظم وضبط قائم کرنے کیلئے استعمال کرتے تھے

www.MashalBooks.org

پورے جدید مشرقِ وسطیٰ میں حکمران مخالفت کو کچلنے اور اپنے آپ کو اقتدار میں رکھنے کیلئے عسکری افواج کو استعمال کرتے ہیں۔ جواز بخش کارندے اور جبری کارندے مل کر ''توسیع کار کارندوں'' کا ایک وسیع تر طبقہ بن جاتے ہیں۔

توسیع کار کارندے حکمرانی کو توسیع کیوں دیتے ہیں؟ اُن کیلئے اس میں کیا ہوتا ہے۔ توسیع کار کارندے حکمران کی حمایت اُن سے کسی توقع کے بغیر نہیں کرتے؛ اُنہیں اُن قوانین اور پالیسیوں کی شکل میں ادائیگی کی جاتی ہے جو اُن کو مفادات بہم پہنچاتی ہیں۔ قوانین بناتے ہوئے ایک حکمران کو اپنے توسیع کار کارندوں کے مفادات پورے کرنے چاہیں، اگر وہ چاہتا ہے کہ مستقبل میں بھی وہ کارندے اُس کے اقتدار کو توسیع دیتے رہیں اگر ایک حکمران اس وجہ سے اتنا طاقتور ہے کہ اُس کی فوج شہریوں کو خوفزدہ کرتی ہے۔ تو اگر حکمران ایسے قوانین بناتا ہے جو فوج کو پریشان کریں، تو بڑا بے وقوف ہے۔ بلاشبہ اپنی چری کور (چودھویں صدی سے اٹھارویں صدی تک سلطان ترکی کا محافظِ خاص دستر) نے ایک سے زیادہ ایسے عثمانی سلطانوں کو قتل کر ڈالا جنہوں نے اس دستے میں اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح ایک ایسا حکمران جو مذہبی انتظامیہ کے حکم کے تحت خدا کی حق کے طور پر حکومت کرنے کا اہل قرار دیا گیا ہو مذہبی عقیدے کے خلاف قوانین بنانے کو انتہائی مہنگا پائے گا، کیونکہ یہ چیز اُس کے خدائی حق کے عقیدے کو تباہ کر دے گی۔ ایرک شانے (Eric Chanay)(2013) اس قسم کی سودے بازی کی ایک شاندار مثال پیش کرتا ہے۔ بارھویں صدی سے چودھویں صدی تک کے اسلامی عصر کا مطالعہ کرتے ہوئے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ دو صورتوں میں مذہبی حکام کو تبدیل کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا..... یا تو جب دریائے نیل معمول سے بہت نیچے ہو (یعنی خشک سالی کے حالات میں جو زراعت کیلئے ناموزوں ہوتے تھے) یا معمول سے بہت اونچا ہو (یعنی طغیانی کی حالت میں ہو) اس کی حکمت بہت سیدھی سادی ہے۔ یہ بالکل انہی حالات میں ہوتا کہ جب خوراک کی کمی ہوتی تھی تو حکمران بغاوت کی سب سے زیادہ زد میں ہوتا تھا۔ ایسے وقت میں مذہبی جواز بخشی کا فائدہ سب سے زیادہ ہوتا تھا، کیونکہ مذہبی حکام لوگوں کو بغاوت سے باز رکھ سکتے تھے۔ نتیجتاً مذہبی حکام کو نیل کی ناکامی کے دوران قوانین اور پالیسیوں میں زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی تھی۔'' [نیل کی ناکامی کے دوران] سُلطان .....دباؤ کے سامنے جھک جاتا تھا اور..... کے خلاف احکامات جاری کر دیتا تھا، عصمت فروشی،



حشیش خوری، شراب نوشی، نامعقول یا حد سے زیادہ پُرتعیش لباس کے خلاف، [یا] عیسائی اور یہودی کار پردازوں کو مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے خلاف۔ (11)

**شکل 2.2: شکل 2.1:** کی توسیع ہے اور ایک ایسی صورتِ حال میں تمام متعلقہ کھلاڑیوں کے درمیان باہمی تعامل کا خلاصہ پیش کرتی ہے۔

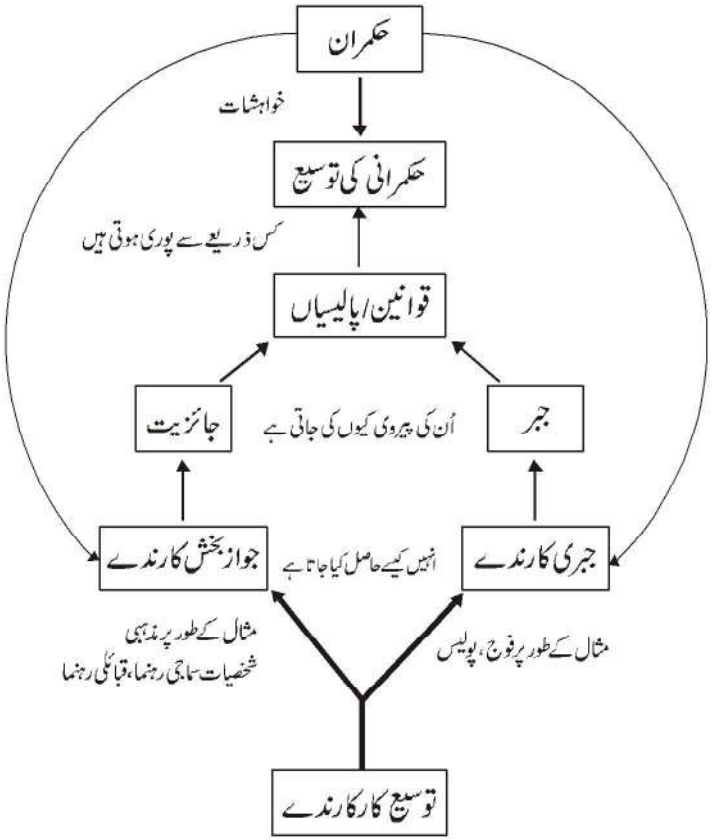


**شکل 2.2:** حکمران اپنی حکمرانی کو کیسے توسیع دیتے ہیں۔

لہٰذا اُن قوانین کی اقسام کے جو کوئی حکمران بناتا ہے اور اُس کی توسیع کار کارندوں کے تشخص کے درمیان ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ جب مذہبی احکام اقتدار کو توسیع دیتے ہیں تو نتیجے

میں بننے والے قوانین مذہبی اصولوں سے ہم آہنگ اور پالیسیاں ایسی ہوں گی جو مذہبی حکام کو اقتدار میں رکھیں۔ مذہبی حکام، مذہبی اصولوں کی حمایت کرنے والی پالیسیوں کی اس لئے خواہش کرتے ہیں کیونکہ ایسی پالیسیاں اُن کیلئے لوگوں پر اپنی اخلاقی حاکمیت قائم رکھنے کو آسان بنا دیتی ہیں۔ جب مسلمان حکمران اسلامی قانون نفاذ کرتے ہیں تو اس سے مذہبی حکام فائدہ اُٹھاتے ہیں، کیونکہ جن ضابطوں کی پیروی کرنے کے بارے میں وہ لوگوں کو بتاتے ہیں وہی ملکی قانون بھی ہوتے ہیں۔ وہ پالیسیاں جن کی خواہش مذہبی حکام حکمران سے بتانے کی خواہش کرتے ہیں کبھی کبھار ترقی کو بڑھانے والی ہوتی ہیں، جیسا کہ غریبوں کی مدد اور تعلیم یا تشدد پسندانہ اقدامات کی ممانعت۔ بعض اوقات اُن کی خواہش کردہ پالیسیاں ترقی کو روکنے والی ہوتی ہیں، جیسا کہ سود لینے اور کرایہ لینے پر پابندیاں، اور عورتوں کی طرف سے اُٹھائے جانے والے بعض اوقات پر قدغنیں۔

فوجی توسیع اور معاشی نتائج کے درمیان تعلق بھی ملا جُلا ہوتا ہے۔ ایک طرف تاجر حضرات قیمتی اشیاء طویل فاصلوں تک بھیج سکتے ہیں کیونکہ وہ معقول حد تک محفوظ ہوتے ہیں کیونکہ بحری قوت اُنہیں بحری قزاقی سے محفوظ رکھتی ہے اور خشکی کا سفر بھی ڈاکہ زنی سے محفوظ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر تیرھویں صدی کے منگول حملے بڑی حد تک تباہ کُن تھے، لیکن اُس منگولوں کے ملاپ جسے اُنہوں نے یوریشیا کے بہت سے علاقوں کو ایک سلطنت میں لاکر اُبھارا، نے خیالات، تکنیکوں، اشیا اور لوگوں کے بہاؤ کو وسعت دی (12) دوسری طرف فوجی اشرافیہ کی طرف سے توسیع معاشی ترقی کیلئے بڑی اہم ثابت ہوسکتی ہے، جیسا کہ منگولوں کی طرف سے، یوریشیا کے بہت سے حصوں کی تباہی شہادت دیتی ہے۔ فوج شہریوں پر جبر بھی کرسکتی ہے اور معاشی ترقی کو دبا سکتی ہے، کیونکہ تشدد کرنے میں اُنہیں ایک برتری حاصل ہوتی ہے۔

معاشی اشرافیہ کی طرف سے توسیع ممکنہ طور پر معاشی ترقی کی طرف زیادہ لے جاتی ہے کیونکہ اُن کے محرکات معاشی طور پر مفید قوانین اور پالیسیوں کے ساتھ زیادہ بڑے درجے تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاشی اشرافیہ زیادہ ذہین ہوتی ہے یا اُنہیں قومی مفادات دوسرے توسیع کارکارندوں کی نسبت زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس، یہ ٹھیک اس وجہ سے ہوتا ہے، وہ اپنے ذاتی مفاد کی تلاش میں ہوتے ہیں، اور اس وجہ سے وہ مجموعہ



معاشی ترقی میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ جہاں یہ بات یقیناً سچ ہے کہ معاشی اشرافیہ عطیات، اجارہ داریوں اور دوسری مراعات جیسی نقصان دہ پالیسیوں کی خواہش رکھتی ہے۔ وہیں پر یہ بات بھی ٹھیک ہے کہ عوامی بہتری کی فراہمی، محفوظ حقوق ملکیت اور غیر جانبدارانہ نظم و ضبط معاشی اشرافیہ کو، معاشرے کے دوسرے طبقات کی نسبت زیادہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔

یہ بات کہ توسیعی عمل کس طرح مخصوص قسم کے قوانین اور پالیسیوں پر منتج ہوتا ہے، کسی طرح بھی سادہ نہیں ہے۔ اس عمل کے تجزیے کو توسیعی کارندوں میں، حکمران کے مختلف متبادلات، یہ کہ پالیسی کے بارے میں اُن کی خواہشات کی طرح ان انتخابات کو متاثر کرتی ہیں، اور مختلف اداکاروں کے درمیان احسان کے بدلے کی نوعیت ان چیزوں کو ضرور مدِنظر رکھنا چاہیے۔ یہ تعاملات تیزی سے پیچیدہ ہوجاتے ہیں، اور یہ اُن بے شمار متبادلات پر منحصر ہوتے ہیں، جو مختلف حالات میں مختلف ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی سے ماہرین معاشیات کے پاس ایک ہتھیار ہے..... کھیل کا نظریہ..... جو ان صورت ہائے حال کا تجزیہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جس میں افراد یا گروہ حکمتِ عملی کے تحت تعامل کرتے ہیں۔

www.MashalBooks.org

# کھیل کا نظریہ اور اداروں کا کردار

پچھلے حصے میں بیان کی گئی صورتِ حال متعدد اداکاروں پر مشتمل ہے، جن میں سے ہر ایک کے اپنے اپنے اور بعض اوقات ایک دوسرے سے متصادم محرکات ہیں۔ ان اداکاروں میں سے ہر ایک کو اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے فیصلے کریں گے تو دوسرے کس طرح کا عمل ردِّعمل کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں جب یہ اداکار قوانین اور پالیسیاں بنانے کیلئے اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ حکمت عملی کے تحت کام کرتے ہیں۔ لہٰذا اُن کے تعاملات کھیل کے نظریے کے تحت تجزیے کیلئے بہت موزوں ہیں۔

کھیل کا نظریہ اس بات کا مطالعہ ہے کہ لوگ اور تنظیمیں داؤ گھات کی صورتِ حال میں کس طرح عمل کرتے ہیں۔ ماہرین معاشیات نے اسے اُن تمام قسم کی صورت ہائے حالات کا ادراک حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا ہے، جہاں معاشی اداکاروں کو، دوسرے لوگوں کے اقدامات کی، جب وہ فیصلے کر رہے ہوتے ہیں، توجیہہ کرنا ہوتی ہے۔ اسے یہ دکھانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے کہ کمپنیاں کس طرح قیمتیں مقرّر کرتی ہیں، کمپنیاں کہاں واقع ہیں، گردوں کے عطیے کی مارکیٹیں کس طرح کام کرتی ہین، لوگ اپنے شریکِ حیات سے شادی کیوں کرتے ہیں۔ فٹ بال کے کھلاڑی کس طرح یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ پینلٹی کی ٹھوکر کس سمت کو لگانی ہے، اور یہاں تک کہ ممالک یہ فیصلہ کیسے کرتے ہیں کہ وہ ایٹم بم کا دھماکہ کریں یا نہ کریں۔ پہلے بیان کی گئی صورتِ حال میں، کھیل کا نظریہ اس بات پر روشنی ڈال سکتا ہے کہ حکمران مختلف حالات کے تحت اپنے توسیعی کارندوں سے کس طرح باہمی تعامل کرتے ہیں۔

کھیل کے نظریے کے تحت سوچنا مفید ہے، کیونکہ یہ حکمرانوں اور اُن کے توسیعی کارندوں کے درمیان تعلق کے نمایاں پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرتا ہے۔ مقصد اُن تمام عوامل کو گرفت میں لینا نہیں ہے جو فیصلہ سازی میں کام کرتے ہیں، بلکہ اُن کی محرکہ قوتوں پر توجہ مرکوز کرنا ہے۔ اس میں



متعدد سوالات پر دھیان دینا شامل ہوتا ہے۔ اوّل متعلقہ کھلاڑی کون ہیں۔ دوم اُن کے محرکات کیا ہیں؟ سوم کھلاڑیوں کے درمیان کیا تعلق ہے؟ چہارم یہ تعاملات اُنہیں اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کس طرح مدد دیتے ہیں؟

کھیل کے نظریے والا ڈھانچہ ان تمام سوالات کے جواب دیتا ہے، جب ایک مرتبہ ڈھانچہ قائم ہوجاتا ہے، تو اس بات کا تجزیہ کرنا آسان ہوجاتا ہے کہ کھلاڑی مختلف صورت ہائے حال میں کس طرح اقدام کرتے ہیں۔ موجودہ صورتِ حال میں ایک عمومی کھیل مصنوعی طور پر تیار کیا جاسکتا ہے، جس میں متعلقہ کھلاڑی ایک حکمران اور توسیعی کارندے ہوں۔ اگرچہ عمومیت کی اپنی حدود ہوتی ہیں۔ جب صورت حال کا مطالعہ قدیم یورپ یا مشرق وسطیٰ کے تناظر میں کیا جارہا ہو، تو توسیعی کارندوں کی شناخت اہمیت رکھتی ہے۔ قدیم یورپ میں کلیسا، معاشی اشرافیہ اور فوج بادشاہوں کو توسیع بخشتے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی حکام اور فوج بنیادی توسیعی کارندے تھے۔ متعلقہ کھلاڑیوں کی شناخت کا علم اہم ہے کیونکہ یہ ہمیں اُن کے محرکات اور ساتھ ہی ساتھ حکمران کے ساتھ ان کے تعلق کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔

کھیل کے نظریے والے نمونوں کو حل کرتے ہوئے ماہرین معاشیات عموماً دُنیا کی ایسی ریاستوں پر توجہ مرکوز کرتے ہیں جن میں کھلاڑیوں کے تمام اقدامات اُن کے اپنے محرکات اور دوسروں کے اقدامات سے ہم آہنگ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں وہ توازن والے اقدامات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ توازن، دُنیا کی ایک ایسی حالت ہے جہاں کسی شخص کیلئے اُس سے مختلف کچھ کرنے کا جو کچھ وہ حال میں کر رہا ہے کوئی جذبۂ محرکہ نہیں ہوتا۔ موجودہ ڈھانچے کے تناظر میں توازن اس وقت واقع ہوگا جب حکمران اپنی خواہش کے مطابق بہترین نتیجہ حاصل کرلے اور اُس کے کارندے بھی اپنی خواہش کے مطابق بہترین نتیجہ حاصل کرلیں۔ حکمران جس طرح چاہتا ہے کہ اُس کے کارندے سودابازی کے عمل میں کردار ادا کریں۔ وہ ویسے ہی کریں اور کارندے جس طرح چاہتے ہیں کہ حکمران کردار ادا کرے، وہ ویسا ہی کرے۔

اس باب میں تجویز کیے گئے کھیل کے نظریے کے ڈھانچے کا اہم جزو، وہ خارجی یا بیرونی عوامل ہیں، جو کھلاڑیوں کے محرکات کو متاثر کرتے ہیں۔ ان اہم ترین عوامل میں سے ایک معاشرے کے ادارے میں۔ اداروں کی ایک سادہ اور زور دار تعریف جو ڈگلس نارتھ

www.NationalBooks.org

(Douglass North) (1990) کی طرف سے پیش کی گئی ہے، یہ ہے کہ یہ کھیل کے ضابطے، نفاذ کے ذرائع اور کھیل کے کھلاڑی ہیں۔ (13) ادارے بہت سی مشکلوں میں سامنے آتے ہیں۔ یہ سیاسی، معاشی، مذہبی، سماجی، قانونی تعزیراتی ہو سکتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کی جاگیردارانہ عدالتیں قانونی/معاشی ادارے کی ایک سیدھی سادی مثال پیش کرتی ہیں۔ یہ جاگیریں رہنے والوں کے درمیان تنازعات حل کرتی تھیں، ہر عدالت کے، جاگیر کی رسم ورواج پر مبنی قوانین ہوتے تھے۔ اور جاگیردار عموماً مقدمات کی صدارت کرتا تھا۔ لہٰذا، یہ عدالتیں کھیل کے ضابطے (وہ اس بات میں مدد کرتی تھیں کہ خصوصی طور پر کون سے قوانین کا نفاذ کیا جائے گا)، نفاذ کے ذرائع (ہارنے والے فریق کو جاگیردار کی طرف سے سزا دی جاسکتی تھی) اور متعلقہ کھلاڑی مقرر کرتی تھیں۔

دوسرے لفظوں میں، ادارے انسانی طرزِ عمل پر قدغنیں لگاتے ہیں۔ یہ قدغنیں طرزِ عمل کو اس لئے متاثر کرتی ہین کیونکہ یہ مختلف اقدامات کے نقصانات اور فوائد کو متاثر کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر حکمران اُس صحت میں ممکنہ طور پر اپنی حکومت کو مذہبی جائزیت کے ذریعے توسیع دیتے ہیں اگر "کھیل کے قواعد" ایسے ہوں کہ مذہبی اصول، مذہبی جائزیت کی اجازت دینے سے لگا کھاتا ہو، اس صحت میں، مذہبی جواز بخشی کا فائدہ اسی کی نسبت ہوگا، اگر ایسا کوئی اصول نہ ہو جس سے مذہب حکمرانوں کو کوئی حکم دے سکے۔

یہ بات کہ ادارے، حکمرانوں اور توسیعی کارندوں کے درمیان باہمی تعاملات کو کیسے متاثر کرتے ہیں، کہانی کا نصف حصہ ہے۔ ادارے بھی وقت کے ساتھ ساتھ، کھیل کے اُن قوانین کے ساتھ جو وہ نافذ کرتے ہیں ارتقا حاصل کرتے ہیں۔ طویل عرصون کے دوران، ادارے اس وقت تبدیل ہوجاتے ہیں جب لوگ کھیل کے پُرانے قوانین کی پیروی کرنا بند کردیتے ہیں اور نئے اداروں کی طرف سے تخلیق شدہ قوانین کی پیروی شروع کردیتے ہیں (14) ایسی تبدیلی اکثر کسی معیشت کیلئے اچھی ہوتی ہے۔ وہ ادارے جو معاشی حالات کی عکاسی کرتے ہوئے تبدیل ہوجاتے ہیں، ایسے طرزِ عمل کا محرک بنتے ہیں جو معاشی انداختوں کو اُن کے انتہائی پیداواری استعمال میں ڈال دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، اگر ادارے اپنے اردگرد کے ماحول کے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہ کریں، تو کھیل کے قوانین معاشی حقائق کی توضیح کیلئے تبدیل نہیں ہوتے اور معاشی مواقع کے ضائع ہوجانے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے ایسا کیوں واقع ہوتا ہے؟ بعض اوقات بعض ادارے، معاشی حالات کے تبدیل ہونے کے ساتھ تبدیل کیوں نہیں ہوتے؟



## حکمرانوں اور اُن کے توسیعی کارندوں کے درمیان کھیلا جانے والا کھیل

کسی بھی کھیل کے نظریے کے تحت بنائے جانے والے ڈھانچے کا سب سے پہلا کام متعلقہ کھلاڑیوں کی شناخت کرنا ہوتا ہے۔ (15) موجودہ مثال میں وہ کھلاڑی ہیں ایک حکمران اور باصلاحیت توسیع کار کارندوں کا ایک سیٹ اس میں وہ توسیعی کارندے بھی شامل ہیں جن کا انتخاب درحقیقت حکمران نہیں کرتا۔ اس کے باوجود وہ کھیل میں ایک اہم کردار ادا کرسکتے ہیں کیونکہ وہ حکمران کیلئے اُس انتخاب کی نمائندگی کرتے ہیں جو اُس کیلئے دستیاب ہوتا ہے۔ کھلاڑیوں کا ایک آخری سیٹ، جس نے اب تک بہت کم توجہ حاصل کی ہے۔ وہ ہیں عام شہری یا غیر اشرافیہ۔ زیادہ تر وہ ڈھانچے کے پس منظر میں موجود ہوتے ہیں کیونکہ زیادہ تر پالیسیاں اشرافیہ کے درمیان سودا بازی کا نتیجہ ہوتی ہیں، تاہم، عام شہری، تمام فریقوں کے اقدامات پر ایک اہم قدغن لگاتے ہیں: کوئی حکمران اقتدار میں نہیں رہ سکتا اگر وہ شہریوں کی حمایت کھودے، اور کوئی توسیعی کارندہ سیاسی طاقت کی حمایت کرنے کی صلاحیت کھودیتا ہے، اگر اس کا شہریوں پر کوئی اثر ورسوخ نہ ہو۔

دوسرا قدم کھلاڑیوں کے محرکات پر غور کرنا ہے۔ سابقہ تجزیے پر اس کی بنیاد ہدف اقتدار میں رہنا ہوتا ہے۔ جسے وہ جائزیت اور جبر کے کچھ ملغوبے سے حاصل کرسکتا ہے۔ توسیعی کارندوں کے محرکات اُن کی شناخت پر منحصر ہوتے ہیں۔ فوجی اشرافیہ عموماً ایسی پالیسیوں کی خواہش کرتی ہے جیسا کہ زیادہ فوجی اخراجات، فتح کی مہمات، یا ٹیکس جمع کرنے کی زیادہ صلاحیت معاشی اشرافیائیں عموماً ایسی پالیسیوں کی حمایت کرتی ہیں جو ان کی اپنی دولت کو بڑھائیں۔ مذہبی حکام عام طور پر خواہش کرتی ہیں، ٹیکس سے استثنیٰ کی، ایسی پالیسیوں کی جو مذہبی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں اور مخالف مذاہب کے دبانے کی۔ (16)

اگلا کام، مختلف کھلاڑیوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کا تعین کرنا ہے۔ تمام کھلاڑیوں کو

ایک دوسرے پر تعامل کرنے سے کچھ حاصل ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ حکمران کو کھیل کھیلنے کا فائدہ واضح ہے: توسیعی کارندے اُس کے اقتدار کے دعوے کو آگے بڑھاتے ہیں، جو جوابی طور پر اُسے اقتدار میں رہنے میں مدد دیتے ہیں۔ کارندوں کو اس کھیل کے کھیلنے کا فائدہ وہ کچھ ہے جو وہ اپنی حمایت کے بدلے میں حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک حکمران، مذہبی حاکمیت کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے کیلئے کسی مذہبی قانون کو نافذ کرسکتا ہے یا کسی مخالف مذہبی تحریک کو دبا جاسکتا ہے۔ بہت سے قبل تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے یوروپی بادشاہ بالکل یہی کچھ کرتے تھے۔ یعنی الحاد کی تحریکوں کو دبانے میں کلیسا کی مدد کرتے تھے۔ یا ایک حکمران معاشی اشرافیہ کو مطمئن کرنے کیلئے عوامی فلاح کی چیزیں مہیا کرسکتا ہے۔ اوائل اسلام کے قائدین عموماً وقف کا عطیہ کرتے تھے، جو اسکول، ہسپتال، مساجد اور دوسری عوامی فلاح کی چیزیں مہیا کرتے تھے۔

مدوّن پالیسیاں، حتمی طور پر حکمران کے کارندوں کے انتخاب اور ان کارندوں کی سودابازی کی طاقت کے نتیجے میں برآمد ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو سمجھنے کی کُنجی، کہ سودابازی کے نتیجے میں کونسی پالیسیاں وجود میں آتی ہیں، درج ذیل سوالات کے جوابات میں پائی جاتی ہیں: حکمرانوں کو اپنے اقتدار کی توسیع کیلئے کارندوں کی کتنی ضرورت ہے؟ کیا کارندے نسبتاً کم قیمت پر توسیع کرنے میں موثر ہوسکتے ہیں؟ کیا حکمران کیلئے توسیع کے متبادل ذرائع ہیں؟ قوانین اور پالیسیوں کے نفع ونقصان کے حجم کا تعین کیا چیز کرتی ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں معاشرے کے ادارے کھیل میں داخل ہوتے ہیں۔ 'کھیل کے اصول' مہیا کرکے ادارے اُن منافع اور نقصانات کو اپنی مرضی کے تحت چلاتے ہیں، جو حکمران کو مختلف طریقوں سے اپنے اقتدار کی توسیع کرانے کیلئے اُٹھانے پڑتے ہیں، اور اس طرح وہ مختلف پالیسیوں کے مدوّن کرنے کے متعلقہ نفع و نقصان کو بھی اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔

توسیعی کارندے اُس وقت موثر ہوتے ہیں جب وہ حکمران کے اقتدار میں ٹھہرنے کے امکان کو مضبوط بنانے کے اہل ہوں۔ وہ ایسا کرنے کے صرف اس وقت اہل ہوتے ہیں جب کھیل کے اصول اس کی اجازت دیں۔ بعض معاشروں میں مذہبی حکام اقتدار کو جواز بخشنے میں انتہائی موثر ہوتے ہیں۔ تاہم وہ صرف اس وقت موثر ہوسکتے ہیں، جب اُن کا لوگوں پر اثر ہو اور



جب کوئی تاریخی یا دینیاتی مواد ایسا ہو جو اُنہیں موثر طور پر اقتدار کو جواز بخشنے کی اجازت دیتا ہو۔ (۱۷) جب کوئی ایسا اصول موجود ہو تو، کھیل کے اصولوں میں سے ایک یہ ہوتا ہے کہ مذہبی رہنماؤں کے پاس اقتدار کو توسیع بخشنے کی اہلیت ہوتی ہے اور بلاشبہ ایسا اصول عیسائیت اور اسلام دونوں میں موجود ہے۔ مساوی طور پر اہم بات یہ ہے کہ، مذہبی جواز بخشی کے ساتھ متعلقہ اخراجات دوسری اقسام کی توسیع کے اخراجات کے مقابلے میں بہت معمولی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انتھونی گل (Anthony Gill) (صفحہ 51 ,1998) نے تحریر کیا ''نظریہ.....نسبتاً کنٹرول کی لاگت کے مقابلے میں نفع بخش شکل ہے، کیونکہ لوگ اپنے اعتقاد کی بنیاد پر اس بات کی اطاعت کرتے ہیں کہ جو کچھ بھی حکومت کرتی ہے ٹھیک ہے۔ اقدار اور معیارات کا ایک نظام تخلیق کرکے ایک مضبوط نظریہ، قابلِ قبول اور ناقابلِ قبول سرگرمیوں کے بارے میں ایک داخلی رہنما مہیا کرکے، شہریوں کے طرزِ عمل کو منضبط کرتا ہے۔''

لہٰذا خصوصی توسیعی کارندوں کو استعمال کرنے کے نفع ونقصان معاشرے کے اداروں پر منحصر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایلیانا بلا (Eliana Balla) اور نویل جانس (Noel Johnson) (2009) یہ بتاتے ہیں کہ عثمانی اور فرانسیسی حکمران دونوں، ٹیکس کے محصولات اکٹھا کرنے کیلئے۔ اشرافیاؤں کو ٹیکس کی ذمہ داریاں دیتے تھے۔ لیکن کارپوریشن سازی کے قوانین میں فرق کے باعث فرانسیسی ٹیکس زمہ دار، اس قابل ہوتے تھے کہ اگر مالی پالیسیاں اُن کی خواہشات کے مطابق نہ ہوں تو وہ اپنے سرمائے کو اکٹھا کرسکتے تھے۔ اور اس طرح باہمی تعاون سے بادشاہ کو روک سکتے تھے۔ عثمانی ٹیکس زمہ داروں کے لئے ایسا کوئی میکانیہ نہیں تھا، لہٰذا وہ کبھی بھی سلطان کو یقینی انداز سے روکنے کے قابل نہ ہوتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں۔ چونکہ فرانسیسی ٹیکس زمیندار زیادہ متحد ہوتے تھے۔ لہٰذا بادشاہ کیلئے اُنہیں ٹیکس کے حصول کیلئے استعمال کرنا زیادہ مہنگا پڑجاتا تھا، کیونکہ اس کی سودابازی کی طاقت بڑھ جاتی تھی، اور اس طرح وہ بادشاہ سے زیادہ کچھ بٹورنے کے قابل ہوجاتے تھے۔ عثمانیوں کیلئے ٹیکس ذمہ داروں کو استعمال کرنا ''ٹیکس جمع کرنے کا نسبتاً کم مہنگا طریقہ تھا، کیونکہ سلطان کو، ٹیکس زمینداروں کو، ٹیکس جمع کرنے کے حق کے بدلے میں نسبتاً کم دینا پڑتا تھا۔ (18)

خلاصہ یہ کہ، حکمران کی کسی کارندے سے توسیع حاصل کرنے کی لاگت اس بات پر منحصر ہے

کہ حکمران کو توسیع پر سودا بازی میں کتنا کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ لاگتیں بہت سی شکلیں اختیار کر سکتی ہیں جو اس بات پر منحصر ہوتی ہیں کہ آیا توسیعی کارندے معاشی، عسکری، یا مذہبی اشرافیہ کے ارکان ہیں یا ان تینوں کا کسی طرح کا مرکب ہیں۔ لاگتوں کا حجم معاشرے کے اداروں پر منحصر ہے۔

اک لمحے کیلئے ان ادارہ جاتی ضوابط کو بیان کردہ انداز سے لیتے ہوئے، ہمیں تمام کھلاڑیوں کے متوازن اقدامات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے توازن کے قضیے کو حل کرنے کیلئے، ذرا غور کریں کہ ہر کھلاڑی جب وہ سودا بازی کی میز پر آتا ہے تو کیا سوچ رہا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے، حکمران اقتدار میں رہنا چاہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنے کیلئے اُسے اپنے کارندوں سے توسیع کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ بیسیوں ایسی پالیسیاں ہیں جو بصورت دیگر اقتدار پر اس کی گرفت کو کمزور کرتی ہیں لیکن وہ اس کے کارندوں کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اسی دوران، کارندوں کے کچھ مقاصد ہیں جن کو وہ اس سودے میں حاصل کرنا چاہیے ہیں۔ کارندے سودا بازی کی ایک چال کے طور پر ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ وہ کم توسیع مہیا کریں یا توسیع کو بالکل روک دیں۔ اگر یہ چالیں قابلِ اعتبار ہوں تو کارندہ حکمران کے ہاتھ کو دبا سکتا ہے۔

فریقوں کی متناسب سودا بازی کی طاقت سودے کے متوازن نتیجے کا تعین کرتی ہے۔ حکمران غور کرتا ہے کہ اُسے اقتدار میں رہنے اور موثر حکمرانی کرنے کیلئے کتنی توسیع کی ضرورت ہے، کتنی توسیع ہر کارندہ اُسے بہم پہنچا سکتا ہے، کارندوں میں سے ہر ایک کی طرف سے ملنے والی توسیع کی کوششوں کی اُسے کیا قیمت چکانی پڑتی ہے۔ پھر وہ ان لاگتوں اور منافع کا وزن کرتا اور ایسے کارندوں کے ایک مجموعے کا انتخاب کرتا ہے جو اُس کی حکمرانی کی توسیع کی کوشش انتہا کی موثر انداز میں کریں۔

اس سودے کے دو ممکنہ نتائج ہو سکتے ہیں۔ اوّل اگر توسیعی کارندہ انتہائی موثر ستا ہے، تو یہ سودا بازی کی اچھی پوزیشن میں ہے۔ اس صورت میں کارندہ جائزیت کو روکنے کی دھمکی دے سکتا ہے۔ اور اس طرح حکمران کو توسیع کے ایک اہم ذریعے سے محروم کر سکتا ہے۔ اگر یہ دھمکی باوثوق ہو تو حکمران اُس کارندے کو پالیسی میں خاصی رعایات دے گا، خواہ یہ پالیسیاں بصورتِ دیگر اقتدار میں رہنے کے اس کے امکان کو کم بھی کیوں نہ کر دے۔

کھیل اُس وقت مزید پیچیدہ ہو جاتا ہے اگر کارندوں کی خواہشات شہریوں کی خواہشات



کے ساتھ لگا نہ کھاتی ہوں۔ ایسی صورت میں ایک حکمران کو، اپنے توسیعی کارندوں اور ایسی پالیسیاں بنانے کے درمیان جو شہریوں کو فائدہ پہنچاتے۔ انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر حکمران اخیر میں کارندوں کی طرف سے حمایت شدہ پالیسی کی حمایت کرتا ہے، تو کسی بھی شہری کو جو اس پالیسی کی خلاف ورزی کرے گا، ''دُگنی سزا'' برداشت کرنا پڑے گی۔ کیونکہ وہ حکمران اور کارندہ دونوں کی پابندیوں کی زد میں ہے۔ مثال کے طور پر، کوئی بھی شخص جو عورت کی ماتحتی کے سعودی قوانین کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے' اُسے مذہبی حاکمیت کی طرف سے روحانی سزاؤں اور ساتھ ہی ساتھ جیل یا جرمانوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ چیز شہریوں کے اندر مستقبل میں ایسے اقتدار کی تبدیلیوں کیلئے دباؤ ڈالنے کیلئے جذبۂ محرکہ میں مزید کمی پیدا کرتا ہے۔ ایک بُرائی کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے، جہاں وقت گزرتے کے ساتھ ساتھ، شہریوں کے اندر تبدیلی کیلئے دباؤ ڈالنے کا جذبۂ محرکہ کم ہو جاتا ہے، اور حکمران اور توسیعی کارندوں کو ان قوانین اور پالیسیوں پر سودا بازی کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، کیونکہ یہ عوام کے مفاد میں نہیں ہوتیں۔ (19) یہ بھی ممکن ہے کہ معاشرہ تبدیلی کے حق میں دلائل کو جب وہ ایک مرتبہ رائج الوقت رُجحان سے باہر نکل جائیں، بھول ہی جائیں۔ جس کا مطلب ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قوانین میں تبدیلی کیلئے دباؤ شہریوں کی بھی ترجیح نہیں رہتی۔ (20)

جب توازن میں چُنے گئے کارندے مہنگے یا غیر موثر ہوں تو اس کے اُلٹ منطق لاگو ہوتی ہے۔ اس صورت میں اگر کارندے کے مطالبات بہت زیادہ ہوں۔ تو حکمران توسیع کی کسی اور شکل کو اختیار کرنے کی دھمکی دے سکتا ہے۔

لہٰذا اس سودا بازی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے قوانین اور پالیسیاں حکمران کی خواہشات کی زیادہ عکاسی کرتی ہیں۔ جب شہریوں کے اقدامات کو مدِّنظر رکھا جائے تو یہ نتیجہ بھی اپنے اندر زوردار نتائج رکھتا ہے۔ اگر معاشی حالات کچھ شہریوں کے اندر ایسے قوانین کو تبدیل کرنے کیلئے دباؤ ڈالنے کا جذبۂ محرکہ پیدا کرتے ہیں، جو کارندوں کی خواہشات کے خلاف ہیں، تو زیادہ امکان ہے حکمران ان تبدیلیوں کو قانون بنا دے گا، کیونکہ اُسے اُن توسیعی کوششوں کے کھونے کا ڈر نہیں ہوتا جو کارندہ مہیا کر سکتا ہے۔ لہٰذا، شہری مستقبل میں قوانین کی تبدیلی پر دباؤ ڈالنے کیلئے زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے اُنہیں کارندے کی طرف سے عائد کئے جانے

والے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اُنہیں بادشاہ کی طرف سے سزاؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ چیز ایک ایسے دائرے کی طرف لے جاسکتی ہے جو دوسری سمت میں حرکت کرتا ہے، جس میں جب شہری زیادہ کا تقاضا کرتے ہیں تو حکمران زیادہ سے زیادہ کی اجازت دیتا ہے حالات اور ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں معاشرے کے قوانین اُس سے یکسر مختلف ہو جاتے ہیں جتنے وہ ابتدائی دباؤ سے پہلے تھے۔



# طویل المدّتی ادارہ جاتی تبدیلی (اور جمود)

جب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قوانین اور پالیسیاں ڈرامائی طور پر تبدیل ہوتی ہیں تو ادارے بھی، نئی حقیقت کو کھپانے کیلئے تبدیل ہو سکتے ہیں۔ طویل عرصے میں یہ ممکن ہے کہ حکمران کا نفع نقصان کا حساب کتاب وقت کے ساتھ تبدیل ہو، ٹھیک اس وجہ سے کہ لوگ اپنے مفاد میں کام کرتے ہیں۔ جب ایسا واقع ہوتا ہے، تو ادارے اندرونی طور پر تبدیل ہو جاتے ہیں۔

**شکل 2.3:** اس عمل کی نمائندگی سادہ شکل میں کرتی ہے۔

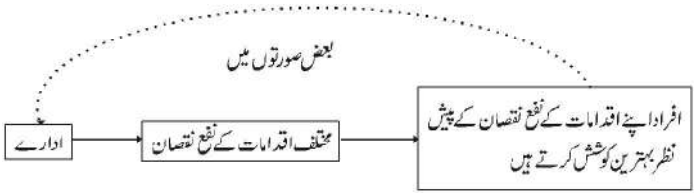


یہ کتاب اس بات پر توجہ مرکوز کرتی ہے کہ ادارے کیوں تبدیل ہوتے ہیں۔ یا تبدیل نہیں ہوتے ..... جب سیاسی اقتدار کو مذہب کی طرف سے جائزیت ملتی ہے۔ مذہبی توسیع اُس وقت مؤثر ہوتی ہے جب مذہبی حکام کا آبادی پر اثر ہوتا ہے اور جب مذہبی اصول حکمرانی کو جائزیت بخشنے میں مددگار ہوتا ہے۔ یہ بات اسلام اور عیسائیت جسے وحدت پرست مذاہب کے بارے میں اور بھی زیادہ سچی ہے۔ مورت لیکن (Murat Lyigun) (2015 باب 2) یہ استدلال کرتا ہے۔ وسیع اعداد و شمار کے تجزیے کی مدد سے، کہ وحدت پرست مذاہب حکمرانی کو توسیع دینے کیلئے اچھے ہیں کیونکہ وہ سیاسی اور مذہبی حکام پر اجارہ داری کی طاقتوں کا رنگ چڑھا دیتے ہیں۔ لیکن مذہبی حکام محض اس وجہ سے حکمرانوں کو جائز قرار دینے کا دعویٰ نہیں کر سکتے اگر یہ مذہبی اصول سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اس طرح مذاہب کسی حد تک منفرد ہیں ..... مطابقت کے معاملات، اور

بنیادی وجہ کہ مذہبی حکام سب سے پہلے حکمرانی کو توسیع دینے کے اہل ہیں، یہ ہے کہ خُدا کے ''ابدی'' کلام کی کُنجیاں اُن کے پاس ہیں۔ ان'' کُنجیوں'' کو بہت سی تہذیبوں میں خواہ وہ تاریخی ہوں یا موجودہ، بہت اہمیت حاصل ہے غالباً ارتقائی اسباب کی بنا پر: انسان نامعلوم اور ناقابلِ علم، سوالوں کے جواب چاہتے ہیں، اور مذہب یہ جواب مہیا کرتا ہے۔ یہ چیز مذہبی حکام کو شہریوں پر طاقت عطا کرتی ہے.....یہی چیز ہے جوانہیں ''اشرافیہ'' بناتی ہے.....لیکن اس حد تک جس حد تک اُن کے جوابات تضادات سے پاک ہوں لہٰذا متضاد بیانات حاکم کی سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے کی اہلیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ (21) مذہبی حکام بڑی بڑی تبدیلیوں کی ایسی عقلی توجیہہ کر سکتے ہیں، کہ وہ مذہبی اصول کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں، لیکن پھر بھی وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اُن عقلی توجیہات میں سے انتخاب کریں جو دستیاب ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ''کھیل کے اصول'' ایسے ہیں کہ اُن مذہبی بیانات کا اثر جو حکمرانی کو جائزیت بخشتے ہیں، مذہبی اصول کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی شرط سے مشروط ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہبی اصول تمام حالات میں جامد رہتا ہے؛ اس کا مطلب محض یہ ہے کہ مذہبی حکام کیلئے اپنے بیانات کو تبدیل کرنے کا نقصان، دوسری اقسام کے توسیع کارندوں کے نقصان سے زیادہ ہے۔

ایک خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی حکام اُس وقت ایک مایوس کُن صورتِ حال میں ہوتے ہیں جب لوگ واضح طور پر اُن کے فرامین کی نافرمانی شروع کر دیں۔ مذہبی حکام کے پاس پالیسی کے مقاصد کی ایک پوری فہرست ہوتی ہے۔ جس میں زیرِنظر مسئلے پر اُن کے خیالات بھی شامل ہوتے ہیں۔ اگر آبادی کے بڑے بڑے جتھے مسئلہ زیرِ نظر پر اُن کے موقف کی سرِ عام مخالفت شروع کر دیں، تو وہ اپنی ساکھ اور لہٰذا حکمرانی کو توسیع بخشنے کی اپنی اہلیت بھی کھو دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم عصر کیتھولک چرچ اپنے ارکان کو کھوتا چلا جا رہا ہے، جوں جوں یہ درج ذیل معاملات پر اپنے موقف کے ساتھ وابستگی برقرار رکھے ہوتے ہیں: امتناعِ حمل، طلاق اور ہم جنس پرستی۔ اگرچہ یہ معاملات کلیسا کے مجموعی اصولی معاملات کا ایک حقیر سا حصہ بنتے ہیں۔ لہٰذا، اس ایک معاملے پر، مذہبی حکام کیلئے اپنے نظریات کو تازہ ترین معلومات سے ہم آہنگ کرنے کیلئے ایک مختصر مدّت کا محرک موجود ہے۔ لیکن مذہبی تعبیرِ نو میں ایک اہم طویل مدتی نقصان ہے۔ یہ مذہبی حکام کی طاقت کی نوعیت کو ہی تباہ کر دیتی ہے۔ یہ ایک بنیادی پہلو ہے جو مذہبی حکام کو دوسری قسم



کے توسیعی کارندوں سے ممتاز کرتا ہے:۔ باہمی دُنیاوی ربط کے معاملات اس مذہب سے مخصوص ادارہ جاتی پہلو کا مطلب ہے کہ مذہبی اور سیاسی اشرافیہ کے درمیان تعلق وقت کے ساتھ کمزور ہو سکتا ہے۔ اگر مذہبی حکام عام شہریوں کے ساتھ نسبت قائم رکھنے کیلئے مذہبی اصول کی تعبیر نو کرتے ہیں، تو وہ مستقبل میں جائزیت بخشنے کی اپنی اہلیت کو تباہ کرتے ہیں، اور اس طرح مذہبی توسیع کے فوائد کو محدود کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف، اگر وہ افراد کو اپنے فرامین کی پامالی کی بغیر جواب دیئے، اجازت دیتے ہیں'' تو وہ مختصر مدت بعد طویل مدّت دونوں میں اقدامات پر اپنا اثر ڈالنے کی صلاحیت کھو دیتے ہیں، کیونکہ مذہبی اصول کی خلاف ورزی کرنا ایک معمول بن جائے گا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذہبی پیشوا حکمرانی کو توسیع دینے کی کمزور اہلیت کے ساتھ، وقت گزرنے پر اور بھی کمزور ہو جائیں گے۔ یہ عمل جاری رہے تو وہ وقت آجائے گا جب حکمران مذہبی پیشواؤں کو اُن کارندوں کے سیٹ میں سے خارج کر دیں گے جو اُن کے اقتدار کو توسیع دیتا ہے۔

تاہم، ایسی طویل المدتی تبدیلی اُس وقت واقع نہیں ہوتی جب مذہبی حکام، سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے میں انتہائی موثر ہوں۔ ایسی صورت میں، اوّل تو اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ شہری مذہبی فرامین کی خلاف ورزی کریں، کیونکہ حکمران اُن کی خلاف ورزیوں کی حمایت نہیں کرے گا۔ لہٰذا، مذہبی حکام کو کبھی اُمید افزا فیصلہ نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ اسے کبھی مذہبی اصول کی تعبیرِ نو کیلئے دباؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا مطلب ہے کہ حکمران اور مذہبی حکام کے درمیان جواز بخشی کا تعلق وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا ہے۔

اس منطق کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ وہ ادارہ جاتی اختلافات جو معاشروں کے درمیان بہت چھوٹے ہوتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے اختلافات بن سکتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی معاشرہ کسی ایسے توازن کی طرف بڑھنے لگتا ہے، جہاں مذہبی اصولوں کی کھلے بندوں پامالی ایک معمول بن جائے تو پھر ایک ایسا دائرہ چل پڑتا ہے، جہاں یہ اقدامات، اس سے زیادہ ادارہ جاتی تبدیل میں جا کر مل جاتے ہیں اور یہ اُس درجے کو بڑھا دیتے ہیں جس میں مذہبی فرامین کی خلاف ورزی کی جاتی ہے، جو پھر اس سے بھی زیادہ ادارہ جاتی تبدیلی میں شامل ہو جاتی ہے۔ ایسا دائرہ اُس وقت واقع ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا، جب مذہبی حکام اقتدار کو جواز بخشنے میں بہت زیادہ موثر ہوں، کیونکہ پھر اس دائرے کو شروع کرنے کیلئے کوئی محرّک نہیں ہوتا۔ پھر خواہ

دونوں معاشروں میں ادارہ جاتی تبدیل سے واقع ہونے والے معاشی مفادات ایک ہی کیوں نہ ہوں۔لیکن ایک ادارہ جاتی اختلاف واقع ہوسکتا ہے: اوپر بیان کردہ میکانیہ حکمران اور اُس کے کارندوں کی تنگ ذاتی خواہشات پر منحصر ہوتا ہے، تاکہ اُن کے سودابازی کے نتیجے کی استعداد پر۔

یہ ادارات ایک دوسرے میکانئے کے ساتھ منسلک ہیں جس کے ذریعے ادارے طویل عرصے میں تبدیل ہوتے ہیں:

یعنی راستے پر انحصار۔راستے پر منحصر، واقعات کا سلسلہ وہ ہوتا ہے، جس میں وہ بنیادی محرک جو واقعات کے سلسلے کو تحرک دیتا ہے، آخری نتیجے سے بہت دور ہٹا ہوا ہوتا ہے، اور وہ علت غاتی جس نے کسی راستے پر حرکت کو چٹگاری دکھائی تھی، کا طویل المدنی طرزِ عمل پر کوئی براہِ راست اثر نہیں ہوتا۔ یہ اُس وقت واقع ہوتا ہے جب راستے پر ہر قدم کا دارو مدار پچھلے قدم پر ہو۔ باب اوّل نے ان اقدامات کو، کسی معاشرے کے معاشی یا ادارہ جاتی راستے پر ''دوراہوں'' سے تعبیر کیا تھا۔ جب کوئی معاشرہ اس دوراہے کی ایک سمت کو اختیار کرتا ہے، تو ایک نیا راستہ اُبھرتا ہے، جوان اسباب سے، جنہیں معاشرے نے ابتدائی راستے پر پہلی مرتبہ چُنا تھا، بہت دور ہٹا ہوا ہوتا ہے۔(22)

معاشی تاریخ کے تناظر میں، راستے پر انحصار میں یہ بات شامل ہے کہ ادارے ایسی صورت ہائے حال میں تخلیق ہو سکتے ہیں، جن میں انسان کسی مسئلے کا حل پاتے ہیں۔لیکن وہ اُس مسئلے کے حل ہوجانے کے بعد بھی طویل عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں ادارے پھر بھی کھیل کے قوانین مہیا کرتے رہتے ہیں، اگرچہ کھیل کے اہم حصے اداروں کی تخلیق کے وقت وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تاریخی صورتِ حال جس پر یہ کتاب توجہ مرکوز کرتی ہے، اس نکتے کی ایک مثال ہے: قرونِ وسطیٰ کے مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے حکمران اپنے اقتدار کو جزوی طور پر مذہب کے ذریعے جواز بخشتے تھے۔ کیونکہ کھیل کے قوانین اس بات کی نشاندہی کرتے تھے کہ یہ اُن حالات کے تناظر میں جن کا اُنہیں سامنا تھا، اقتدار کو توسیع دینے کا انتہائی موثر حل تھا۔ جب ایک مرتبہ کھیل کے یہ قوانین مدوّن ہوگئے، تو مذہبی کارندوں کی خواہشات نے اُن قوانین اور پالیسیوں کو متاثر کرنا شروع کردیا جو نا قابلِ پیش بینی اور نادیدہ حالات کے جواب میں پیدا ہوتی تھیں۔ ایسے عمل کی ایک اہم تاریخی مثال، باب پنجم کا موضوع ہے، جو اس بات کا تجزیہ کرتا ہے



کہ سلطنتِ عثمانیہ گٹن برگ (Gutenberg) کے قابل انتقال چھاپہ خانے کو اپنانے میں کیوں ناکام ہوگئی۔مختصر الفاظ میں، چھاپہ خانہ سلطان کی اپنے اقتدار کو طول دینے کی صلاحیت کیلئے ایک خطرہ بن گیا، کیونکہ یہ مذہبی حکام کے مرتبے کیلئے خطرہ بن گیا، یہ ایجاد اُس وقت نا قابلِ پیش بینی تھی، جب سلطنت عثمانیہ کے توسیعی اقدامات ظہور پذیر ہوئے۔ لہٰذا سلطنت عثمانیہ میں چھاپہ خانے پر پابندی، راستے پر منحصر واقعات کے سلسلے کا نتیجہ تھی۔ اور لہٰذا اس کی توضیح تاریخ میں گہرا جانے اور اُن واقعات کی تلاش کرنے سے کی جاسکتی ہے، جو اوّل اوّل ان واقعات کے اُبھرنے کا سبب بنے۔

www.MashalBooks.org

# قابلِ آزمائش پیش بینیاں

کسی بھی اچھے معاشی ڈھانچے کو قابلِ تکذیب، قابلِ آزمائش پیش بینیاں مہیا کرنی چاہئیں۔ بصورتِ دیگر، یہ معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہوتا کہ آیا یہ صحیح ہے یا یہ کہ یہ ہمیں حقیقی دُنیا کے بارے میں کچھ بتاتی ہے، اس مقصد کیلئے، یہ باب اپنا اختتام اس ڈھانچے کے بڑے مفاہیم کا خلاصہ بیان کرنے پر کرتا ہے، جو کہ اس کتاب میں پیش کئے گئے بنیادی سوال سے متعلق ہیں: مغربی یورپ کی معیشتیں کیوں مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کے برابر آ گئیں اور آخر کار اُن سے بہت آگے نکل گئیں۔

پہلی، اور انتہائی سیدھی، قابلِ آزمائش پیش بینی حکمرانوں اور اُن کے کارندوں کے درمیان قلیل مدتی سودے کے نتیجے سے متعلق ہے۔ اگر مذہبی پیشوائیت حکمران کو جواز بخشتی ہے تو ہمیں ایسے قوانین کی توقع رکھنی چاہیے جو مذہبی حکام کے حق میں ہوں۔ یہی بات اُس صورت میں بھی صحیح ہے اگر معاشی یا فوجی اشرافیہ حکمران کو توسیع عطا کریں۔ دوسرے لفظوں میں درج ذیل پیش بینی کو درج ذیل قرار دینا چاہیے:

## قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر1:

کسی معاشرے کے قوانین اور پالیسیوں کو حکمران کے توسیعی کارندوں کی خواہشات کا عکّاس ہونا چاہیے۔

قابلِ آزمائش پیش بینی 1 کا مفہوم یہ ہے کہ توسیعی کارندوں کے محرکات اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر وہ بنیادی طور پر ایسے قوانین اور پالیسیوں کی خواہش رکھتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کو، باقی ماندہ آبادی کی قیمت پر، فائدہ پہنچائیں تو اس کے نتیجے میں معاشی خوشحالی کا پیدا ہونا ناممکن ہے: خواہ اُن کی خواہشات نقصان دہ بھی ہوں تو بھی وہ اپنی آواز کو آگے پہنچا دیتے ہیں کیونکہ وہ حکمرانی کی توسیع میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک مثالی دُنیا میں توسیعی کارندے کی خواہشات معاشی



خوشحالی سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ یعنی یہ کہ یہ کارندے ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں: عوامی بہتری کی اشیا کی فراہمی، محفوظ حقوقِ ملکیت، غیر جانبدارانہ نظم وضبط، عوام کی تعلیم، طویل فاصلوں پر کاروبار کرنے والے تاجروں کیلئے حفاظت اور علیٰ ہذا القیاس، یہ مثالی دُنیا کبھی وجود میں نہیں آتی، لیکن کچھ معاشرے، کچھ دوسرے معاشروں کی نسبت اس کے قریب تر آ گئے ہیں۔ یہ معاشرے وہ ہیں جہاں معاشی اشرافیہ کو سودا بازی کی میز پر ایک اہم نشست حاصل ہوتی ہے۔ مذہبی یا فوجی اشرافیاؤں کے برخلاف، معاشی اشرافیاؤں کے مفادات ایسے ہوتے ہیں، جو اوپر بیان کئے گئے قوانین اور پالیسیوں سے مطابقت رکھتے ہیں۔

قابلِ آزمائش پیش بنی 2 اس ادراک کا خلاصہ یوں بیان کرتی ہے۔

## قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر2:

وہ معاشرے جن میں معاشی اشرافیائیں حکمرانی کی توسیع میں کچھ کردار ادا کرتی ہیں، آخر کار زیادہ کامیاب ہوں گے۔ بہ نسبت اُن معاشروں کے جن میں معاشی اشرافیہ حکمرانی کی توسیع میں کوئی کردار ادا نہیں کرتی۔

یہ ڈھانچہ یہ بھی نشاندہی کرتا ہے کہ جب مذہبی جواز بخشی اہم ہو، تو یہ اہم ہی رہتی ہے، خواہ دُنیا تبدیل بھی ہو جائے۔ اور اس وقت طویل المدتی کامیابی کے راستے میں رُکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں، جب وہ قوانین اور پالیسیاں جنہیں معیشت کی ترقی کے فطری راستے میں تبدیل ہونا چاہیے، اُس کی بجائے قائم رہیں۔ حالات کا ایسا تسلسل اُس وقت ظاہر نہیں ہوتا، جب مذہبی جواز بخشی کم موثر ہو یا زیادہ مہنگی ہو۔ ایسی صورت میں مذہبی حاکمیت کے اندر ایسی پابندیاں عائد کرنے کی اہلیت کم رہ جاتی ہے۔ جو طویل المدتی معاشی ترقی کیلئے نقصان دہ ہوں، اور توسیع کی دوسری شکلیں وقت گزرتے کے ساتھ ساتھ زیادہ دلکش ہوتی جاتی ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ادارہ جاتی تبدیلی ایک ایسے طریقے سے آگے بڑھتی ہے، جس کی صورت گری، متعلقہ اداکاروں کے معاشی نہ کہ مذہبی، محرکات کرتے ہیں، جو ابی طور پر، معاشرے کے ادارے ممکنہ طور پر، معاشی ترقی کیلئے زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اور یہ نتیجہ وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ قابلِ آزمائش پیش بنی 3 ان ادارکات کا خلاصہ یوں بیان کرتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

## قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر3:

جب مذہبی جواز بخشی بہت زیادہ مؤثر یا سستی ہو، تو حکمران اپنی حکمرانی کو قلیل مدت یا طویل مدت کیلئے توسیع دینے کیلئے مذہب کا ذریعہ اختیار کرتے ہیں۔ خواہ معاشی حالات تبدیل ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اگر مذہبی جواز بخشی کم موثر ہو یا زیادہ مہنگی ہو تو جب ایک مرتبہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں جو اس کے موثر پن کو کم کر دیں یا دوسری قسم کی توسیعی کوششوں کی لاگت کم کر دیں۔ تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا استعمال کم ہوتا جائے گا۔

قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر ۳، جس کا خلاصہ قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر 4 میں پیش کیا گیا ہے کا ایک حاصل کلام یہ ہے کہ وہ اختلافات جو ایک وقت میں معاشروں کے مابین توسیعی انتظامات کے چھوٹے چھوٹے اختلافات تھے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیل کر بڑے اختلافات بن سکتے ہیں جب ایک معیشت جامد ہو جائے اور دوسری بدلتے ہوئے معاشی حقائق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔

## قابلِ آزمائش پیش بینی نمبر4:

ایک ایسا معاشرہ جس میں مذہبی حکام سیاسی جواز بخشی کا ایک اہم ذریعہ بن جائیں، آخر کار جمود کا شکار ہو جائے گا، اگر ادارے تبدیل ہوتے ہوئے معاشی حالات کے جواب میں تبدیل ہوتے ہوتے معاشی حالات کے جواب میں تبدیل نہیں ہوتے۔ نتیجۃً ایک ایسا معاشرہ جس میں مذہبی حکام سیاسی جواز بخشی کیلئے کم اہم ذریعہ ہوں۔ وہ معاشی طور پر آگے بڑھے گا، اگرچہ کبھی یہ پیچھے بھی کیوں نہ رہا ہو۔ لہٰذا قابلِ آزمائش بینی نمبر 3 اور نمبر 4 اُس تاریخی معمے کا ایک ممکنہ جواب پیش کرتی ہیں جو پہلے باب میں اُٹھایا گیا تھا: مشرقِ وسطیٰ کی کامیاب معیشتیں آخر کار مغربی یورپ سے، جو کہ کبھی معاشی طور پر پھسڈی تھا، کیوں پیچھے رہ گئیں اگر مذہبی حکام نے مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کو اپنے مغربی ثنیٰ لوگوں کی نسبت زیادہ مہنگے طریقے سے جائزیت دی، تو ''مقدروں کے پلٹے'' کی توضیح ڈھانچے کے تناظر میں ممکن ہے۔



قابلِ آزمائش پیش بینیاں ایک چیز ہیں۔ آیا تاریخی ریکارڈ انہیں بالکل دوسری شکل میں پیش کرتا ہے۔، اگلا باب اس موضوع سے نمٹتا ہے اس بات کا کھوج لگاتے ہوئے کہ مذہبی توسیع اسلامی اور عیسائیت میں کیوں اہم تھی۔ اور دونوں مذاہب میں حکمرانوں کو ملنے والے اس کے فوائد کیوں مختلف تھے۔

www.MashalBooks.org

# (3)

# حکمرانی کی توسیع کی تاریخی بُنیادیں

1521 میں اٹلی کی 1526-1521 والی جنگ سپین اور فرانس کے درمیان شروع ہوگئی۔ مقدس رومی سلطنت نے سپین کا ساتھ دیا..... چارلس پنجم بیک وقت سپین کا بادشاہ اور مقدس رومی شہنشاہ تھا۔ ایسا ہی انگلستان نے بھی کیا۔ وینس کی دولت مند ریاست نے فرانس کا ساتھ دیا۔ پوپ لیودہم (عہد 1521-1513) کو سلطنتِ روما میں تحریکِ اصلاح کلیسا کو روکنے کیلئے ایک اتحادی کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اُس نے پاپائی ریاستوں کو چارلس کی حمایت میں ساتھ ملالیا۔ یہ جنگ جنوری 1526 میں ختم ہوئی اور فرانسیسی بادشاہ فرانسسی اول نے اہم علاقہ چارلس۔ پنجم کے حوالے کردیا۔ لیکن نئے پوپ کلیمنٹ ہفتم (Clement VII) (عہد 1534-1523) نے اس نتیجے کو پسند نہ کیا، کیونکہ اُس نے محسوس کیا کہ ہسپانوی بہت زیادہ طاقتور ہوتے جارہے تھے۔ معاہدہ پر دستخط کرنے کے چند ہفتوں کے اندر، اطالوی جنگ میں ہونے والے نقصان کی بازیابی کرنے کیلئے، فرانس کے فرانسس اوّل کو اشیر باددے دی۔ پوپ نے لیگ آف کوگنیک (League of Cognac) قائم کرنے میں مدد دی۔ یہ فرانس، پاپائی ریاستوں، انگلستان اور جمہوریہ وینس اور جمہوریہ فلورنس پر مشتمل تھی۔ اس کا مقصد ہسپانویوں کو اٹلی سے نکالنا تھا۔ اس چیز نے لیگ آف کوگنیک کی جنگ (1530-1526) اور آخرکار ایک اور ہسپانوی مقدس سلطنتِ روما کی جیت کو تیزی سے قریب کردیا۔ اگرچہ مختلف اتحادوں اور جنگ کے اسباب کا تعین کرنے والے بہت سے عوامل تھے، لیکن یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ایک دہائی کے عرصے کے اندر اندر تقریباً



تمام بڑی بڑی مغربی طاقتیں .....فرانس، سپین، مقدس رومی سلطنت اور وینس ..... پاپائیت کے خلاف جنگ میں ملوث ہوگئیں۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ انگلستان وہ واحد قوم تھی جس نے دونوں جنگوں میں پوپ کا ساتھ دیا، ایک ایسا واقعہ جو ہنری ہشتم کے انگلستان کے کلیسا کو دیس نکالا دینے سے عین پہلے واقع ہوا۔

ان کشاکشوں کے جنوب مشرق میں، سلطنتِ عثمانیہ اپنی ہی چند انتہائی اہم کشاکشوں کو نمٹا رہی تھی۔ سلیم اول کے عہد سے پہلے (عہد 1520-1512)، عثمانیہ علاقے جزیرہ نمائے اناطولیہ (ترکی) کے مغربی نصف اور جنوب مشرقی یورپ تک محدود تھے۔ عثمانیوں کی طویل عرصے سے اُن علاقوں پر نگاہ تھی جن پر مصری مملوک سلطنت کا کنٹرول تھا، جن کی حکومت افریقی ساحل کے مشرقی نصف پر اور بہت سے یورپی علاقے (مشرقی بحرہ روم کے علاقے) بشمول شام اور مکہ اور مدینہ کے دونوں مقدس شہروں پر تھی۔ یہ علاقے دولتمند تھے۔ یہ زرخیز تیل کے ڈیلٹا کا احاطہ کرتے تھے اور بحرِ ہند کی طرف جانے والے راستے .....بحیرۂ احمر کی گزرگاہ کی تجارت کا احاطہ کرتے تھے بشمول اسلام کے انتہائی اہم مذہبی شہروں کے .....لیکن باوجود ایک برتر فوج رکھنے کے، عثمانی مملوکوں پر حملہ نہ کرسکے، جو کہ عثمانیوں کی طرح سُنی مسلمان تھے۔ مملوکوں پر حملہ سے پہلے سلیم اول نے مفتی اعظم (شیخ الاسلام، جو کہ ترکی مذہبی حاکمیت کا سربراہ تھا) علی الجمالی سے ایک حملے کی اجازت دینے کیلئے ایک فتویٰ طلب کیا۔ علی الجمالی نے سلیم کو حملے کی اجازت دے دی۔ جو کہ آخرکار کامیاب ثابت ہوا اور عثمانی حدود میں بہت سی زمین اور دولت لانے کا سبب بنا۔

اگرچہ یہ تاریخی واقعات، اس کتاب میں احاطہ کئے گئے دورانیے کے اختتام کے قریب واقع ہوتے۔ لیکن میں ان کا یہاں ذکر اس لئے کررہا ہوں کہ کیونکہ وہ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں مذہبی جائزیت بخشی کی اہمیت میں فرق کی عکاسی کرتے ہیں۔ مغربی یورپ میں بڑے بڑے سیاسی کردار پاپائیت کے خلاف جنگ میں کودنے سے نہیں ہچکچاتے تھے اسی دوران مشرقِ وسطیٰ کی اہم ترین طاقت نے اُن فوجی اقدامات کیلئے جواز طلب کیا جو مذہبی شیرباد کے بغیر بھی کامیاب ہوجاتا۔ یہ اختلافات، اُن اسباب کی بناپر، جن کا ذکر آخری باب میں کیا گیا ہے، بہت اہم ہیں۔ خاص طور پر قابلِ آزمائش پیش بینی 4 پر دوبارہ کریں:

www.MashalBooks.org

ایک ایسا معاشرہ ہی جس میں مذہبی حکام سیاسی جوازبخشی کا ایک ذریعہ ہوں آخر کار جمود کا شکار ہوجائے گا......(اور) ایک ایسا معاشرہ جس میں مذہبی حکام سیاسی جوازبخشی کا کم اہم ذریعہ ہوں، معاشی طور پر آگے بڑھ سکتا ہے، خواہ یہ کسی زمانے میں پیچھے ہی کیوں نہ رہا ہو۔

اس بات کا تعین کیسے ہوا کہ مشرق وسطیٰ اور مغربی یورپ میں اقتدار کو توسیع کون دے گا؟ توسیع بخش کارندوں کی شناخت دونوں معاشروں میں مختلف کیوں ہوئی؟ یہ باب ان سوالات کا جائزہ لیتا ہے اور مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کی تاریخ میں مذہبی جوازبخشوں کے تاریخی تعین کاروں کا کھوج لگاتا ہے۔ مذہبی جوازبخشی دونوں خطوں میں ایک سادہ سی وجہ سے اہم تھی: یہ نسبتاً کم خرچ تھی۔ لیکن یہ چیز صرف اس چیز کی وضاحت کرتی ہے کہ یوروپ اور مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں حکمران کیوں بارہا مذہبی جوازِبخشی کو استعمال کرتے تھے۔ لیکن یہ اس کی توضیح نہیں کرتی کہ مذہبی جوازبخشی کو حکمران دونوں علاقوں میں مختلف انداز سے استعمال کیوں کرتے تھے۔ زیادہ صحیح یہ کہ، یہ اس کی وضاحت نہیں کرتی کہ مذہبی جوازبخشی مشرقِ وسطیٰ میں یورپ کی نسبت تاریخی طور پر زیادہ اہم کیوں تھی؟ اس باب کا مقدمہ یہ ہے کہ دونوں خطوں کے تاریخی اختلافات، اُن منفرد حالات سے پیدا ہوئے جن میں اسلام اور عیسائیت نے جنم لیا، انہی حالات نے یہ تعین کیا کہ سیاسی اور مذہبی اداروں نے دونوں مذاہب کے جنم پر کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کیا، اور پھر یہ تعامل اصلی حالات کے غیر متعلق ہونے کے ایک عرصہ گزر گیا۔ طویل عرصہ بعد تک بھی برقرار رہا۔



# اسلام اور عیسائیت میں (حکمرانی کی) مذہبی جوازبخشی کا اصول

اسلام ساتویں صدی میں جزیرہ نمائے عرب کے مغربی نصف میں طاقتور بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے درمیان اُبھرا۔ وہ بدوقبائل جو اس علاقے پر حاوی تھے، ایک دوسرے کے ساتھ اور ہمسایہ سلطنتوں کے ساتھ تجارت میں مصروف ہوگئے۔ اُن کے تجارتی سلسلے کم از کم شام اور عراق کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئے۔ مکہ اس تجارت کے مرکز میں تھا۔ مکہ کے قبائلی وفاق نے ایک ایسا علاقائی تجارتی حال بنادیا جو پورے جزیرہ نما میں پھیل گیا۔ مکہ، کعبہ کی اس میں موجودگی کی وجہ سے عبادت کا بھی مرکز بن گیا، اور چھٹی صدی تک یہ ایک اہم تجارتی مقام بن گیا۔(1)

محمدﷺ مکہ کے قبائلی وفاق کے اندر پیدا ہوئے۔ تجارتی حال نے محمدﷺ کو جزیرہ نما کے مذاہب اور ثقافتوں سے روشناس کرادیا، بشمول عیسائیت اور یہودیت کے، اور ساتھ ہی ساتھ تجارت کی معاشی حقیقتوں اور مذہبی کی طاقت سے بھی روشناس کرایا۔ محمدﷺ کے ابتدائی پیغام نے، جسے آپ مدینہ ساتھ لے کر گئے، عقیدے اور اخلاقیات پر زور دیا۔ اس قوم نے جو آپ نے مدینہ میں قائم کی اللہ کو حاکمیت کے آخری ذریعے کے طور پر قبول کیا اور اس نُسخے سے زندگی کے تمام شعبوں کی بنیاد قائم کی۔ جب محمدﷺ کا اثر مدینہ سے بھی آگے پھیل گیا، تو آپ نے ایک نئے مذہب، ایک نئی حکومت، اور ایک نئے قانونی نظام کی نگرانی کی ...... جو سب کے سب گہرے طور پر ایک دوسرے سے مربوط تھے۔ اُن اولین اداروں کے اندر جو محمدﷺ کی زندگی میں تخلیق ہوئے، قوانین مدوّن کرنے، انصاف بانٹنے، ٹیکس اکٹھا کرنے اور سفارت کاری کو نبھانے کی صلاحیت تھی۔ ان اداروں نے، جزیرہ نمائے عرب کے قبل اسلام کے ڈھانچے سے فائدہ اُٹھایا، جس میں یہودی عیسائی، توحید تھی، لیکن اس میں اسلام کے منفرد عناصر بھی شامل کیے جو، اخلاقیات (جیسا کہ شراب کی ممانعت) اور قوانین (جیسا کہ وراثت) کا احاطہ کرتے تھے۔

www.MashalBooks.org

نئی اسلامی ریاست، محمد ﷺ کی وفات کے بعد بہت تیزی سے پھیلی، جو مغرب میں جزیرہ نمائے آئبریا اور مشرق میں برصغیر ہندوستان تک جا پہنچی۔ محمد ﷺ کے بعد تین سلطنتیں (اوّلین خلافت، سلطنت اُمیہ اور سلطنت عباسیہ) اُس وقت تک کی عالمی تاریخ میں اپنے قطعۂ زمین کے حوالے سے سب سے بڑی سلطنتوں میں سے ایک تھیں جو کہ سلطنت روما یا سکندرِ اعظم کی ریاست مقدونیہ سے کہیں بڑی تھیں۔ (دیکھئے جدول 3.1) اسلام کے معاشی فوائد اس نئے مذہب کے پھیلاؤ کی ایک اہم وجہ تھے۔ یہ ابتدائی طور پر پُرانے تجارتی راستوں کے ساتھ ساتھ پھیلا، اور ابتدائی نومسلموں کی بہت بڑی تعداد اُن لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے تجارت سے فائدہ اُٹھایا۔ بلاشبہ ایک قبل از اسلام کا تاجر معقول طور پر یہ شک کرسکتا تھا کہ غیر ملکی اُسے کاٹ کر الگ کردیں گے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اوّل اوّل تجارت کرنے سے دور بھاگے گا۔ ساتویں اور آٹھویں صدی کی عرب فتوحات نے اس مسئلے کو کم کرنے میں مدد دی۔ ایک نسبتاً مستقیم اسلامی قانونی ڈھانچے کے پھیلاؤ نے ایک ایسے متحد کنندہ نظریے کو آگے بڑھانے میں مدد دی، جس نے مختلف قبائلی مفادات کو اپنے اندر سمویا، جبکہ تاجروں کو مہنگی اور آسانی سے حاصل کی ہوئی اشیا کو لانے لے جانے کیلئے زیادہ تحفظ فراہم کیا۔ اس نظریے نے تجارت کو احترام دیا..... محمد ﷺ نے خود کاروبار میں حصہ لیا..... برخلاف ابتدائی اور درمیانی دور کی عیسائیت کے، جس نے بڑی حد تک تجارت سے نفرت کی۔ (3) لہٰذا اسلام نے، بہت مختلف قدرتی وسائل اور جغرافیائی وسائل رکھنے والے گروہوں کیلئے ایک اتحاد بخش طاقت کے طور پر کام کیا، اور اسلام کے دورِ اول کے، دولت کی تقسیم نو سے منسلک تصورات جزوی طور پر اس حقیقت کے عکاس تھے۔ (4)

ایسے ہم مذہب لوگوں کا ایک نظام تخلیق کرنے سے، جو مشترک زبان بولتے تھے، ایک مستقیم مالی نظام کو استعمال کرتے تھے اور یکساں اسلامی مالی آلات استعمال کرتے تھے، تجارت کے ساتھ متعلقہ دوسرے سودا کاری کے اخراجات کم ہوگئے۔ یہ صورتِ حال بیک وقت رُوما یورپ، اور قبل اسلام کے مشرقِ وسطیٰ دونوں کے ساتھ تقابل میں تھی جہاں تجارت میں بہت اہم رُکاوٹیں، سودا کاری کی انتہائی بلند لاگتیں اور مخالف گروہوں کے درمیان اعتماد کا فقدان تھیں۔ نئی نئی اسلام اختیار کرنے والی ریاستوں میں نئی فصلیں اور زرعی تکنیکیں بھی متعارف کروائی گئیں، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زرعی فاضل پیداوار اور تجارت نے پوری اسلامی دُنیا میں شہروں



کی تیز ترقی کو ممکن بنایا۔ (5)

**جدول 3.1: 750 سے لے کر عالمی تاریخ میں بننے والی عظیم ترین ریاستیں**

| سلطنت | سال پیدائش | سال وفات | سب سے زیادہ زمین کا حجم (ملین کلومیٹر) | مسلم |
|---|---|---|---|---|
| منگول سلطنت | 1206 (عیسائی دور) | 1502 (عیسائی دور) | 33.2 | نہیں |
| روسی سلطنت (سکووی) | 1462 (عیسائی دور) | 1795 (عیسائی دور) | 16.5 | نہیں |
| سلطنت اُمہ | 661 (عیسائی دور) | 750 (عیسائی دور) | 13.2 | ہاں |
| سلطنت چنگ (چین) | 1644 (عیسائی دور) | 1911 (عیسائی دور) | 12 | ہاں |
| خاندانِ چن (چین) | 247 (قبل مسیح) | 209 (قبل مسیح) | 12 | نہیں |
| سلطنت عباسیہ | 750 (عیسائی دور) | 861 (عیسائی دور) | 11 | ہاں |
| پہلے چار خلفا (خلفائے راشدین) | 632 (عیسائی دور) | 661 (عیسائی دور) | | |
| (ذریعہ: لائی گن | 9 | | | |
| (2010) | ہاں | | | |

محمد ﷺ کی طرف سے وجود میں لائی گئی نئی ریاست اسلام کے ساتھ ساتھ ہم عصر طور پر ارتقا پذیر ہوتی رہی۔ اس کا مطلب ہے کہ جب کبھی حکمرانی کے نئے سوالات پیدا ہوئے، تو حکمران ان کا جواب اسلامی تناظر میں دیتے۔ محمد ﷺ نے خود یہ دعویٰ کیا کہ ''اسلام اور حکومت دونوں جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ترقی نہیں کرسکتا۔ اسلام بنیاد ہے اور حکومت اس کی سرپرست ہے۔ وہ چیز جس کی کوئی بنیاد نہ ہو ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور ایسی چیز کا کوئی سرپرست نہ ہو تباہ ہوجاتی ہے۔ (6) برنارڈ لیوس (Barnard Lewis)

www.MashalBooks.org

(1794 صفحہ 18) یہ استدلال کرتا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی اداروں کے بیک وقت ارتقا پانے کی وجہ سے، اسلامی فکر میں کلیسا اور ریاست کی علیحدگی کا تصور نایاب ہے۔ ''ایسے جوڑوں کا، جیسا کہ روحانی اور دنیوی عام اور کلیسائی، اور مذہبی اور سیکولر کے مسلم اقوام کی کلاسیکی زبانوں میں کوئی مترادفات نہیں ہیں۔''

اہم بات یہ ہے کہ، چونکہ پہلی اسلامی ریاست کا ارتقا اسلامی اصول کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں ہوا، لہٰذا ابتدائی دور کے مفکرین نے قرآن کریم میں دیئے گئے اسلامی ریاست کے تصورات کو منضبط کیا۔ قرآن کم از کم ایسے تین طریقوں کا بیان کرتا ہے، جس کے ذریعے حکمران جائزیت اقتدار حاصل کر سکتے ہیں: خدا (تعالیٰ) کی طرف سے تقرر، کسی جائز حکمران سے وراثت میں اقتدار حاصل کرنا، اور عوام سے ''وفاداری کی بیعت'' لینا۔ درج ذیل تین قرآنی آیات جائزیت اقتدار کے ان ذرائع کی تفصیل بیان کرتی ہیں:

2:247 ''اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا 'بلاشبہ اللہ نے طالوت کو تمہاری طرف بطور بادشاہ بھیجا ہے، اُنہوں نے کہا 'اُسے ہمارے اوپر بادشاہت کیسے حاصل ہوسکتی ہے جبکہ ہم بادشاہت کیلئے اُس سے زیادہ اہل ہیں، اور اُسے دولت میں کوئی وسعت نہیں دی گئی؟ اس نے کہا 'بلاشبہ اللہ نے اُسے تمہارے اوپر منتخب کیا ہے، اُسے علم اور جسم میں کثرت عطا کی ہے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا اقتدار عطا کرتا ہے۔ اور اللہ [مہربانی] اور علم میں وسعت والا ہے۔''

27.16 ''اور سلیمانؑ اور داؤدؑ کا وارث بنا۔ اس نے کہا، 'اے لوگو! ہمیں پرندوں کی زبان سکھائی گئی ہے، اور ہمیں ہر چیز میں سے [حصہ] ملا ہے۔ بلاشبہ یہ واضح فضل ہے''۔

48:10 ''بلاشبہ جو لوگ تیرے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں [اے محمد ﷺ]۔ وہ حقیقتاً خدا کے [ہاتھ پر] بیعت کر رہے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے لہٰذا جو اُس کے حکموں کو توڑتا ہے، وہ صرف اسے توڑ کر اپنے نفس کو نقصان پہنچاتا ہے اور وہ جو اُس وعدے کو پورا کرتا ہے جو اُس نے اللہ سے کیا ہے۔ وہ [اللہ] اسے بہت بڑا صلہ دے گا۔''

اس بات سے قطع نظر کہ ایک حکمران جائزیت اقتدار کس طرح حاصل کرتا ہے، قرآن اور بعد کا اسلامی فلسفہ ایک نکتے پر بالکل واضح ہیں: اچھے مسلمانوں کو ایک ایسے حکمران کے فرامین کی پیروی کرنی چاہیے جو اسلامی فرامین کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اور مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ



ایسے حکمران کے خلاف بغاوت کریں جو اسلام کے خلاف عمل کرتا ہے لہٰذا اسلامی اصول مسلمانوں کو یہ بتاتا ہے کہ ایک حکمران ٹھیک جائز طور پر کس طرح کے قوانین بنا سکتا ہے، جیسا کہ درج ذیل قرآنی آیات میں نشاندہی کی گئی ہے

4:59 ''اے لوگو جو ایمان لے آئے ہو، اللہ کی اطاعت کرو پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور اُن لوگوں کی اطاعت کرو'' جو تم میں اہلِ اقتدار ہیں اور اگر تمہیں کسی چیز پر اختلاف ہو، تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بہترین [طریقہ] ہے اور اس کا نتیجہ بہترین ہے۔''

2:190-19 ''اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کریں لیکن زیادتی نہ کرو۔ بلاشبہ وہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور انہیں جہاں کہیں بھی تم پاؤ قتل کرو، اور اُنہیں اُس جگہ سے نکالو جہاں سے اُنہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ [قتل عام] قتل کرنے سے بدتر ہے۔''

اوپر حوالہ دی گئی پہلی آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ مسلمانوں کو دنیوی حکام کی پیروی کرنی چاہیے، لیکن صرف اُس وقت اگر اُن کے بیانات اللہ اور محمد ﷺ (پیغمبر) کے بیانات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ دوسری آیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ اُس ایک شخص کو قتل کرنا بہتر ہے جو فتنہ بپا کرتا ہے..... جو اللہ کے احکام کی خلافت ورزی کرتا ہے..... بہ نسبت اس بات کے کہ فتنہ میں زندگی بسر جاتے..... بخاری کی احادیث اس معاملے میں، کہ مسلمانوں کو کن حکمرانوں کی پیروی کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے، زیادہ واضح بیانات دیتی ہیں۔ حدیثیں (حضرت) محمد ﷺ کی وہ تعلیمات ہیں جن کو علما نے نسلاً بعد نسل زبانی طور پر منتقل کیا یہ اسلام میں سند کے اہم ترین ذرائع ہیں۔ البخاری کی احادیث (حضرت) محمد ﷺ کے دو صدیاں بعد جمع کی گئیں اور اُنہیں حدیث کے تمام مجموعہ جات میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے۔ ذیل کے دو احادیث بہت اہم ہیں: (8)

پیغمبرؐ نے فرمایا، ''آدمی کیلئے (حکمران کے احکام) کو سُننا اور اُن کی اطاعت کرنا فرض ہے، جب تک ان احکام میں (خُدا تعالیٰ) کے احکامات کی ایک بھی نافرمانی شامل نہ ہو لیکن اگر (خُدا کی) نافرمانی کا ایک بھی عمل نافذ کیا جائے تو اُسے نہ اسے سُننا چاہتے نہ ہی اس کی اطاعت

www.MashalBooks.org

کرنی چاہیے"

(جلد چہارم، کتاب 52، حدیث نمبر 203)

پیغمبرؐ نے فرمایا "ایک مسلمان کو (اپنے حاکم کے احکام) کو سُننا پڑے گا اور اُن کی اطاعت کرنی پڑے گی، خواہ وہ اسے پسند کرے یا نہ، اُس وقت تک جب تک کہ اُن احکام میں (اللہ کی) نافرمانی کی ایک بھی چیز شامل نہ ہو، لیکن اگر (اللہ کی) نافرمانی کی ایک چیز بھی عائد کی جائے تو آدمی کو نہ اُسے سننا چاہتے اور نہ ہی اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ (جلد 9، کتاب 89 حدیث نمبر 2)

اپنے آغاز سے ہی اسلامی تعلیمات نے حکمرانوں کے اقتدار کو جواز بخشنے کا ایک میکانیہ مہیا کیا: اس نے مسلمانوں کو اُن قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کرنے کا حکم دیا جو حکمران اسلامی احکام کی مطابقت میں بنائیں اور اُن کی پیروی نہ کرنے کا جو ان احکامات کی مطابقت میں نہ ہوں۔

وہ حالات جن کے تحت عیسائیت نے جنم لیا، ساتویں صدی کے مشرق وسطیٰ کے حالات سے بہت مختلف تھے۔ اسلام کے برعکس جو اُبھرتی ہوئی سلطنت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا، عیسائیت سلطنتِ رُوما میں پیدا ہوئی، جہاں خوب فعال قانونی اور سیاسی ضابطے پہلے سے ہی موجود تھے۔ لہٰذا عیسائیت کے پاس اُس شکل میں پھیلنے کا کوئی موقع نہ تھا جس شکل میں اسلام اپنی پہلی صدی میں پھیلا رومی اقتدار کی توسیع کا پرچار کرنے کیلئے پہلے ہی سے فوج سینٹ اور رومی نظریہ موجود تھے۔

ان اسباب کی بنا پر، عیسائیت نے اپنی پہلی تین صدیوں میں سیاسی اقتدار کو مسندِ جواز عطا نہ کی۔ ابتدائی دور کے کلیسائی زُعما سیاسی اقتدار کو سندِ جواز عطا کرنے میں دلچسپی نہ رکھتے تھے، کیونکہ سیدھی سی بات ہے کہ کلیسا سندِ جواز عطا کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ کسی بھی کارندے کو، سندِ جواز عطا کرنے کی اہلیت حاصل کرنے کیلئے، اس کے اندر یہ اہلیت ہونی چاہیے، کہ وہ حکمران کے حقِ حکمرانی کے بارے میں رعایا کے اعتقادات کو تقویت دے سکے۔ مذہبی حکام یہ چیز اُس وقت کر سکتے ہیں، جب وہ اخلاقی سند رکھتے ہوں، لیکن یہ چیز صرف اُسی وقت مفید ہوتی ہے جب مذہب وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہو۔ اس کے ادارے معاشرے میں کافی گہری جڑیں رکھتے ہوں، یا اگر سیاسی اور معاشی اشرافیہ اُن اداروں کے ساتھ وابستگی رکھتے ہوں۔ ابتدائی عیسائی کلیسا نہ تو وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ نا ہی اس نے اشرافیہ کے اندر اپنا نفوذ پیدا



کیا تھا۔ چوتھی صدی سے پہلے، عیسائیت بنیادی طور پر اُن افراد پر مشتمل تھی جو سزا کا اور معاشرتی بائیکاٹ کا بڑا خطرہ مول لے سکتے تھے، اور نتیجہ یہ "درمیانہ طبقات" کا ایک مذہب تھا۔ اگرچہ کچھ اشرافیہ اس نوخیز مذہب کی طرف کشش محسوس کرتے تھے، بہت سے کلیساؤں کی ملکیت میں بہت تھوڑی یا صفر زمین تھی، اور پادری زیادہ تر پست تر سماجی طبقات سے تعلق رکھتے تھے۔ (9)

پہلی تین عیسائی صدیوں میں، کلیسا زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا تھا، اور ایک ایسی سلطنت کے اندر پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا، جو بعض اوقات اس کی مخالف ہوتی تھی۔ جیسا کہ بڑی ریاستیں عام طور پر غیر مراعات شہریوں کے گروپوں کے خلاف ہوتی ہیں جو باقاعدگی سے خفیہ طور پر ملتے ہوں۔ بلاشبہ رومی لوگ ابتدائی دور کے عیسائیوں کو کبھی کبھار آدم خوری کا الزام بھی دیتے تھے۔ کیونکہ یہ بات پھیل گئی کہ وہ مقدس عشائے ربانی کے دوران "عیسیٰ علیہ السلام کے جسم" کو کھاتے ہیں۔ کلیسا ریاست کا سامنا نہ کر سکا اور زندہ رہنے کی اُمید کھو بیٹا، لہٰذا کلیسا کے ابتدائی زُعمانے، سیاسی اور مذہبی اداروں کے درمیان علیحدگی کی وکالت کرنا شروع کر دی۔ (10)

اس موقف کی مشہور ترین حمایت خود یسوع مسیح کی طرف سے آئی: "جو چیزیں قیصر کی ہیں وہ قیصر کے حوالے کر دو اور جو چیزیں خدا کی ہیں وہ خُدا کے حوالے کر دو (میتھیو 22:21) اوائل عیسائیت کے لکھاری طرطولیان نے (لگ بھگ 200)، جو عیسائیت کی پہلی تین صدیوں کے انتہائی اہم مفکرین میں سے ایک تھا، نے اس موقف کو اور بھی واضح کر دیا:

"ہم شہنشاہوں کیلئے ہمیشہ سے رعایات دیتے آئے ہیں ہم اُن کیلئے طویل زندگی ایک محفوظ حکمرانی، ایک محفوظ گھر، بہادر فوجوں، ایک وفادار سینٹ، ایک دیانتدار رعایا، ایک پُرسکون دُنیا، اور ہر اُس چیز کی دُعا کرتے ہیں جن کی دُعا کوئی شخص اور کوئی قیصر کر سکتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ وہ عظیم طاقت جو پوری دُنیا کیلئے خطرہ ہے اور خود زمانے کا اختتام اور اس کے ساتھ خوفناک مصیبتوں کا ایک خطرہ، اس سکون کے وقفے سے ہم سے دور کر دیا جاتا ہے جو سلطنت روما ہمارے لئے چاہتی ہے۔ جب ہم اس کے التوا کی دُعا مانگتے ہیں، تو ہم روم کے تسلسل میں مدد کرتے ہیں...... مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ قیصر تم سے زیادہ ہمارا ہے اور اُسے ہمارے خدا نے متعین کیا ہے۔ (11)

عیسائیت کے مقام کے بارے میں یہ خیال یعنی دُنیاوی حکومت کا خیال اُس کے کافی عرصے بعد تک بھی قائم رہا جب عیسائیت سلطنتِ روما کا مذہب بن گیا۔ آگسٹائن نے اس

www.MashalBooks.org

خیال کی وکالت پانچویں صدی کی اپنی بااثر کتاب ''خُدا کا شہر'' (The City of God) میں کی، جس میں یہ خیال پیش کیا گیا کہ شہری حکومت ایک خود مختار ادارہ ہے اور عیسائیوں کو اس کے قوانین کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اسی طرح پوپ گیلاسی (Pope Gelasius I) (عہد 496-492) نے شہنشاہ کے نام ایک خط میں یہ دعویٰ کیا کہ ''دونوں بالکل ایک ہیں، باوقار شہنشاہ، جس کی بنیادی طور پر اس دُنیا پر حکمرانی ہے، مذہبی پیشوائیت کا مقدّس اختیار اور شاہی قوت۔'' (12)

عیسائیوں کا مقدر اُس وقت پلٹا، جب رومی شہنشاہ قسطنطین نے 312 میں ملان (Milan) کا فرمان جاری کیا، جس نے تمام عیسائیوں کیلئے برداشت اور آزادی کی ہدایت کی، تمام ضبط شدہ جائیداد کلیسا کو واپس کی اور کلیسا کو ایک منظّم ادارے کے طور پر تسلیم کیا۔ (13) عیسائیوں کو دی گئی آزادیوں کا کلیسا کی قسمت پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور قسطنطین کا عہد، عیسائی تاریخ میں بہت اہم ہے۔ 321 میں قسطنطین نے کلیسا کو جائیداد کے جائز مالک کے طور پر تسلیم کرلیا۔ قانونی طور پر ایک ادارہ تسلیم کئے جانے کے بعد اسقفی عملداری کو رومی سلطنت کی طرف سے جائیداد رکھنے کی اجازت دے دی گئی، اور اس نے افراد کو بھی یہ اجازت دے دی کہ وہ کلیسا کو جائیداد وہ وصیت کر کے دے سکیں، اس کے جلد بعد دولتمند لوگوں اور بیواؤں کا یہ شیوہ بن گیا کہ وہ اپنی جائیداد کا ایک تہائی کلیسا کو دے دیتے تھے، اور زمینی جائیداد جلد ہی کلیسا کے بنیادی ذرائع آمدنی میں سے ایک بن گئی۔ ان احکامات کا عیسائی بننے کی قیمت کم کرنے کا ایک اہم اثر بھی تھا۔ عیسائی ہونا اب کسی سماجی یا معاشی نقصان کا باعث نہیں تھا اب عیسائی عقیدے کے حاملین کے ملکیتی حقوق محفوظ تھے اور اب ستم تدنی کوئی خطرہ موجود نہیں تھا۔ نتیجۃً، عیسائی آبادی، قسطنطین کے عہد میں ڈرامائی طور پر بڑھی، خاص طور پر متوسط اور اعلیٰ طبقے میں۔ اُس کے عہد کے آغاز میں یہ رومی آبادی کے دس فیصد سے بڑھ کر 350 عیسوی تک 56.5 تک ہوگئی۔ (14)

بہرحال، اگرچہ قسطنطین اور بعد کے عیسائی حکمرانوں نے کلیسا کو جوازِ اقتدار کے کارندے کے طور پر استعمال کیا، لیکن تین صدیوں تک سیکولر حکومت کو مذہب سے خُدا کرنے والے فلسفے نے، کلیسا کی جوازِ اقتدار کی اہلیت کو کم کر دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیسائیت سیاسی اقتدار کو جواز نہیں بخش سکتی تھی ...... اس نے واضح طور پر قرونِ وسطیٰ میں یہ کام کیا...... لیکن یہ عیسائی اصول سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے میں اس قدر فائدہ مند نہیں تھا، جس قدر کہ اسلامی اصول تھا۔ دوسرے



لفظوں میں عیسائی اور مسلمان حکمرانوں کیلئے کھیل کے اصول مختلف تھے۔ یہاں تک کہ جب عیسائیت یورپ کا غالب مذہب بن گئی، تب ہی مذہبی جواز بخشی کا فائدہ یورپی حکمرانوں کو اس سے کم تر تھا جتنا مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کو تھا۔ یہ اصولی اختلافات بائبل اور قرآن میں اور ساتھ ہی ساتھ ابتدائی دور کے مسلمان اور عیسائی علما کی تحریروں میں بہت واضح ہیں۔ اگرچہ بائبل کے کچھ پروں میں یہ اشارے ہیں کہ حکمرانی کیلئے ایک مذہبی بنیاد ہے (پال (Paul) نے رومز 13.1 میں یہ استدلال کیا ''کوئی اقتدار نہیں سوائے اس کے جو خدا کی طرف سے ہو، اور وہ جو ہیں وہ خدا کے حکم سے ہیں۔'') لیکن عیسائی مذہب اور سیکولرازم کی جدائی واضح ہے۔ دوسری طرف اسلام میں مذہبی اور سیکولر حدود کے جُدا ہونے کا کوئی تصور بھی نہیں ہے۔ عیسائی مذہبی اصول میں کوئی بھی چیز اُن قرآنی اور احادیث کے اقتباسات کی مانند نہیں ہے، جو واضح طور پر مسلمانوں کو ایسے حکمرانوں کی پیروی کرنے پر حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو اسلامی احکام کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور اُن کے خلاف بغاوت کرنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، جو اسلامی احکام کی پیروی نہیں کرتے۔ مؤرخ بریان ٹائیر نے (Brian Tierney) ان اختلافات کا خلاصہ بڑے واضح الفاظ میں پیش کیا ہے (1998، صفحہ 7)۔

اکثر اوقات جب کوئی معاشرہ قدیم قبائیلیت سے ایک منظّم تہذیب میں داخل ہوتا ہے، تو ایک مشترک مذہب اس کی تمام سرگرمیوں میں نفوذ کر جاتا ہے، اور اس کے تمام مخصوص اداروں کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔ قدیم اسلام کا عروج ایک مخصوص مثال مہیا کرتا ہے۔ ایسے حالات میں ایسے سیاسی اداروں کی تخلیق جو مسلمہ مذہب کی تنظیم سے بالکل علیحدہ ہو، بمشکل ہی قابل تصور نظر آتی ہے۔ دوسری طرف، عیسائیت ایک ایسی قدیم تہذیب میں زبردستی گھس آئی، جس کی پہلے سے ہی ایک سرکاری تنظیم تھی، اور اس کی اپنی مہذب سیاسی فکر تھی جو غیر عیسائی تصورات پر مبنی تھی۔ لہٰذا ابتدائی صدیوں میں عیسائی کلیسا کو بااختیار دفاتر کا ایک ڈھانچہ تیار کرنا پڑا، جو بعض اوقات دُنیاوی افسر شاہی نظام کے متوازی لیکن ہمیشہ اس سے علیحدہ تھا، اور شروع سے ہی وفاداریوں کے تصادم کا ایک امکان موجود تھا۔

# ڈھانچے کو استعمال کرنا:

## مذہبی جوازِ اقتدار وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

اسلام اور عیسائیت کی ابتدائی تاریخوں نے مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے توسیع اقتدار کے اداروں کی تشکیل میں مدد کی۔ منفرد تاریخی حالات کے پیشِ نظر مذہبی جوازِ اقتدار کے ادارہ جاتی مفادات مشرقِ وسطیٰ میں بہت زیادہ تھے، کیونکہ اسلامی مذہبی حکام کے پاس سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے کی اہلیت زیادہ تھی۔ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں مذہبی جوازِ اقتدار کے اخراجات یکساں تھے.....ان اخراجات میں شامل تھے ٹیکس سے چھوٹ، مذہبی احکام کی اطاعت، اور مالی امداد.....لہٰذا نتیجۃً مذہبی جواز اقتدار کے اخراجات اور فوائد کا تناسب مشرقِ وسطیٰ میں زیادہ تھا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں نے مذہبی حکام کو اپنے اقتدار کی توسیع کیلئے، مغربی یورپ کے حکمرانوں کی نسبت زیادہ استعمال کیا۔

سابقہ باب میں دیا گیا ڈھانچہ، مذہبی جواز اقتدار کے اس سادہ جامد تصور کی نسبت، ایک زیادہ گہرا ادراک مہیا کرتا ہے، جو مشرقِ وسطیٰ میں وقت کے کسی بھی لمحے میں زیادہ اہم تھا۔ کیونکہ وہ طریقہ جس میں حکمران جوازِ اقتدار حاصل کرتے ہیں۔ ایسے اداروں میں معلومات فراہم کرسکتا ہے، جو جواز بخشی کے انتظامات کی حمایت کرتے ہیں، ان اختلافات کے بھی متحرک طویل المدتی نتائج تھے۔ مثال کے طور پر قابلِ آزمائش پیش بینی 3 کو دوبارہ ذہن میں لائیے کیونکہ، جب مذہبی حکام حکمرانوں کے اقتدار کو جواز بخش رہے ہوں، تو حکمرانوں کیلئے مذہبی احکام کے خلاف قوانین کو نافذ کرنے کیلئے کوئی جذبہ محرکہ نہیں ہوتا، لہٰذا شہریوں کیلئے بھی مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی کوئی ترغیب نہیں ہوتی: وہ مذہبی اور دنیاوی پابندیوں کی ''دُگنی'' قیمت ادا کرتے ہیں: یہ چیز جوابی طور پر سیاسی حکام کو مستقبل میں، مذہبی اصول کے خلاف قوانین اور پالیسیاں متعارف



کروانے کیلئے اور بھی کم ترغیب کا باعث ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے ادارہ جاتی انتظام کو، جس میں سیاسی حکمرانی کو مذہب کی طرف سے بہت بھاری طور پر جواز بخشا گیا ہو، حقیقتاً کبھی چیلنج نہیں کیا جاتا، اور مذہبی حکام، اپنی طاقت کیلئے کسی خطرے سے نسبتاً زیادہ محفوظ ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ادارے اپنے آپ کو مضبوط کرنے والے ہوتے ہیں ..... وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ تر کھلاڑی ضابطوں کی پابندی کرنے لگتے ہیں اور اس طرح مستقبل کی نسلوں کیلئے ایسا کرنے کے جذبۂ محرکہ کو تقویت دیتے ہیں۔

جب مذہبی حکام جواز اقتدار بخشنے میں کمزور ہوں، تو اقتدار کی جواز بخشی کے دستور کی گُتھی کے سلجھ جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ حکمران مذہبی حکام کے مفادات کے خلاف قوانین اور پالیسیاں بنانے سے بہت کم نقصان اُٹھاتے ہیں۔ یہ چیز مذہبی حکام کو مایوس کُن صورتِ حال میں ڈال دیتی ہے۔ وہ یا تو اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ شہری وسیع پیمانے پر اُن کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یا وہ اپنے اصولوں کو وقت کے مطابق بناتے ہیں، جو چیز ''ابدی سچائیوں پر'' پر اُن کی گرفت کو کمزور کر دیتی ہے۔ دونوں صورتوں میں مذہبی حکام کی اقتدار کی جواز بخشی کی اہلیت مستقبل میں کمزور ہو جائے گی۔ یہ عمل جتنی زیادہ مرتبہ واقع ہوتا ہے، اتنا ہی مذہبی جواز بخشی اقتدار کم اہم ہو جاتی ہے۔ آخر کار، اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے فوائد اس کے نسبتاً کم اخراجات سے بھی زیادہ نہیں ہوتے، اور حکمران توسیعِ اقتدار کے دوسرے ذرائع کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔

شکل 3.1 اس منطق کا ایک خاص طرز کا متن پیش کرتی ہے۔ شکل کے اوپر والے نصف حصے میں اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے نفع / نقصان کا تناسب ایک بلند سطح پر شروع ہوتا ہے اور خاصے وقت تک بلند رہتا ہے۔ کیونکہ اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے ادارہ جاتی فوائد اور نقصانات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل نہیں ہوتے، لہٰذا، حکمران مذہبی جواز بخشی کے ذریعے زبردست طور پر توسیع دینے کی کوششیں جاری رکھتے ہیں (چلا ہوا تیر بائیں ہاتھ سے معلومات کے نتائج دوسرے ڈبے میں بھیج رہا ہے) شکل کے نیچے والے نصف حصے میں حالات کا ایک مختلف سلسلہ واقع ہوتا ہے۔ جس میں مذہبی جواز بخشی کا نفع / نقصان کا تناسب وقت کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ نفع / نقصان کے تناسب میں تبدیلی کے نتائج کی

www.KitaboSunnat.com

معلومات حکمران کی توسیع حکمرانی تک اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے راستے اور کبھی پہنچتی ہیں، جو چیز نفع / نقصان کے تناسب کو اور بھی کم کر دیتی ہے۔ آخر کار اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے فوائد اس کے نقصانات کی نسبت اتنے کم ہو جائیں گے کہ حکمران توسیع اقتدار کے متبادل ذرائع کی تلاش شروع کر دیں گے۔

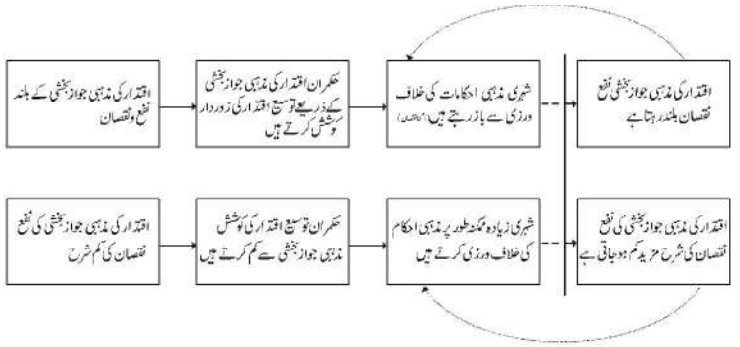


**شکل 3.1:** وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے بدلتے ہوئے فوائد و نقصانات

یہ ادراکات مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کی ادارہ جاتی تاریخوں پر روشنی ڈالتی ہیں .....

اسلام کے اولین اصولوں میں سیاسی اقتدار کی جواز بخشی کی نسبتاً زیادہ اہمیت نے ایک ایسا ماحول تخلیق کیا، جس میں اقتدار کی مذہبی جواز بخشی حکمرانوں کیلئے بہت قابلِ قدر تھی۔ اس نے مذہبی قوانین کو درپیش چیلنجوں کی حوصلہ شکنی کی، جس کے جواب میں اقتدار کی مذہبی توسیع مستقبل میں اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ دوسری طرف ابتدائی دور میں عیسائی اصولوں میں اقتدار کی جواز بخشی کی نسبتاً کمی نے مغربی یورپ کو ایک مختلف راستے پر ڈال دیا۔



## محمد ﷺ کے بعد اقتدار کی اسلامی جواز بخشی

محمدؐ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کو پھیلانے کے قابل اس وجہ سے ہوئے کیونکہ اُنہیں وہ چیز حاصل تھی جسے ویبر (Weber) ''کرشماتی جواز اقتدار'' کہتا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ کے اندر غیر معمولی شخصی صفات تھیں، جو لوگوں کو آپ کی پیروی کرنے پر اُکساتی تھیں۔ آپ کے جانشین، اپنے اقتدار کو جواز بخشنے کیلئے اپنی شخصیت پر انحصار نہیں کر سکتے تھے۔ یہ چیز خاصی پریشان کُن تھی کیونکہ محمد ﷺ اپنے پیچھے کوئی مرد وارث نہیں چھوڑ گئے تھے، جو آپ کی پیروی کرتا اور قرآن رسمی طور پر جانشینی کے معاملات سے نہیں نمٹتا۔ جانشینی کا عرصہ ہی ٹھیک وہ وقت ہوتا ہے، جب جوازِ اقتدار انتہائی اہم ہوتا ہے کیونکہ جوازِ اقتدار ہی وہ چیز ہے جو حکمرانی کی خواہش رکھنے والے اُس کے مخالف دعویداروں کے علی الرغم، اُس کے حق حکمرانی کو آگے بڑھاتا ہے۔

بعد کی آنے والی مسلمان نسلوں نے اس مسئلے کو ایسے حل کیا کہ اُنہوں نے مذہبی زُعما کو جوازِ اقتدار بخشنے والے کارندوں کے طور پر استعمال کیا۔ ان مذہبی زُعما کو اسلام کا خصوصی علم حاصل ہوتا تھا اور وہ حکمران کے اثر سے آزاد ہوتے تھے، لہٰذا اُن کی بات حکمران کے حق حکمرانی کے تصور کو آگے بڑھا سکتی تھی۔ لیکن پہلی چند اسلامی دہائیوں میں ایسے کارندوں کا وجود نہیں تھا (15) اسلامی اصولوں پر مبنی رسمی قانونی نظام قائم کرنے کیلئے کافی وقت لگا، اور مذہبی علما کو رسمی تربیت دینے کیلئے ادارے قائم کرنے میں بھی وقت لگا۔ کیونکہ ابتدا میں مسلمان حکمرانوں کو جوازِ اقتدار دینے کیلئے کوئی خود مختار مذہبی یا قانونی طبقات نہیں تھے۔ لہٰذا جائز حکمران کے تعین کے مسئلے پر تنازعات اور خانہ جنگیاں عام ہوگئیں۔ بلاشبہ، مذہب کی تاریخ میں ایک اہم ترین فرقہ بندی، شیعہ سُنی افتراق اسی نزاع سے پیدا ہوا کہ محمد ﷺ کے بعد مسلمانوں کا صحیح حکمران کون ہو۔ سنیوں کا دعویٰ تھا کہ اُن کے ماننے کے مطابق سب سے زیادہ اہل محمد ﷺ کے سُسر ابوبکرؓ تھے، جبکہ شیعہ حضرات کے ماننے کے مطابق سب سے زیادہ روحانی طور پر اہل محمد ﷺ کے داماد علیؓ تھے۔ جوازِ اقتدار کے

ایسے مسائل کے نتیجے میں، پہلے چار خلفا میں سے تین کو قتل کر دیا گیا۔

ان حالات کی بنا پر، پہلی مسلمان برادری کے جائز ترین حکمران محمد ﷺ کے صحابہؓ تھے۔ وہ جو پیغمبرؐ کے ساتھ باہمی تعامل کرتے رہے تھے۔ صحابہؓ کے پاس بہت سے اہم سرکاری مناصب تھے، اور محمد ﷺ کے بعد پہلے چار خلفا صحابہ تھے۔ ان حکمرانوں نے، جنہیں ''خلفائے راشدین'' کہا جاتا تھا (661-632 عیسوی) محمدؐ کے ساتھ اپنے تعلقات کو اپنی حکمرانی کو جائز قرار دینے کیلئے استعمال کیا۔ اور دُنیاوی اور مذہبی دونوں کردار نبھائے۔ (۱۶) اُن کے سُنی جانشینوں نے، خلافتِ اُمیہ (750-661) نے، اسی طرح اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کیلئے مذہبی طور پر تفویض کردہ خُدا کا نائب (خلیفۃ اللہ) کا لقب اختیار کیا۔ (17)

مذہبی اور سیاسی قیادت نے ایک ہی منصب میں جمع ہو کر ابتدائی اسلامی خلفا کو زبردست طاقت عطا کر دی کیونکہ وہ مذہبی حاکمیت کا دعویٰ بھی کر سکتے تھے اور اپنی مرضی سے عدالتی احکامات دے سکتے تھے۔ اپنی مرضی رکھنا اہم بات تھی، کیونکہ اسلامی قانون کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جو حکم دینے کیلئے مفید نہیں ہیں، جیسا کہ ٹیکس عائد کرنے کے قوانین، تقریری قوانین اور قیمتوں کے تعین کے بارے میں قوانین۔ (18) لیکن اس انتظام نے بھی خلفا کے لئے جوازِ اقتدار کے مسائل پیش کر دیئے۔ اقتدار کی جواز بخشی کے کارندے حکومت کو اُسی وقت توسیع دے سکتے ہیں، جب وہ، حکمران کے حقِ حکمرانی میں لوگوں کے اعتقاد کو مضبوط کر سکیں۔ اگر ایک حکمران خود ہی مذہبی حاکم ہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا..... ایسی صورت میں اُس کے پاس کوئی اضافی ذرائع نہیں ہوتے جن سے وہ اپنی رعایا کے اعتقاد کو پُختہ کر سکیں۔

ابتدائی خلفا کو بھی، اپنی تیزی سے پھیلتے ہوئے صوبوں میں، جوازِ اقتدار کے مسئلے کا سامنا تھا۔ اُمیہ سلطنت کے قیام تک مسلم سلطنت تاریخ میں سب سے بڑی سلطنت تھی، لیکن رعایا کے ایک بڑے حصے کو ابھی اسلام قبول کرنا تھا۔ نظم وضبط قائم کرنے اور ریاست کے ساتھ وفاداری کو قائم کرنے کیلئے خلفا نے صدیوں میں ''ابتدائی قاضی'' بھیجے (قاضی کی اصطلاح تقریباً ''منصف'' کے مترادف ہے) اُن کی کوئی قانونی تربیت نہیں تھی، لیکن حکمرانوں نے اُنہیں پھر بھی ایسے انتظامی فرائض سونپ دیے جیسا کہ ٹیکس وصولی نظم ونسق کا قیام اور تنازعات کے فیصلے۔ (19) ابتدائی قاضیوں نے تنازعات کا فیصلہ قرآنی تعلیمات سُنت (محمد ﷺ کے مثالی



اقدامات) (20) کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی، لیکن اُن کے پاس بہت معمولی خصوصی مذہبی علم تھا اور خلیفہ کی نسبت کم تر مذہبی اختیار تھا۔ لہٰذا وہ صوبوں میں کچھ نہ کچھ استحکام تو لانے میں کامیاب ہو گئے لیکن وہ مذہبی جواز بخشی کے ایک ذریعے کے طور پر کام نہ کر سکے۔

آٹھویں صدی کے آغاز تک، مذہبی حاکمیت نے اپنی بنیاد خلیفہ کی حدود سے باہر تک مضبوط کر لی۔ کیونکہ محمد ﷺ کے صحابہ کے بعد کی نسلیں اُن ریاستوں میں پیدا ہوئیں، جو اسلامی نظریے کے ساتھ مخلص تھیں، لہٰذا مذہبی تعلیم بہت زیادہ تخصیصی عمل ہو گیا۔ اس چیز نے ایک ایسے ماحول کو جنم دیا، جہاں اسلامی قانون کا مجموعہ تیزی سے پھیلا۔ اسلامی قانون کے پھیلاؤ کیلئے پہلی کوششیں آٹھویں صدی کے آغاز میں ہوئیں، جب محمد ﷺ کے ''مثالی عمل'' پر مبنی سُنہ نے ایسے مسائل سے نمٹنا شروع کیا جن کا واضح طور پر احاطہ قرآن میں نہیں کیا گیا، تاہم قانونی فیصلے کسی حد تک من مانے رہے کیونکہ بہت سے معاملات سُنّہ کے دائرے سے بھی باہر تھے اور اُنہیں قانون ساز کی موضوعی تعبیر پر چھوڑ دیا گیا، کہ محمد ﷺ کا مثالی عمل اس سلسلے میں کیسا ہوتا۔ اسلامی قانون کے فیصلے آنے والی دو صدیوں میں بہت کم من مانے رہ گئے، کیونکہ حدیث سند کا ایک غالب ذریعہ بن گئی اور صرف قرآن سے دوسرے نمبر پر رہ گئی۔ حدیث نے سُنّہ کو ایک تاریخی حقیقت کے طور پر تحریری شکل میں لانا شروع کر دیا، اور جائز احادیث کی نشاندہی منقولات کے ذریعے، پیغمبر ﷺ کے کسی ایک صحابی تک کی جا سکتی تھی۔ (21) حدیث کو جمع کرنا ایک وقت طلب عمل تھا، اور چونکہ خلفا کی وفات کے بعد ایسے افراد نہیں رہ گئے تھے جو محمد ﷺ کے ساتھ تعلق داری دعویٰ کر سکتے۔ لہٰذا وہ لوگ جنہوں نے احادیث جمع کیں بہترین سند ہونے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ بہت زیادہ وسیع شہرت رکھنے والے علما..... وہ جو قرآن اور حدیث کا وسیع علم رکھتے تھے۔ اسلامی قانون کی تعبیر نئے حالات کے جواب میں کرنے کیلئے دلیل (اجتہاد) استعمال کرنے لگے۔ (22)

تیزی سے پنپتی ہوئی مذہبی حاکمیت نے ریاست کی بڑھتی ہوئی قانونی ضروریات کو پورا کیا، یعنی مذہبی علما باقاعدہ طور پر عوام کے ساتھ رابطہ رکھتے تھے۔ یہ چیز اُنہیں مقامی عزت عطا کرتی تھی۔ وہ ایک ایسی ''اشرافیہ'' تھے، جو ٹھیک اعمال کے سلسلے میں مقامی آبادی کے عقائد کو تقویت دیتے تھے۔ بلاشبہ اعلیٰ پائے کے قانون ساز اکثر اوقات عوام میں خلیفہ کی نسبت زیادہ مقبول ہوتے تھے۔ ابتدائی دور کے عباسی خلیفہ ہارون (عہد 809-786) کی بیوی نے، جب

www.MashalBooks.org

ایک ممتاز قانون ساز کی آمد پر جمع شدہ مجمعے کو دیکھا تو کہا کہ ''صحیح بادشاہت عالم کے ہاتھ میں ہے، نا کہ ہارون کے ہاتھ میں جو اپنے گرد مجمعے کو پولیس کی طاقت اور محل کے محافظوں کی طاقت سے اکٹھا کرتا ہے۔''(23)

مذہبی طبقے کے عروج نے، اسلامی زُعما کی طرف سے کھیلے جانے والے کھیل کے قواعد کو بدل کر رکھ دیا۔ طاقتور مذہبی علما کی انتظامیہ کے ساتھ، مذہبی حکام کیلئے سیاسی حکومت کی جواز سازی کرنا قابلِ عمل ہوگیا۔ یہ حکام جواز سازی کے ایک شاندار ذریعے کے طور پر کام کرنے لگے۔ اسلامی اصول حکمرانی کی جواز بخشی کیلئے انتہائی سازگار تھا، مذہبی حکام، حکمران کے اثر سے آزاد تھے، اور علما کا، اُن کے مذہبی اور قانونی علم کی وجہ سے بہت احترام تھا۔ وائل حلاق (Wael Hallaq) (صفحہ 83, 182, 205) بہت عمدہ طریقے سے اس تعلق کا خلاصہ بیان کرتا ہے:

''حکومت کو جواز بخشی کی شدید ضرورت مند تھی جسے اس نے قانونی پیشے کے حلقوں میں پایا۔ قانون سازوں نے حکمرانوں کیلئے عوام تک پہنچنے کے ایک موثر آلے کا کام دیا، جن کی صفوں سے وہ اُبھرے اور جن کی نمائندگی وہ کرتے تھے۔ یہ قبل جدید اسلامی ہیئت سیاسیہ کے نمایاں خدوخال میں سے ایک تھا کہ اس کے ہاں اُس شہری آبادی کے جس پر اس کی حکومت تھی بنیادی ڈھانچے پر کنٹرول کی کمی تھی۔ قانون ساز اور منصف بطور شہری قائدین کے اُبھرنے لگے، جو کہ اگرچہ خود عوام کی پیداوار تھے، لیکن وہ اپنے آپ کو..... اُن کے روزمرہ کے معاملات چلانے میں اُلجھے ہوتے تھے..... منصفین نہ صرف عدالتوں کے جسٹس تھے، بلکہ وہ غیر مراعات یافتہ طبقے کے سرپرست اور نگران تھے۔ خیراتی ٹرسٹوں کے نگہبان تھے۔ عدالتوں میں بھی اور اُن سے باہر بھی اور اُنہوں نے اپنے آپ کو عام لوگوں اور حکمرانوں کے درمیان ایک واسطے کے طور پر مستحکم کرلیا تھا۔''

لہٰذا کھیل کے اصولوں نے یہ پابندی لگائی کہ اسلامی مذہبی علما، حکمران کے حق حکمرانی کے بارے میں عام شہریوں کے عقائد کو مضبوط کر سکتے ہیں۔ یہ چیز خاص طور پر عباسیوں کے ماتحت (750-1258) صحیح تھی۔ اُمویوں کا تختہ اُلٹ کر 750 عیسوی میں اقتدار میں آئے، عین اُس وقت مذہبی علما حاکمہ مذہبی اختیار اور قانون پر اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی۔ علما کی حمایت حاصل کرنے کیلئے، عباسی خلفا نے قانون سازوں کو انتہائی نفع بخش مناصب عطا کئے: ایک عام



قانون ساز کی تنخواہ ایک تربیت یافتہ مزدور کی تنخواہ کا تین گُنا تھی۔ (24) خلفائے علما کو ریاستی معاملات میں بھی کچھ اہمیت دی وہ بڑی بڑی قانونی تقرریاں کرنے سے پہلے ہمیشہ شاہی عدالت کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) سے مشورہ کرتے تھے۔ اور صوبائی گورنر، نئے جج تلاش کرنے سے پہلے قانون سازوں کی رہنمائی حاصل کرتے تھے (25) پچھلے باب میں بیان کئے گئے ڈھانچے کے حوالے سے، اقتدار کی جواز بخشی کے اخراجات کم سے کم تھے۔ حکمرانوں کو اسلامی قانون کے مطابق کام کرنا پڑتا تھا، اعلیٰ ترین قانون سازوں کو بھاری تنخواہیں دینا پڑتی تھیں، اور ریاستی معاملات پر کم سے کم کنٹرول اُن کے حوالے کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اقتدار کی مذہبی جواز بخشی کے پوشیدہ مفادات بہت زیادہ تھے۔ مذہبی علما حکمران کا تعلق اسلامی پاکبازی سے جوڑ کر اقتدار کا جواز بخش دیتے تھے..... وہ جائز حکمران کے نام کا ذکر جمعہ کے خطبہ میں کرتے تھے، عدالتی فیصلوں میں حکمران کی اطاعت کی حمایت کرتے تھے، زیارات میں خلفا کی رفاقت کرتے تھے، اور ممتاز خلفا کی نمازِ جنازہ کا اہتمام کرتے تھے۔ (26)

مذہبی علما حکمرانوں کو اسلامی احکام کی پیروی کرنے پر اُکساتے بھی تھے۔ مثال کے طور پر، عباسی خلیفہ ہارون نے اُس وقت ایک سرکردہ ماہر قانون سے مشورہ طلب کیا، جب وہ ایک آدمی سے ایک غلام لڑکی کو خریدنا چاہتا تھا، جو اسے بیچنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک طویل طریقِ کار کے بعد، اُس ماہرِ قانون نے، حکمران کیلئے اسلامی قانون کے مطابق، لڑکی کو خریدنے کا ایک طریقہ پالیا (27) اس طریقِ کار سے اجتناب کیا جاسکتا تھا،..... خلیفہ لڑکی کو جبراً خرید سکتا تھا..... لیکن ایسا عمل مذہبی عالم کی اشیر باد کے بغیر ناجائز ہوتا۔ اعلیٰ پائے کے مذہبی حکام (مفتی) مختلف قوانین، پالیسیوں اور طرزِ ہائے عمل کے بارے میں فتووں کے ذریعے رہنمائی دیا کرتے تھے۔ ان کا دائرہ دُنیاوی امور..... مثال کے طور پر، اس بات پر ہدایت کہ آیا غلاموں کیلئے جمعہ کا خطبہ دیا جاسکتا تھا یا نہیں سے لے کر ایسے اہم امور تک جیسا کہ مخالف ریاستوں پر حملہ کرنے کا یا بڑی بڑی اصلاحات اختیار کرنے تک پر محیط ہوتا تھا (28) یہ اقدامات حکمرانوں اور اُن کے اعمال کو اس بات کی تصدیق کرکے، جائز قرار دیتے تھے کہ وہ اسلامی اصول کے مطابق تھے اور لہٰذا قابلِ اطاعت تھے۔ بلاشبہ، بعض اوقات اسلامی اصول کے مطابق کام کرنے کا مطلب کسی ایسے کام کا کرنا بھی ہوسکتا تھا جسے خلیفہ بصورت دیگر نہ کرتا، لیکن خلیفہ کے اقتدار کی نہ توسیع مذہبی جواز بخشی کے

www.MashalBooks.org

ذریعے کرنے کے مجموعی نفع نقصان کا حساب کتاب عموماً خلیفہ کے حق میں ہی ہوتا تھا۔

945 عیسوی میں، عباسیوں کی طرف سے سیاسی طاقت کے خاصے نقصان کے بعد، مذہبی اور سیاسی حکام کے درمیان ایک مفاہمت ہوئی کہ اوّل الذکر شخصی، فوجداری اور دیوانی قانون کے ذریعے سماجی زندگی کے معیارات کا تعین کریں گے جبکہ موخر الذکر کو خارجہ پالیسیوں میں خودمختاری حاصل تھی۔ (29) جوں ہی حکمرانوں کے بالمقابل مذہبی حاکمیت اس طاقتور پوزیشن پر پہنچ گئی، تو سُنی اسلامی اصول چار مکاتبِ فکر میں مستحکم ہوگیا، جن کے نام اُن کے بانیوں کے ناموں پر ہیں: حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی۔ ان مکاتبِ فکر سے منسلک قانونی ماہرینِ قانونی فیصلے کرنے کیلئے ایک متعین اصول اور طریقِ کار کی پیروی کرتے تھے۔ ہر مکتب فکر کے پیروکار یعنی ایک ایسا شخص جو ایک ایسی نئی فکر اختراع کرے جس کی پیروی اُس مکتبِ فکر کے تمام لوگ کریں اور جو اسلامی تصورات سے ہم آہنگ ہوئے بعد کے تمام مجتہدین سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بانی کی رہنمائی میں اُس کی پیروی کریں۔ مذہبی اصول کے مکتبہ ہائے فکر میں مکمل اور پختہ ہوجانے کے ساتھ ہی قانون سازی کی ذہانت..... جو پہلی چار اسلامی صوبوں میں اتنی متحرک تھی، اور اسلامی قانون حجم کے ڈرامائی طور پر پھیلنے کی ذمہ وار تھی۔ سُست ہونا شروع ہوگئی۔ ایک بڑا مجموعۂ تحاریر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ دسویں صدی کے آس پاس کسی مقام پر، ایک غیر رسمی اتفاق رائے پیدا ہوا، کہ آزادانہ استدلال (اجتہاد) جو کہ پہلی چار اسلامی صدیوں میں تعبیرِ نو کا ایک اہم طریقہ رہا، اب سچائی معلوم کرنے کا قابلِ قبول طریقہ نہیں ہے، لہٰذا ماہرین قانون صرف مثالوں کی پیروی کر سکتے ہیں۔ (31) اس نظریے کے تحت سُنی اسلام میں قانونی ذہانت کا گلا گھونٹ دیا، وہ چیز جو وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا عدالتی اختیار تھی، چار مکاتبِ فکر میں پختہ ہوگئی۔ بجائے اجتہاد سے کام لینے کے، ماہرین قانون محض پہلے سے منضبط عقل کو قبول کرتے تھے، جو غالباً بہت مختلف حالات میں ظہور میں آئی۔ اسلامی فکر میں دیکھے جانے والے جمود کا حوالہ وسیع پیمانے پر ''اجتہاد کے دروازے بند ہونے'' کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اگر دروازہ واقعی بند ہوگیا تھا، تو یہ اسلام کی قانونی اور معاشی تاریخ میں ایک اہم پیشرفت تھی؛ اس کا مطلب ہے کہ نئے معاشی بنیادی طور پر تقاضوں کے جواب میں ہمیشہ نئے قوانین اور پالیسیاں نہیں بنائی جاسکتی تھیں، کیونکہ ہمیشہ ایسا ممکن نہیں تھا کہ ماضی میں بنایا گیا اُصول ایسے مسائل سے نمٹ سکے۔



بہت سارے معاملات کے بارے میں اسلامی اصول کی تاریخ اس منطق سے مطابقت رکھتی ہے، اگرچہ کچھ حالیہ علما اس تصور سے اختلاف رکھتے ہیں، کہ ''اجتہاد کا دروازہ'' نظریے میں بھی اور عمل میں بھی کبھی بھی بند نہیں ہوا۔ (32) مثال کے طور پر، اگلا باب اس باب پر نگاہ ڈالتا ہے کہ اسلامی مذہبی حکام نے کس طرح ابتدا میں قرضوں پر سود لینے کی پابندیوں کو نرم کیا، لیکن نظریے کی تعبیرِ نو دسویں صدی کے اردگرد بند ہوگئی..... تیمور کُران (Timur Kuran) (2011) بڑی تفصیل سے جائزہ لیتا ہے کہ حصہ داری، وراثت اور اوقاف پر کس طرح پہلی چار اسلامی صدیوں کے بعد کس طرح جامد رہے، اور چنانچہ کبھی کوئی مجموعہ قوانین ایسا ظہور میں نہیں آیا جو سرمایہ کاروں کو اپنا سرمایہ بڑے بڑے کاروباروں میں لگانے کی اجازت دیتا۔

اسلامی قانون کیوں جامد ہوگیا، جس نے اُن اصولوں کو جامد کردیا جو پہلی چار اسلامی صدیوں میں مناسب حال تھے۔ پچھلے باب میں پیش کیا گیا ڈھانچہ کچھ جواب مہیا کرتا ہے۔ قابلِ آزمائش پیش بینی 4 کی دلیل کا ایک دفعہ پھر مختصر جائزہ لیتے ہیں: جب حکمران جواز بخشی کیلئے مذہبی اشرافیہ پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگ جائیں، تو وہ ان تبدیلیوں کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے جو مذہبی اشرافیہ کے لئے خطرہ بن جائیں، اور اس کا نتیجہ ''رجعت پسندانہ'' توازن ہوسکتا ہے۔ اس توازن میں تمام غیر مذہبی کارندوں کی بشمول معاشی اشرافیہ کے حکمرانوں کے مقابل میں، نئے قوانین اور پالیسیوں پر سودابازی کی پوزیشن کمزور ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ جب تجارتی امکانات بڑھ جاتے ہیں، تو مذہبی حکام ایسی جدت طرازیوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جو ان کی طاقت کو کم کرتی ہیں یا جو اُس نظریے کے خلاف ہوتی ہیں، جو اُس دور میں تخلیق کیا گیا تھا، جس میں معاشی اور ٹیکنولوجیاتی امکانات مختلف تھے۔ اس کے جواب میں، مذہبی اور سیکولر قوانین اور ادارے جامد ہوجاتے ہیں؛ ان میں سے کوئی بھی نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا اور حکمران نئے مسائل سے نمٹنے کیلئے پُرانے قانونی اور عقلی ڈھانچے کو استعمال کرتے ہیں۔

یہ منطق ''اجتہاد کے دروازے بند ہونے'' کیلئے اُن لوگوں کو ایک متبادل توجیہہ فراہم کرتی ہے، جو برنارڈ لیوس (Bernard Lewis) جیسے مستشرق علما ترجیح دیتے ہیں، جو یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کی اسلامی فقہ کی رجعت پسندی کسی اندرونی رجعت پسندی کی وجہ سے یا تبدیلی کو تصور میں لانے کی نااہلی کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ ہوسکتا ہے مسئلہ اس استعارے کے

ساتھ ہی ہو۔ یہاں تجویز کیا گیا ڈھانچہ یہ بیان کرتا ہے کہ اسلامی قانون کی نئی تعبیرات قانونی ماہرین کیلئے سمجھنا ناممکن نہیں تھیں: فقط یہ تھا کہ اُن کیلئے ایسا کرنے کا کوئی جذبہ محرکہ نہیں تھا کیونکہ ایسی تعبیرات کی کوئی طلب نہیں تھی۔ لہٰذا غالباً یہ استعارہ زیادہ مناسب ہے: ہوسکتا ہے ''اجتہاد کا دروازہ'' بند ہوگیا ہو، لیکن اس کو ''تالہ نہیں لگا تھا'' جو کچھ حکمرانوں اور تاجروں، پیداکاروں، یا دوسرے دلچسپی رکھنے والے فریقوں کیلئے ضروری تھا، وہ اس کو کھولنے کی کوشش کرنا تھا۔ لیکن، توازن والے اداروں کے ساتھ وابستہ ترغیبات کی وجہ سے متعلقہ کھلاڑیوں میں سے کسی کو بھی اس دروازے کو دھکا دے کر کھولنے کی ترغیب نہ تھی۔ لہٰذا مشاہداتی رویہ ظاہر کو دیکھنے ہر منتج ہوا اور یہ سمجھا گیا کہ دروازہ بند اور مقفل ہے..... آدمی اس وقت تک یہ نہیں جان سکتا کہ دروازہ مقفل ہے، جب تک کہ وہ اسے کھولنے کی کوشش نہ کرے۔ جب دسویں صدی کے لگ بھگ یہ رجعت پسندانہ توازن اُبھرا، تو دروازے کے بند ہونے کو تقویت دینے والے خیالات اُبھرے، جس نے مسلمانوں کے مذہبی اور سیاسی حکام کے درمیان اقتدار کی جواز بخشی کا تعلق مزید تقویت پکڑ گیا۔(33)

اسلامی فکر اور اداروں میں جمود کا آغاز ہوا، تو مشرقِ وسطیٰ کی معیشتیں بھی جمود کا شکار ہونے لگیں، عین اس وقت جب مغربی یورپ کی معیشتیں اوپر اُٹھنے لگی تھیں۔ بارھویں اور تیرھویں صدی میں شروع ہوکر، تجارت مغربی یوریشیا کا مرکز مشرق وسطیٰ سے آہستہ آہستہ اطالوی شہری ریاستوں کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ تبدیلی نتیجہ تھی مغربی یورپی اداروں کے ایسے طریقے سے ارتقا پذیر ہونے کا جو کاروبار کیلئے زیادہ فائدہ مند تھے بہ نسبت اُن کے مشرقِ وسطیٰ کے ہم منصبوں کے طریقوں کے لیکن مغربی یورپ کے ادارے اس انداز سے کیوں تبدیل ہوئے؟



# سقوطِ روم کے بعد عیسائی جواز بخشیِ اقتدار

پانچویں صدی میں مغربی سلطنتِ روما کے سقوط کے بعد، مغربی یورپ معاشی، ٹیکنولوجیاتی، اور ذہنی اعتبار سے بہت پسماندہ تھا۔ حملہ آوروں نے پانچویں صدی میں روم کو بار بار تاراج کیا، اور سلطنت کا مغربی نصف آخر کار تباہ ہوگیا (مشرقِ نصف کے برعکس، جس نے اگلی ہزاری تک بازنطینی سلطنت کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھا) وحشی جرمینک بادشاہوں نے سلطنتِ رُوما کی باقیات پر حکومت کی:۔ فرینک شمالی یورپ میں پھیل گئے، ویزی گاتھوں نے جزیرہ نمائے آئبیریا یا غلبہ حاصل کرلیا اور آسٹروگاتھوں نے اٹلی اور جنوب مشرقی یورپ پر قبضہ کرلیا۔ ان بادشاہوں نے جنگجو اشرافیہ کی وفاداری حاصل کر جبر کے ذریعے اپنے اقتدار کو وسعت دی۔ سلطنت رُوما کو جرمینک سلطنت سے ملانے والا واحد قوت کلیسا تھا۔ چوتھی صدی میں سلطنتِ روما میں، قسطنطین کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد بڑے بڑے جتھے عیسائیت میں داخل ہوئے۔ جرمینک بادشاہ شروع میں عیسائی نہیں تھے، لیکن وہ بڑی حد تک اُن غیر ملکی آبادیوں پر حکومت کرتے تھے، جہاں رومی اثر کے تحت عیسائیت پھیلی لہٰذا اب کلیسا ایک طاقتور اقتدار کی جواز بخشی کا کارندہ بننے کی پوزیشن میں آچکا تھا، صرف اگر بادشاہ عیسائیت کو قبول کرلیتے اور اُنہوں نے عیسائیت قبول کرلی۔ سب سے زیادہ اہم تبدیلی مذہب فرانکش بادشاہ کلووِس (Clovis) (عہد 481-509) 496 میں تھی: یہ عیسائی تاریخ میں ایک بہت اہم واقعہ تھا: کلووس کی تبدیلی مذہب سے پہلے پورے مغربی یورپ میں کوئی بڑا حکمران عیسائی نہیں تھا (34)۔ کلووس نے اپنے اقتدار کو جواز بخشنے اور ویزی گاتھ علاقے میں توسیع دینے کیلئے عیسائیت کو استعمال کیا۔ 507 میں، مغربی گاتھوں کے ساتھ جنوب مشرقی گال میں جنگ شروع کرنے پر کلووس نے یہ دعویٰ کیا ''مجھے یہ بات سخت ناگوار ہے کہ یہ آریائی گال کے ایک حصے پر قابض ہیں۔ آیئے ہم خُدا کی مدد سے جائیں اور انہیں فتح کریں۔'' (35) ویزی گاتھ فرانکوں سے بھی زیادہ غیر ملکی جنگجو حکمران تھے،

www.KitaboSunnat.com

جنہوں نے جزیرہ نمائے آئبیریا میں رومی عیسائی آبادی پر حکومت کی۔ آخر کار ویزی گاتھوں نے ریکاریڈ (Recared) (عہد 60-586) کے ماتحت عیسائیت قبول کی، اور کلیسا اُس وقت تک جواز اقتدار کا ایک اہم ذریعہ بن گیا۔ یہاں تک کہ اُنہیں 711 میں مسلمان حملہ آوروں نے کچل دیا۔(36)

جرمینک بادشاہوں نے، اُن بہت سے اداروں کو تباہ کر دیا، جو سلطنت روما کے تحت عوامی نظم وضبط کو قائم رکھنے میں سہولت بہم پہنچاتے تھے۔ ان حکمرانوں نے ٹیکس جمع کرنے یا مقامی نظم ونسق قائم کرنے کیلئے، اعلیٰ کام کرنے والی کوئی چیز استعمال نہ کی۔ رومی قانون اور افسر شاہی کی تباہی کی وجہ سے سیاسی اقتدار انتہائی غیر مرکزیت کا شکار ہو گیا۔ سلطنتِ روما کے سقوط کے آدھی ہزاری کے بعد، کوئی بڑی مرکزی ریاست نام کو بھی نہ تھی۔ ہر جرمینک بادشاہ اپنے ساتھ غیر تحریری قوانین کا ایک سیٹ لے کر آیا، اور رومن قانون کو قبائلی قانون کے طور پر چھوڑ دیا۔(37)

وائی کِنگ، مگیار اور مسلمان حملہ آوروں کے پے در پے حملوں نے ان حالات کو اور بھی شدید بنا دیا۔ ایک مرکزی حکومت طاقت کی اجارہ داری نہیں تھی۔ مقامی اشرافیہ نے جس کے پاس جبری طاقت تک کچھ رسائی تھی، عوام کیلئے تحفظ فراہم کیا جاگیردار اشرافیہ نے کسان عوام کو مقامی قانون، نظم وضبط، اور تحفظ اُن کی خدمات کے بدلے میں مہیا کیا، لیکن اُن کا مہیا کیا تحفظ صرف اُن زمینوں تک پہنچا جو جاگیردارانہ کنٹرول میں تھیں۔ جاگیردارانہ حویلی سے باہر نظم وضبط برائے نام تھا، جو ان علاقوں کو مسافروں اور تاجروں کیلئے انتہائی خطرناک بنا دیتا تھا۔ لہٰذا آبادیوں کے چھوٹے چھوٹے جھرمٹوں کی حدود سے باہر حقوقِ ملکیت اور تحفظ تقریباً ناپید تھے۔ فرانکی بادشاہوں کی ٹیکسوں تک رسائی نہ تھی، لہٰذا وہ سڑکوں اور پُلوں کی حفاظت یا تاجروں کیلئے محفوظ راستے مہیا کرنے کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری عوامی بہبود کی اشیا جو سلطنت روما کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں۔ جیسا کہ نظامِ آبپاشی، ایک مضبوط مرکزی حکومت کی غیر موجودگی میں تیزی سے انحطاط پذیر ہو گئیں، نتیجے کے طور پر، معاشی سرگرمی جو زیادہ تر زرعی تھی خود مکتفی جاگیروں کے اردگرد مرکوز ہو گئی تھیں۔ شہر کاری اور تجارت، چھوٹی شمالی اٹلی اور فلینڈرز میں سوائے چند چھوٹے چھوٹے حلقوں کے ناپید تھیں۔(38) قرونِ وسطیٰ کے یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان تقابل اس سے زیادہ واضح نہیں کر سکتا۔ موخر الذکر کی معیشتیں، اوّل الذکر کی



معیشتوں سے، اسلام کے پھیلاؤ کے صدیوں بعد تک آگے رہیں۔

سقوطِ روم اور کرولنگی سلطنت کے اُبھرنے کے درمیان آٹھویں صدی میں، مرکزی سیاسی حاکمیت کی کمزوری کی وجہ سے، پوپ کو ایسی آزادی اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کا موقع ملا جو رومی یا بازنطینی سلطنتوں کے تحت ناقابلِ حصول تھا۔ کلووس کے فرانکی جانشینوں نے پادریوں کو بڑی بڑی مراعات اور جائیدادیں دے کر اُن کی حمایت حاصل کی خاص طور پر طاقت ور اُسقفوں کو، جو بڑے بڑے فرانکی زمیندار بن گئے اور اس طرح کلیسا گو اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کیلئے استعمال کرتے رہتے۔ اس انتظام کا ایک اہم نتیجہ پوپ گریگوری اول (Pope Gregory 1) (عہد 590-604) کے عہد میں برآمد ہوا، جس نے ایک طرف مشرق میں شہنشاہ کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور دوسری طرف یہ نظریہ قائم کیا کہ مغرب میں شاہی طاقت کلیسا کی خدمت کرتی ہے۔(39) اٹھارویں صدی کے وسط میں، پاپائیت نے رسمی طور پر کلیسا کی قسمت کو فرینکی سلطنت کے ساتھ منسلک کر دیا۔ دونوں اطراف اس اتحاد سے زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو گئیں..... پاپائیت نے لومبارڈوں کے بار بار کے حملوں سے تحفظ حاصل کر لیا، جبکہ فرینکی بادشاہ پین (Pepin) نے اپنی متنازعہ بادشاہ کے لئے سندِ جواز حاصل کر لی پین کے بیٹے، شارلمین نے، مذہبی جواز بخشی کے ذریعے سے اور بھی زیادہ طاقت سے اپنی حکمرانی کو توسیع دی۔ اُس نے سیکنوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا، اپنی مفتوحہ زمینوں میں اُسقفی عملداریاں قائم کیں، اور اپنی پوری سلطنت میں خانقاہی تنظیموں کو عطیات دیئے۔(40) زیادہ مشہور واقعہ یہ ہے کہ، 800 عیسوی میں پوپ لیوسوم (Pope Leo III) اور شارلمین نے ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری کا حلف اُٹھانے کیلئے معاہدہ کیا جب تک کہ اُن میں سے ایک دوسرے کو اپنے متعلقہ حلقۂ اثر میں حکمران تسلیم کرے گا۔ اس سال کے کرسمس کے دن پوپ لیو اور شارلمین نے اس معاہدے کو، جواز بخشی اقتدار کے ایک بہت بڑے عمل کے ذریعے مشتہر کر دیا: پاپائی تاجبوشی کے ذریعے جہاں پوپ نے شاہی تاج شارلمین کے سر پر رکھا۔ مقدس رومی سلطنت کے بعد کے حکمرانوں بشمول اس کے بانی اوٹو اوّل (Otto1) عہد نے بھی روم جا کر پوپ کی طرف سے تاجبوشی کی ضرورت محسوس کی۔

یہ تاریخ ایک ایسے توازن کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جس میں یوروپی اقتدار کو

www.MashalBooks.org

جزوی طور پر کلیسا کی طرف سے اور جزوی طور پر انتہائی غیر مرتکز جاگیردارانہ اشرافیہ، جس نے فوجی حمایت اور مقامی نظم ونسق مہیا کیا، کی طرف سے توسیع دی گئی۔ اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں تھا کہ جاگیردارانہ اشرافیہ حکمرانوں کے بالمقابل زیادہ سودابازی کی پوزیشن میں تھی۔ یورپ کے اُن حصوں میں جہاں سیکولر حکمران اپنی طاقت کو بڑھانے کے قابل تھے، منتشر اشرافیہ کیلئے باہمی ربط اس قدر مہنگا تھا کہ وہ ایک ایسے گروپ کے طور پر منظم نہیں ہو سکتے تھے، جو حکمرانوں کے ساتھ گفت وشنید کر سکے۔ بلاشبہ، پہلی یوروپی پارلیمانیں بارہویں صدی کے اختتام تک نہ اُبھر سکیں۔ اس چیز نے کلیسا کو توسیع کا بنیادی کام اپنے ہاتھ میں لینے کیلئے چھوڑ دیا۔ یہ ہر جگہ موجود تھا اور اس نے ایک موثر اور معقول حد تک سستا اقتدار کی جواز بخشی کا ذریعہ مہیا کیا۔

دسویں صدی کے اواخر میں، وہ حالات جنہوں نے اس توازن کو تقویت دی تھی سلجھنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں پورے برِاعظم میں آبادی بڑھی، تو زیرِ کاشت زمین بھی بڑھتی گئی۔ اصلاحِ زمین کے بڑے بڑے منصوبوں اور نئی زرعی تکنیکوں کی وجہ سے ایک مناسب زرعی اضافہ ہوا جس نے آبادی کے ایک زائد حصے کو شہروں میں روزگار تلاش کرنے کیلئے آزاد کر دیا۔ (41) واقعات کی یہ ترتیب اُس سے زیادہ مختلف نہ تھی، جو چند صدیاں پہلے مشرقِ وسطیٰ میں تھی۔ جہاں عرب فتوحات نے اضافی زرعی پیداوار کو ممکن بنایا، جس نے جوابی طور پر شہر کاری کو فروغ دیا۔ شمالی اٹلی وہ پہلا خطہ تھا، جو شہری احیا کے تجربے سے گزرا۔ (دیکھئے جدول 3.2)۔ شمالی اٹلی کے کثرت سے اُبھرتی ہوئی شہری ریاستیں کاروباری توسیع کیلئے منفرد طور پر موزوں تھیں۔ بازنطینی سلطنت اور مسلم شمالی افریقہ...... جو دونوں مغربی یورپ کے کسی بھی علاقے کی نسبت معاشی طور پر کہیں زیادہ آگے تھے...... کے ساتھ ان ریاستوں کی قربت اور تعلقات نے انہیں، طویل فاصلوں کے کاروبار کے مواقع مہیا کئے، جو پورے برِاعظم میں اور کہیں بھی ناپید تھے۔ ان شہروں کی دولت میں پہلے وینس اور ایملفی میں اور بعد میں پیسا اور جینوا میں اضافہ ہوا۔ اور سیاسی طاقت اور معاشی اشرافیہ نے۔ کسی بھی بڑی سیاسی حاکمیت کے سے آزادنہ طور پر بڑھوتری حاصل کی۔ کاروبار یورپ کے دوسرے حصوں میں پھیلتا رہا۔ اور زیادہ سے زیادہ کاروباری مرتکز شہر اُبھرنے لگے، خاص طور پر اُن جگہوں پر جہاں مرتکز سیاسی اختیار کمزور ترین تھا، جیسا کہ مقدس رومی سلطنت میں، جہاں متعدد آزاد خود مختار شہر ''کاروباری انقلاب'' کے دوران اُبھرے (کاروباری انقلاب



کی اصطلاح دسویں۔ چودھویں صدیوں میں پورے یورپ میں کاروبار کی بحالی کیلئے استعمال ہوتی ہے) تاجر اشرافیہ نے ان بہت سے شہروں پر قبضہ کیا، اور اپنے مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے مقامی حکومت کو استعمال کیا۔ طاقتور ترین اطالوی شہری ریاستوں، خاص طور پر جینوا اور وینس نے، اپنی دولت اور فوجی قوت کو، تاجر اشرافیہ کے تزویراتی مفاد کے حامل علاقوں میں قبضے حاصل کرنے کیلئے استعمال کیا۔ (42) اور کامیابی نے مزید کامیابی کو جنم دیا۔ بکثرت کاروباری مواقع نے مالی آلات میں تجربات کی حوصلہ افزائی کی (مثلاً ہنڈیاں) تنظیمی فارم (مثلاً کومنڈا (Commenda) اور اٹلی کی خاندانی فرم)، اور دوہرے اندراج والی کھاتہ داری، جس نے ''بڑے کاروبار'' کو اور بھی زیادہ ممکن اور نفع بخش بنا دیا۔ 1300 تک وینس اور جینوا، مغربی دُنیا میں سب سے بڑے اور سب سے اہم شہروں میں سے تھے، جنہوں نے بہت سے علاقوں کو فتح کر لیا تھا اور جن کی آبادیاں ایک لاکھ سے تجاوز کر گئی تھیں۔ اگرچہ ان کاروباری شہری ریاستوں میں مذہب اہم تھا، لیکن مذہبی حکام کے مفادات عمومی طور پر تاجر اشرافیہ کے تابع ہوتے تھے۔ (43)

**جدول 3.2:** کاروباری انقلاب کے قریب مغربی یورپ کے دس سب سے زیادہ آبادی والے شہر

| کاروباری انقلاب سے پہلے | 900 عیسوی | کاروباری انقلاب کے وسط میں | 1100 عیسوی | کاروباری انقلاب کے اواخر میں | 1300 عیسوی |
|---|---|---|---|---|---|
| شہر | آبادی | | | | |
| (ہزاروں میں) | شہر | آبادی (ہزاروں میں) | شہر | آبادی (ہزاروں میں) | |
| روم | 40 | پیرس | 65 | پیرس | 250 |
| وینس | 37 | وینس | 58 | وینس | 110 |
| نیپلز | 30 | فلورنس | 45 | جینوا | 100 |

www.MashalBooks.org

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| لے اون | 28 | میلان | 45 | میلان | 100 |
| ٹرائر | 25 | سیلرنو | 40 | فلورنس | 95 |
| ویرونا | 25 | کولون | 35 | لندن | 70 |
| رٹیجنز برگ | 25 | روم | 35 | نیپلز | 60 |
| | 25 | لندن | 32 | کولون | 54 |
| کولون | 21 | نیپلز | 30 | سینا | 50 |
| پیرس | 20 | ایجنز برگ | 30 | بارسلیونا | 48 |

نوٹ: مسلم سلطنتوں کی طرف سے فتح کئے اور آباد کئے گئے شہر اس جدول میں شامل نہیں ذریع بوسکراے آل (2013)

تجارت شہری ریاستوں اور آزاد شہروں سے باہر بھی ہوتی تھی۔ جب کاروبار یورپ کے دوسرے حصوں میں پھیلا تو سیاسی حکام کیلئے ایسے بورد (میونسپل رقبہ) قائم کرنے کا زیادہ جذبہ محرکہ اور زیادہ ہوگیا، جن میں غیر ملکی تاجروں کیلئے حقوق ملکیت کا تحفظ ہو، تاجروں کے گلڈ (مثلاً جرمن ہنسا) مقامی حکمرانوں کے ساتھ تحفظ اور حقوقِ ملکیت کیلئے براہِ راست گفت وشنید کرتے تھے، اور تاجر اپنے تنازعات کو نمٹانے کیلئے اپنی عدالتوں کو استعمال کرتے تھے۔ (144) بارھویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک میلے اہم اجتماعی مقامات بن گئے تھے۔ سب سے مشہور اور اہم شیمپین (Champaign) میلے تھے، جہاں پورے یورپ سے تاجر اکٹھے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اشیا اور اُدھار کے معاہدوں کا تبادلہ کرتے تھے۔

کاروبار کی توسیع میں یورپ کے مذہبی اور سیاسی حکام کے درمیان اقتدار کی جواز بخشی کے تعلق کی واضح نشانیاں تھیں۔ پچھلے باب سے حاصل ہونے والے وجدان سے یہ نشاندہی ہوئی کہ بڑھتے ہوئے کاروباری امکانات کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ توازن کے جواز بخشی کے انتظام کو تبدیل کردیتے۔ وہ اس طرح کہ وہ توسیع اقتدار کے دوسرے ذرائع کے مقابلے میں مذہبی توسیعِ اقتدار کے نفع نقصان میں اضافہ کردیتے۔

وہ انتخاب جس کا یوروپی حکمرانوں کو سامنا تھا، بڑا سادہ تھا، وہ یا تو مذہبی جواز بخشی اقتدار کا



استعمال جاری رکھ سکتے تھے اور اس طرح پالیسی کی سودا بازی کا نتیجہ کلیسا کے مفادات کی عکاسی کرتا۔ یا وہ پالیسی پر سودا بازی میں نئے کاروباری طبقات کو زیادہ وزن دے سکتے تھے۔ قابلِ آزمائش پیش بینی (3) اس بارے میں کہ یوروپی حکمرانوں نے کس نے انتخاب کو پُتا رہنمائی مہیا کرتی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ، باقی سب برابر ہونے کے باوجود، ایک دورِ وسطیٰ کا یورپی حکمران، معاشی اشرافیہ کے ذریعے توسیع اقتدار کو، اس سے زیادہ ترجیح دینے پر مائل تھا، جتنا کہ مشرق وسطیٰ کا حکمران تھا۔ ایسا انتخاب مذہبی جواز بخشی کے کردار کو کم کردیتا تھا، جو مغربی یورپ میں مشرق وسطیٰ کی نسبت کم موثر تھا۔

کلیسا اور سیاسی اشرافیہ کے درمیان پالیسی سازی میں کلیسا کے کردار پر بہت سی کشمکش تھیں، اُن ادارہ جاتی تبدیلیوں کی وجہ سے جو کاروباری انقلاب کی وجہ سے آتی تھیں۔ جب تاجروں اور جاگیرداروں کے ذریعے اقتدار کی توسیع کے مقابلے میں مذہبی توسیع کے فوائد کمزور پڑ گئے، تو کلیسا نے عیسائی حکمرانی کے نظریاتی جواز کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ پوری گیارھویں اور بارھویں صدیوں کے دوران، پائی مملکت نے پہلی مرتبہ یہ دعویٰ کیا کہ کلیسا ہی بادشاہت کا حق عطا کرتا ہے، اور لہٰذا پوپ کو حکمرانوں کو تخت سے اُتارنے کا اختیار ہے۔ یہ گیارھویں صدی سے پہلے کے بادشاہت کیلئے یوروپی جوازوں سے بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اس سے پہلے حکمران مذہبی اصول کے سلسلے میں کلیسا کے زُعما پر کنٹرول رکھتے تھے۔ کلیسا ایک بادشاہ کو (تخت نشینی کیلئے) مسح تو کرسکتا تھا لیکن بادشاہ کو اس کے نتیجے میں دیئے گئے اختیار کا مطلب تھا کہ اس کو واپس لینا کلیسا کا اختیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر 1067 میں، فاتح ولیم نے اس بات پر زور دیا کہ بادشاہ کو یہ فصیلہ کرنے کا اختیار ہے کہ نارمن اور انگریز کلیسا پوپ کو تسلیم کریں۔ اور یہ کہ کلیسائی سزاؤں پر بادشاہ کو ویٹو کا اختیار حاصل ہے۔ (45) کلیسا کی یہ چال آخر کار ناکام ہوگئی۔ اس ناکامی کا الزام ایک واحد حقیقت کو دیا جاسکتا ہے: قرآن کے برعکس بائبل اور دوسرے ابتدائی اصولوں نے سیکولر حکمرانی کیلئے ایک علیحدہ دائرہ مقرر کردیا تھا، اور عیسائی حکام کو اُن حکمرانوں کو تخت سے اُتارنے کا کوئی اصولی جواز نہیں تھا، جو ان کی خواہشات کے خلاف کام کریں۔

ان تمام کشاکشوں میں سب سے بڑھ کر اہم عطائے منصب کا تنازعہ تھا۔ (46) کلیسا اور غیر کلیسائی یوروپی حکمرانوں کے درمیان یہ پانچ دہائیوں کی کشمکش عطائے منصب پر مرکوز تھی

..... پادریوں کے تقرر کا حق۔ گیارھویں صدی کے وسط تک، بادشاہوں یا شہنشاہوں کیلئے اُسقف کا انتخاب کرنا عام تھا ایک نومنتخب اُسقف حکمران کو خراجِ عقیدت پیش کرتا تھا۔ جو اُسقف کو اُسقف کے عملے اور انگوٹھی سے نوازتا تھا، اُس کے ساتھ ساتھ جاگیروں بعد علمداریوں سے بھی جو دورِ وسطیٰ کی اُسقفیہ کے ساتھ وابستہ تھیں۔ بہت سے اُسقف عطائے عہدہ کے جواب میں رقم پیش کرتے تھے جو کہ ایک ایسا معمول تھا جسے (Simony) کلیسا کے حقوق واختیارات کے نام سے جانا جاتا تھا۔ان معمولات نے کلیسا کے اندر داخلی تناؤ پیدا کر دیئے۔کلیسا کے بہت سے لوگ Simony کو ایک گھناؤنا گناہ سمجھتے تھے،اور عطائے عہدہ نے کلیسا کی طاقت کو کم کر دیا، کیونکہ کلیسا کے زُعما اپنے مناصب کیلئے حکمرانوں پر بہت زیادہ انحصار کرنے لگ گئے تھے۔

1059 میں کلیسا نے روم میں کلیسا کی ایک مجلس (Synod) میں، ان مسائل سے نمٹنے کی کوشش کی، جس نے غیر کلیسائی عطائے عہدہ پر عمومی ممانعت کا اعلان کر دیا۔ کلیسا نے اس ممانعت کو 1075 تک نافذ نہ کیا، جب پوپ گریگوری ہفتم (عہد 1085-1073) اس کی توثیق مزید کیلئے پاپائی حکم کو سامنے لے آیا۔ مقدس رومی شہنشاہ جرمنی کے ہنری چہارم (Henry IV) عہد (1105-1084) نے جلدی سے اس حکم کو نظرانداز کر دیا۔ ہنری چہارم بغاوت کی صورتِ حال میں جرمنی کو متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا..... جو کہ ایک ایسا اقدام تھا، جو اُسقفوں کی تقرری اور کنٹرول، کے بغیر، جو مقدس سلطنتِ روما کے ایک خاصے حصے کو ایک ایک مقبوضہ جاگیر کے طور پر رکھے ہوئے تھے، ناممکن تھا۔ یہ کشمکش تیزی سے زور پکڑتی گئی۔ ہنری چہارم نے اپنے اسقفوں سے، یا پاپائی حکم کی مزاحمت کرنے کیلئے مدد مانگی، اور پوپ گریگوری ہفتم نے جرمن شہزادوں کی حمایت طلب کی، ہنری کو تخت سے ہٹانے کیلئے۔ ہنری نے پوپ کی بطور ایک غاصب کے مذمت کرنے کی کوشش کی، اور اس کے جواب میں گریگوری نے اُسے کلیسا سے خارج کر دیا اور اُسے اُس کے شاہی اقتدار سے محروم کر دیا۔ یہ کشمکش، تیزی سے عیسائی معاشرے میں حکمران کے حقوق کی کشمکش بن گئی یعنی حکمرانی کون کرے گا، بادشاہ یا کلیسا؟ (47)

ہنری چہارم نے اپنی حیثیت کا بہت غلط اندازہ لگایا، کیونکہ جرمنی کے شہزادوں کی کسی ہمہ طاقتور مرکزی شہنشاہ کے آگے جھکنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ بہت سے شہزادوں نے ہنری چہارم اور پاپائیت کے درمیان لڑائی کو خوش آمدید کہا اور پوپ کا ساتھ دیا۔ جب ہنری نے اقتدار پر اپنی



گرفت کمزور پڑتی دیکھی، تو اس نے گریگوری ہفتم کو، جنوری 1077 میں اپنے کلیسا سے اخراج کے فیصلے کو واپس لینے کی رسوائے زمانہ اپیل کی، جہاں وہ اٹلی کے کوہِ الپس میں، کینوسا کے قلعے کے باہر تین دن تک گہری برف میں ننگے پاؤں کھڑا ہوا تھا۔ گریگوری نے ہنری کو بری کر دیا، اگرچہ اُس نے اُس کی بادشاہ کو جواز عطا کرنے کی پیشکش نہیں کی۔ اس چیز نے ہنری کے مخالفین کو مشتعل کر دیا جنہوں نے اپنا الگ بادشاہ روڈلف آف سوابیا (Rudolph of Swabia) کو چُن لیا۔ اس چیز نے لڑائیوں کے ایک اور سلسلے کو چنگاری دکھادی، جو جرمن شہزادوں کے درمیان، اور آخرکار ہنری اور پاپائیت کے درمیان شروع ہوگیا۔ گریگوری ہفتم نے روڈولف کا ساتھ دیا اور ہنری چہارم کو دوبارہ کلیسا سے خارج کر دیا، لیکن سب بے سود۔ اس وقت تک ہنری نے لڑائی میں بالادستی حاصل کر لی تھی، اور اُس نے جلد ہی بادشاہ روڈولف کو شکست دے کر قتل کر ڈالا۔ اپنی حیثیت کے مستحکم ہوتے ہی، ہنری نے پوپ کے ساتھ مصالحت کی کوشش نہ کی۔ اس کی بجائے، اُس نے اینٹی پوپ کلیمنٹ سوم (Clement-III Antipope) کو اپنا پوپ چُن لیا، اور اُسے 1084 میں جبری طور پر روم میں تعینات کر دیا۔

غیر کلیسائی عطائے منصب پر جدوجہد، گریگوری ہفتم اور ہنری چہارم کی وفات کے کافی عرصے بعد بھی جاری رہی اور آخرکار انگلستان اور فرانس تک میں پھیل گئی۔ یہ جدوجہد 1122 میں معاہدۂ وورمز (Concordat of Worms) (یہ پوپ کیلکٹس دوم اور ہنری پنجم، مقدس رومی شہنشاہ کے درمیان معاہدہ تھا، جو وورمز کے شہر کے نزدیک 23 ستمبر 1122 کو ہوا۔ مترجم) پر منتج ہوئی، جو کہ ایک ایسا معاہدہ تھا، جس کے ذریعے کلیسا نے شاہی تسلط سے عملی طور پر آزادی حاصل کی جبکہ اس میں شرط عائد کی گئی کہ بادشاہ کو تمام کلیسائی تقرریوں پر موجود ہونا چاہیے، اور نئے منتخب شدہ کلیسائی عہدیداروں سے خراجِ عقیدت حاصل کرنا چاہیے۔ عملی طور پر اس نے بادشاہوں کو کلیسا کے نمائندوں کے انتخاب پر ایک حقِ استرداد عطا کر دیا۔ (48) انگلستان میں، کلیسا اور ریاست کے درمیان کشمکش 1170 تک جاری رہی، جب تامس اے بیکٹ شہید ہوگیا اور تاج نے انگلستانی کلیسا پر بالادستی کو خیرباد کہہ دیا۔ (49)

عطائے منصب کے تنازعے کے بعد والی صدی نے مقدس رومی شہنشاہوں اور پاپائیت کے درمیان متعدد کشمکش دیکھیں۔ زیرِ بحث دو مسائل تھے: حکمرانوں کو ''بنانے'' میں کلیسا کا

www.MashalBooks.org

کیا کردار ہے۔ اور قانون کون ''بناتا'' اور کون اس کی تشریح کرتا ہے۔ ان دونوں موضوعات پر مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان اختلافات کی اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہوسکتی۔ مشرقِ وسطیٰ میں، مذہبی فُقہا، قانون کی تشریح کرتے تھے۔ مذہبی اور غیر مذہبی قانون کے درمیان بہت کم فرق تھا، اور قرآن اور دوسری مذہبی تعلیمات کے احاطے میں آنے والی کوئی بھی چیز شریعت کی حدود میں تصوّر کی جاتی تھی۔ عطائے منصب کے تنازعے کے بعد، کلیسا نے بھی اس طرح منظّم قانون کا اپنا سیٹ بنانے کی کوشش کی۔ یعنی کلیسا کا قانون۔ کلیسا کے قانون کے ذریعے، کلیسا نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اپنی قانونی عملداری ہونے کا دعویٰ کیا..... وراثت، شادی، اور مالیات کے کچھ پہلوؤں پر بھی لیکن اسلامی قانون کے برعکس، کلیسا کا قانون آخرکار اُن تعلقات میں نفوذ کرنے میں ناکام رہا، جو سختی سے مذہبی نوعیت کے نہیں تھے۔ عیسائی قانون کی بڑھوتری کے ساتھ ساتھ بیک وقت یورپ کے سیکولر قانون کی بڑھوتری بھی ہوئی۔ جس نے جاگیردارانہ اور زمیندارانہ تعلقات، تجارتی سرگرمی، شہری کاروباری ضوابط اور شاہی قانون کا احاطہ کیا۔ (50) سیکولر قانون ایک لچکدار قانون تھا۔ اور یہ بادشاہوں۔ زمینداروں اور ضلع کے تاجر سربراہوں کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی صلاحیت دیتا تھا۔ اور جہاں یہ قوانین مذہبی ایمائیت سے بالکل محروم نہیں تھے..... کلیسائی قانون نے مختلف قانونی ضابطوں کی بنیاد مہیا کی۔ وہیں پر قانونی تکثیریت، جس کا خلاصہ مذہبی اور سیکولر قانون کے درمیان علیحدگی تھا، اُس چیز کا ایک لاینفک جزو بن گئی، جسے ہیرلڈ جے برمن (Harold J. Berman) ''مغربی قانونی روایت'' کا نام دیتا ہے۔ (51)

زیرِ غور دوسرا مسئلہ، حکمران کو بنانے اور معزول کرنے میں کلیسا کی اہلیت کا تھا۔ یہاں بھی مشرقِ وسطیٰ کے ساتھ تقابل واضح تھا۔ جب کبھی بھی کوئی غاصب کسی مسلمان حکمران کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتا، تو وہ عام طور پر پیشگی طور پر کسی اہم مذہبی شخصیت سے اجازت لیتا تھا۔ ایسی طاقت عیسائیت میں بالکل نہیں تھی۔ گریگوری ہفتم نے 1075 کی دستاویز موسوم بہ ''پاپائیت کے احکام'' (Dictatus Papae) کے ذریعے، عطائے مذہب کے تنازعے کے عروج کے وقت شہنشاہوں کو معزول کرنے کے اختیارات کا دعویٰ کرنے کی کوشش ..... عیسائیت کی تاریخ میں پوپ کی طرف سے پہلی مرتبہ ایسا دعویٰ کیا گیا تھا۔ (52)



ہنری چہارم نے فوری طور پر اس دعوے کو مسترد کر دیا، اور یہ استدلال پیش کیا کہ ''شہنشاہ کے بارے میں کوئی انسان فیصلہ نہیں دے سکتا؛ وہ اکیلا زمین پر ''تمام انسانوں کا فیصلہ ساز ہے'' (53) پوری بارھویں صدی کے دوران، کلیسا کے لوگ یہ بحث کرتے رہے کہ آیا پاپائیت کا معزول کرنے کا حق اُس کا جائز اختیار ہے، یا آیا کہ اُمرائے سلطنت سے اس سلسلے میں مشاورت ضروری ہے (54) پاپائیت کے برتری کے دعوؤں کی انتہا وہ دعویٰ تھا جو پوپ انوسینٹ سوم (Pope Innocent III) (عہد 1198-121) کی طرف سے کیا گیا، جو اکثر اوقات سیاسی معاملات میں مداخلت کرتا تھا: اُس نے مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہت کے دواُمیدواروں کے درمیان فیصلہ کرنے کے اختیار کا دعویٰ کیا، انگلستان کے کنگ جان اور فرانس کے کِنگ فلپ کے درمیان زمین کے تنازعات کا فیصلہ کیا۔ بلغاریہ میں ایک بادشاہ کو تاج پہنایا، اور ناروے میں ایک بادشاہ کو معزول کیا۔ (55) لیکن مضبوط عیسائی حکمرانوں نے، جن کے پاس توسیع اقتدار کی کوششوں کے متبادل ذرائع تھے، ایسے پاپائی دعوؤں کو نظرانداز کر دیا۔ بلاشبہ، اُس شہنشاہ نے، جسے انوسینٹ سوم نے اپنی وفات سے پہلے تخت پر بٹھانے میں مدد دی تھی، فریڈرک دوم (عہد 1220-1250) پاپائیت کی جانب سے کلیسا سے اخراج کے بہت سے احکامات کو نظرانداز کر دیا، اور وہ کلیسا کی مسلسل مخالفت میں رہنے کے باوجود اٹلی کو متحد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ بجائے پاپائیت سے جوازِ اقتدار کی سند حاصل کرنے کے، فریڈرک دوم نے جبری کارندوں کو مسلمانوں کے کرایے کے سپاہیوں کو..... اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے، استعمال کیا۔ (56)

انوسینٹ سوم کے عہد کے بعد، کلیسا کی اقتدار کو جواز بخشنے کی صلاحیت، تقریباً بلاتخفیف کم ہوتی گئی۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں یونیورسٹیوں کے عروج نے، ارسطاطالیسی فلسفے کو، جو عیسائی فکر کے دائرے سے باہر تھا استعمال کرتے ہوئے سیکولر حکمرانی کی جواز بخشی کے نظریاتی دفاع کو پروان چڑھانے کا ایک موقع فراہم کیا۔ اس دور کے غالباً سب سے زیادہ عالم دینیات تھا مس ایکویناس (Thomas Aquinas) (1225-1274) نے یوں استدلال کیا۔

روحانی اور سیکولر، دونوں طاقتیں الوہی طاقت سے حامل ہوتی ہیں؛ لہٰذا سیکولر طاقت صرف اُس حد تک روحانی طاقت کے تحت ہے جہاں تک اسے خُدا کی طرف سے تابع رکھا گیا ہے: یعنی اُن چیزوں میں جو روح کی نجات سے تعلق رکھتی ہیں؛ اور لہٰذا، ان معاملات میں سیکولر طاقت کی

بجائے روحانی طاقت کی اطاعت کرنی چاہیے۔لیکن اُن چیزوں میں جو شہری بہتری سے تعلق رکھتی ہیں، روحانی کی بجائے سیکولر طاقت کی اطاعت کرنی چاہیے، بقول میتھیو (Mathew) کے [21]:22 ''جو چیزیں قیصر کی ہیں وہ قیصر کو ادا کردو'' (57)

کلیسا کے زوال کے مظاہروں میں سے ایک واضح ترین مظاہرہ فرانس کے فلپ چہارم اور پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) کے درمیان کشمکش تھا۔ یہ کشمکش اس بات پر تھی کہ آیا فلپ کلیسائی حکام کے مطالبات کے تابع تھا۔اُمرا اور عوام نے بونی فیس کو پوپ تسلیم کرنے سے انکار کرنے کے سلسلے میں خطوط لکھے، اور اس کے جواب میں بونی فیس نے فلپ کو معزول کرنے کے حق کا دعویٰ کیا۔آخر کار فلپ کی طرف سے پاپائیت کو کچل دیا گیا۔اس نے بونی فیس کے جانشین کلیمنٹ پنجم (Clement V) (عہد 1314-1305) کو ہرا کر، بونی فیس کے، فرانس پر پاپائی حاکمیت کے دعوؤں کی معافی مانگنے پر مجبور کر دیا، بعد ازاں پاپائیت فرانسیسی بادشاہ کے زیرِ نگین آ گئی، اور پاپائیت کا منصب 1309 سے 1377 تک اے وِگنن (Avignon) منتقل ہو گیا۔

آخر کار، انگلستان، فرانس اور جزیرہ نمائے آئبیریا میں اور قدرے کم تر حد تک اٹلی اور جرمنی میں قومی بادشاہوں کے ظہور نے کلیسا کی اقتدار کی جواز بخشی کی طاقت کو مزید کم کر دیا۔ یہ بادشاہتیں انصاف اور مالیات کیلئے نوکر شاہیوں پر، فوجی حمایت کیلئے کرایہ کے سپاہیوں پر، اور اقتدار کی جواز بخشی اور قانون کیلئے پارلیمانیوں پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرتی تھیں۔ پارلیمان اشرافیاؤں پر مشتمل تھی .....زمیندار اشرافیہ، مقامی کلیسا کے ارکان پر اور شہری معاشی اشرافیہ پر .....ان پارلیمانوں نے بارھویں صدی کے اواخر میں سپین میں، تیرھویں صدی میں انگلستان، فرانس اور پُرتگال میں، اور اس کے جلد بعد ہی زیادہ تر باقی ماندہ مغربی یورپ میں اپنے آپ کو منظّم کیا۔58 پارلیمان پالیسی سازی میں کچھ اہمیت کے بدلے میں حکمرانوں کو جوازِ اقتدار بخشتی تھیں اور اُنہیں مالی مدد بھی مہیا کرتی تھیں۔ پارلیمانیں آخر کار وہ بنیادی ادارے بن گئیں، جن کے ذریعے معاشی اشرافیہ، کلیسا کی قیمت پر پالیسی سازی میں اثر ورسوخ حاصل کرتی تھیں۔ان تبدیلیوں نے حکمرانوں کو وسیع وسائل اور جبری طاقت تک رسائی دی۔ نتیجتاً، مغرب یورپ کے حکمرانوں کو، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، مذہبی جواز بخشی کی ضرورت کم ہو گئی۔مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے برعکس، مغربی یورپ کے حکمران، سرکردہ مذہبی حکام کے احکام کو نظر انداز کرنے کا



اختیار رکھتے تھے، کیونکہ کلیسا کے پاس حکمرانوں کو ''بنانے'' یا ''معزول کرنے'' کی اہلیت کمزور تھی۔عیسائیت کا ایسا کوئی اصول نہیں تھا جو یہ دعویٰ کرتا کہ کسی عیسائی حکمران کو عیسائی فرامین کے مطابق حکومت کرنا ہے۔ مذہبی اور دُنیاوی، دو مختلف دائرے تھے، جن میں ہر ایک کو اپنے اپنے قوانین اور پالیسیوں پر اختیار تھا۔

لہٰذا قرونِ وسطیٰ کی یورپی تاریخ، اُس ڈھانچے کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے جو پچھلے باب میں پیش کیا گیا تھا کلیسائی اقتدار کی جواز بخشی کی اہلیت ابتدائی طور پر ہی اس کے اسلامی مثیل سے کمزور تر تھی۔لہٰذا جب قرونِ وسطیٰ میں ایک مرتبہ کاروبار دوبارہ زندہ ہوا اور سیکولر قانون کا ظہور ہوا، تو مذہب کی اقتدار کی جواز بخشی کی اہمیت کم ہو گئی۔ان پیشرفتوں نے حکمرانوں کو، کلیسا سے باہر توسیع اقتدار کا ایک موثر ذریعہ دے دیا، اور حکمرانوں نے سارے قرونِ وسطیٰ کے عہد کے دوران ان توسیعی کارندوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔

www.MashalBooks.org

# مقدّروں کا پلٹا

1200 تک، مشرقِ وسطیٰ، مغربی یورپ کی نسبت معاشی، ٹیکنولوجیاتی اور سائنسی لحاظ سے ترقی یافتہ تھا۔ کسی نہ کسی مقام پر ''مقدروں کا پلٹا'' واقع ہوا۔ جس میں مغربی یورپ نے ان تمام محاذوں پر واضح طور پر سبقت حاصل کر لی۔ یہ باب ایک ایسے امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مقدروں کا یہ پلٹا ان ادارہ جاتی اختلافات سے ظہور پذیر ہوا، جو پندرھویں صدی کے آغاز تک واضح ہو چکے تھے۔ مغربی یورپ میں کلیسا کی، حکمرانوں کے اقتدار کو جواز بخشنے کی قوت اس وقت کم ہو گئی جب سیکولر قائدین کلیسا کے مقابلے میں روز بروز زیادہ طاقتور ہوتے گئے۔ یقیناً اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران طاقتور نہیں تھے۔ بلاشبہ عباسی، فاطمی، مملوک، اور عثمانی سلطان اپنے یوروپی مثیلوں کی نسبت بہت زیادہ طاقتور تھے۔ لیکن ٹھیک یہی نکتہ ہے۔ یہ مسلمان حکمران مضبوط تھے، لیکن یہ چیز کہ انہوں نے یہ مضبوطی کیسے حاصل کی، مغربی یوروپی حکمرانوں سے مختلف تھی، خاص طور پر کاروباری انقلاب کے بعد۔

حکمرانوں کی طرف سے استعمال کیا گیا مذہبی جوازِ اقتدار کا درجہ ہی وہ واحد چیز نہیں ہے، جو طویل مدتی معاشی ترقی کیلئے اہمیت رکھتا ہے۔ نا ہی مذہبی جواز اقتدار کی کمزوری ہی وہ واحد وجہ ہے۔ جس سے یورپ آخر کار آگے بڑھ گیا۔ تاہم ایسی دُنیا کا تصور کرنا ناممکن ہے جہاں ان تبدیلیوں کے بغیر مغربی یورپ کے کچھ حصے تو آگے بڑھ گئے لیکن مشرقِ وسطیٰ آگ نہ بڑھ سکا۔ وہ ادارہ جاتی تبدیلیاں جنہوں نے مغربی یورپ میں مذہبی جواز بخشی اقتدار کی اہمیت کو کم کیا، بعض مغربی یورپی معیشتوں کے آگے بڑھنے کی ایک لازمی شرط تو تھیں لیکن کافی وجہ نہیں تھیں۔ اگر یہ بیان صحیح ہے، تو یہ اس بات کی وضاحت مہیا کرتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی معشتیں کیوں اُس حد تک آگے نہ بڑھ سکیں جس حد تک یوروپی معشتیں بڑھیں، کیونکہ اُنہوں نے ان ''ضروری شرائط'' کو کبھی پورا نہ کیا۔ یہ باب اس بیان کی تائید کرتا ہے۔ یہ عثمانی کاروباری طبقات کیلئے سیاسی طاقت



کی کمی کے اسباب اور نتائج کا تجزیہ کرتا ہے۔

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ عیسائی اور اسلامی مذہبی اداروں کا تنظیمی ڈھانچہ غیر اہم ہے۔ ایک حقیقت جس پر اس سے پہلے سرسری طور پر نگاہ ڈالی گئی ہے یہ ہے کہ رومن کیتھولک چرچ، کسی بھی کسی چیز سے جو سُنی اسلام میں کبھی موجود رہی ہے زیادہ مرکزیت کا حامل اور زیادہ منظّم ہے۔ ان ساختیاتی اختلافات نے یقیناً، مغربی یورپ مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی اور سیاسی حکام کے درمیان تعلق کو متاثر کیا۔ مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں کوئی چیز، مذہبی اور سیاسی حکام کے درمیان رسمی فوجی کشاکش کے قریب کی نہ تھی جو اُن اطالوی جنگوں سے مماثل ہو، جن کو اس باب کے شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات واضح نہیں ہے کہ ان اختلافات نے کس طرح مغربی یورپ کی معاشی قوس کو فائدہ پہنچایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی مشرقِ وسطیٰ کے حکمران کیلئے کسی ایسے مذہبی حاکم کو تلاش کرنا آسان تر تھا، جو اس کے قوانین اور پالیسیوں کی حمایت کرتا، کیونکہ ایسے متعدد حکام موجود تھے جن میں سے حکمران انتخاب کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا یہ بھی مطلب تھا کہ، باقی تمام چیزوں کے یکساں ہوتے ہوئے، رومن کتھولک چرچ، اقتدار کی جواز بخشی کیلئے کسی واحد، غیر مرکوز اسلامی مذہبی حاکمیت کی نسبت زیادہ طاقتور تھا۔ کلیسا ایک بین یوروبائی ادارہ تھا; اسلامی مذہبی حکام کے پاس اثر و رسوخ کی اس کی لگ بھگ وسعت نہ تھی۔ اگرچہ یہاں نکتہ یہ ہے کہ باقی سب کچھ برابر نہ تھا باوجودیکہ، کلیسا کے تنظیمی ڈھانچے نے اس اقتدار کی جواز بخشی کی اپنے اسلامی مثیل کی نسبت زیادہ اہلیت دے دی، لیکن یہ پھر اقتدار کی جواز بخشی کا کمزور تر ذریعہ تھا کیونکہ عیسائیت میں مذہبی حکومت کی اصولی بنیاد کمزور تھی۔

اب تک اس کتاب نے بنیادی طور پر عمومیت میں گفتگو کی ہے، اور ایک ڈھانچہ پیش کیا ہے کہ کس طرح توسیع اقتدار کے مختلف انتظامات مختلف معاشی نتائج کا سبب بن سکتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ یہ کہ یہ انتظامات مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں کس طرح ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس باب میں پیش کی گئی تواریخ کلاں سطح کی ہیں، جو ایک ہزار سال یا اس سے الگ بھگ کلیسا ریاست کے تعلقات کے بڑے بڑے واقعات کا جائزہ لیتی ہیں۔ کلاں تاریخ مظہر پر توجہ مرکوز کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ یہ اس ڈھانچے کی قابلِ آزمائش پیش بینیوں کو جھٹلانے کا ایک موقع مہیا کرتا ہے: اگر مذہبی جواز بخشی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی یورپ میں طاقتور اور مشرقِ

وسطیٰ میں کمزور ہو جاتی، تو آدمی اس ڈھانچہ کی صداقت پر اعتراض اُٹھا سکتا تھا۔ متعلقہ کلاں تاریخ اس لئے بھی اہم ہے کہ کیونکہ ''مقدروں کا پلٹا'' ایک کلاں مظہر ہے، اور یہی چیز ہے جسے یہ کتاب بالآخر واضح کرنا چاہتی ہے۔ تاہم، کلاں تاریخ پر توجہ مرکوز کرنے کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ یہ اُن خورد میکانیوں کے تجزیوں کی گنجائش نہیں رکھتی، جو ان نتائج کو تحرک دیتے ہیں جن کی پیش بینی ڈھانچہ کرتا ہے۔ اگلے دو ابواب اس مسئلے کا علاج کرتے ہیں اس طرح کہ وہ دو اہم قوانین کے مختلف ارتقا کا تجزیہ کرتے ہیں: قرضوں پر سود لینے کی جائزیت اور چھاپہ خانے کی۔ جبکہ ادارہ جاتی اختلاف کی عمومی کہانی، خصوصی قوانین کے اختلاف سے زیادہ اہم ہے، یہ خورد تاریخیں بہت زیادہ تفصیل سے اس بات پر روشنی ڈالتی ہیں کہ اختلاف کیوں اور کیسے پیدا ہوا۔



www.MashalBooks.org

# حصہ دوم

## نظریے کا اطلاق: مغرب کیوں امیر ہوا اور مشرقِ وسطیٰ کیوں نہ ہوا



www.MashalBooks.org

# (4)

# سود لینے پر پابندیاں

1850ء کی دہائی سے پہلے، مڈل ایسٹرن ''بینک'' جیسی کوئی چیز نہ تھی، جو وہ بنیادی ترین سرگرمیاں بھی کرتی، جنہیں ہم بینکنگ کے ساتھ منسلک کرتے ہیں: رقمیں وصول کرنا اُن رقموں کو بطور قرض دینا اور سرمایہ کی مارکیٹوں میں سرمایہ لگانا۔ بلاشبہ، مشرقِ وسطیٰ میں رقم اُدھار دینے والے تھے..... یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس کی تاریخ قبل از اسلام تک جاتی ہے.....لیکن کوئی پیچیدہ تنظیمیں موجود نہیں تھیں جو فوری طور پر سرمایہ کے ضرورت مند اُدھار لینے والوں اور وسائل سے مالا مال اُدھار دینے والوں کو ایک دوسرے کے سامنے بدل سکتیں۔ رقم اُدھار دینے کا عمل جہاں واقع ہوتا تھا، وہ عموماً چھوٹی رقموں کیلئے ہوتا تھا اور اکثر اوقات ایسے دو افراد کے درمیان ہوتا تھا جو ایک دوسرے کو جانتے تھے۔(1)

اس چیز نے مشرقِ وسطیٰ کی معاشی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ پیدا کی۔ ایک ایسے بینکنگ نظام کے بغیر جو وسائل کو اکٹھا کرنے کے قابل ہو، بڑے پیمانے پر قرض لینا عملاً ناممکن تھا۔ صاحبِ معیشت کاروباری لوگ اپنی خواہشات کو لازماً چھوٹا رکھتے تھے، تا آنکہ وہ اتفاق سے کسی ایسے شخص کو جان لیتے جس کے پاس بہت ساری دولت ہوتی اور جو اُن کے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنے پر رضامند ہوتا۔ مکمل طور پر فعّال مالی مارکیٹوں کی عدم موجودگی میں، کاروباری لوگ اپنا سرمایہ کسی ایسی چیز میں نہیں رکھ سکتے تھے جو اس کے بہت کارآمد استعمال کے قریب بھی ہوتی۔ اسے بہت سی صدیوں پر پھیلے ہوئے اُن لاکھوں لوگوں سے ضرب دیجئے تو یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں رہے گا کہ جدید بینکنگ سے ملتی جُلتی کسی چیز کی عدم موجودگی کا مشرقِ وسطیٰ کے معاشی حالات پر



کتنا زیادہ نقصان دہ اثر ہوا ہوگا۔

مشرقِ وسطیٰ میں کیوں کبھی کوئی دیسی قسم کی بینکنگ کی شکل پیدا نہ ہوئی؟ یہاں تک کہ جب 1850ء کی دہائی میں سلطنتِ عثمانیہ میں بینک اُبھرے بھی تو اُن کے مالک یوروپی تھے۔ مغربی یورپ کے ساتھ موازنہ خاص طور پر برمحل ہے۔ جدید بینکنگ مغربی یورپ میں جدّت طرازیوں کے ایک سلسلے کے نتیجے میں پیدا ہوئی.....شراکت داری کی کچھ قسمیں، خاندانی فرمیں، شاخیں، ہُنڈیاں، محدود ذمہ داری، اور مشترکہ سرمایہ کی کمپنیاں قرونِ وسطیٰ اور ابتدائی جدید ادوار میں، یہ جدّت طرازیاں کیوں مغربی یورپ میں شروع ہوئیں اور مشرقِ وسطیٰ میں کیوں نہیں؟

مشرقِ وسطیٰ کی زیادہ تر تاریخ میں بینکوں کی عدم موجودگی، اس بات کا نتیجہ نہ تھی کہ بینکنگ اسلام کے خلاف تھی۔ درحقیقت 1970 کی دہائی کی ابتدا سے اسلامی بینکنگ کا عروج اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ بینکنگ اسلامی ماحول میں پھل پھول سکتی ہے 2016 سے لے کر بینکنگ کھربوں ڈالر کی صنعت ہے اور قطر، سعودی عرب، انڈونیشیا، ایران، ترکی اور بہت سے غالب مسلم اکثریت والے ملکوں میں بہت مقبول ہے۔ اسلامی بینکنگ بہت عمومی خصوصیات مغربی بینکنگ سے حاصل کرتی ہے۔ (2) لیکن یہ متعدد منفرد عناصر بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اسلامی بینکنگ بعض قسم کی خلافِ اسلام سرمایہ کاریوں کی ممانعت کرتی ہے۔ زیادہ مشہور بات یہ ہے کہ قرضے ''بلاسود'' ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قرض دینے والے ادائیگی کے بغیر قرضے دیتے ہیں.....تمام مقاصد اور اداروں کے باوجود، قرضوں کا سود ہوتا ہے، لیکن یہ کسی ایسی ترکیب کے تحت ہوتا ہے کہ جو سودا کاری کی قانون کے بیان کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ اور سود سے بچنے کے دوسرے میکانئے بھی کثرت سے ہیں، مثال کے طور پر اگر ایک شخص کوئی مکان خریدنے کے لیے رہن کے برابر رقم حاصل کرنا چاہتا ہے، تو ایک اسلامی بینک ایک مکان خریدے گا اور ''قرض لینے والے'' کو مارکیٹ سے زیادہ قیمت پر فروخت کردے گا، جو اقساط میں قابلِ ادائیگی ہوگی۔ ایسا سودا عملاً رہن کے برابر ہوگا؛ لیکن یہ قانونی طور پر اسلامی قانون کے مطابق ہے۔

یہ باب اس پریشان کُن رائے کا جزوی جواب مہیا کرتا ہے کہ اسلام کے پھیلاؤ سے چار صدیاں پہلے کے دوران، اپنی معاشی ''برتری'' کے باوجود مشرقِ وسطیٰ میں بینکنگ مقامی طور پر نہ اُبھری۔ بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ مغربی یورپی مالی نظام بمقابلہ مشرقِ وسطیٰ کا مالی نظام کی آخری

www.MashalBooks.org

پیچیدگی اس وجہ سے ہے کہ اوّل الذکر میں سود لینے پر سے پابندی ہٹالی گئی جبکہ موخرالذکر میں یہ نہ ہٹائی گئی۔

لیکن مغربی یورپ میں سود مخالف قوانین کی کمزوری اور مالی نظام کی ترقی کے درمیان تعلق اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ یہ سطحی طور پر نظر آتا ہے۔ بات محض اتنی نہیں ہے کہ سود کی اجازت دینا مالی ترقی کے برابر ہے اور سود پر پابندی لگانا مالی پسماندگی کے۔ یہ تعلق دو وجوہات کی بنا پر پیچیدہ ہے۔ اوّل، سود پر پابندی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ سود پر قرض دینا بند کردیں گے۔ انسان بڑے ہوشیار ہیں؟ اگر کسی ممنوعہ کام کیلئے خاصی طلب ہو، تو کوئی نہ کوئی ایک آس پاس میں کام تلاش کرے گا۔ اور بلاشبہ، ابتدائی اسلامی دور سے ہم جانتے ہیں کہ سود پر قرض دینے کا بہانہ بھرنے کیلئے بہت سی ترکیبیں گھڑی گئیں، جس میں قانون کے الفاظ کی پیروی کی جاتی تھی، ان میں سے مشہور ترین دوہری فروخت ہے، جس میں متوقع قرض دار قرض خواہ کو کوئی جنس نقد کے عوض بیچتا ہے، پھر فوری طور پر زیادہ رقم کے عوض جو بعد میں قابل ادائیگی ہوتی ہے اسے واپس خرید لیتا ہے۔ اگر سود کی پابندیوں سے اتنی آسانی سے بچا جاسکتا تھا، تو پھر یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا اُن کا کوئی عملی اثر تھا بھی سہی۔ اس وجہ سے کچھ علما نے یہ استدلال کیا ہے کہ سود کی پابندیوں ''کا تعلق معاشی تاریخ سے کم اور خیالات کی تاریخ سے زیادہ ہے۔''(3)

یہ باب یہ خیال پیش کرتا ہے کہ ایسے دلائل صحیح طریقے سے اُن ''راستے پر منحصر'' نتائج کی توجیہہ پیش نہیں کرتے، جو مغربی یورپ میں سود پر پابندیوں کی نرمی سے پیدا ہوئے۔ اسی طرح اس کے بالعکس یہ اُن نتائج کی صحیح توجیہہ پیش نہیں کرتے جو مشرقِ وسطیٰ میں۔ رسمی سود کی پابندیوں کے تسلسل کی وجہ سے راستہ اختیار نہ کرنے کے ہیں۔ راستے پر منحصر نتائج کا کھوج لگانا مشکل ہوسکتا ہے۔ کیونکہ نتائج تعریف کے لحاظ سے بنیادی اسباب سے بہت دور ہوتے ہیں۔ یہ باب ایسے ایک نتیجے کا کھوج لگاتا ہے: مغربی یورپ کے مالی اداروں کی طویل فاصلوں تک شاخیں بننے میں بڑھوتری۔ شاخیں بننا ایک ایسا عمل ہے، جس سے دولت کا ایک مرکزی مالک دوسرے بہت سے دفاتر سے لین دین کرتا ہے (جیسا کہ شاخوں سے) جو مختلف جگہوں پر کاروبار کرتے ہیں: بہت سے جدید بڑے بڑے بینک اس قسم کی تنظیم کو استعمال کرتے ہیں۔ شاخیں بننے کا عمل دورِ وسطیٰ کے اواخر میں یورپ میں ٹھیک اُن محرکات سے اُبھرا، جو مغربی یورپ میں سود



کی پابندیوں کی نرمی کے ساتھ منسلک تھے، اگرچہ غیر واضح راستوں سے۔ یہ مغربی مالیات کی بڑھوتری میں ایک بنیادی پیش رفت تھی، اور یہ اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ تاجروں اور قرض خواہوں نے اُن محرکات کے مطابق عمل کیا، جو اُن پر اردگرد کے اداروں کی طرف سے عائد کئے گئے تھے۔ اس قسم کی جدّت طرازی مشرقِ وسطیٰ میں ناقابلِ تصور تھی، کیونکہ اداروں کی ایسی تعمیر جیسی کوئی چیز، جس نے مغربی یورپ میں شاخیں بننے کی سہولت کاری کی مشرقِ وسطیٰ میں کبھی ظہور پذیر ہوئی۔ بات کی وضاحت کیلئے، کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سود کی پابندیاں بوجھل تھیں کیونکہ وہ کسی قسم کے اُدھار دینے کو روکتی تھیں: مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ دونوں جگہوں پر لوگوں نے پابندیوں سے بچنے کے راستے تلاش کرلئے تھے۔ اور وہ عموماً اُن لوگوں کو اُدھار دیتے تھے جنہیں وہ جانتے تھے۔ یہاں دعویٰ یہ ہے کہ اُس طریقے نے جس میں لوگ پابندیوں سے بچنے کے طریقے اختیار کریں، اُن ادارہ جاتی پیشرفتوں کو تیز کردیا جو لمبے عرصے والی تنظیموں کی طرف سے بڑے پیمانے پر قرض دینے سے وابستہ تھیں ......جنہیں آج کل ہم بینکنگ کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ تنظیمیں مشرقِ وسطیٰ کے مقابلے میں مغربی یورپ میں زیادہ پیچیدہ ہوگئیں، لہٰذا تنظیمی اختلافات ایک راستے پر منحصر طریقے پر خودبخود پیدا ہوگئے، اس طرح کہ وہ جو کبھی چھوٹے اختلافات تھے، بڑھ کر بڑے اختلافات بن گئے۔

سود کی پابندیوں میں نرمی اور معاشی ترقی کے درمیان تعلق کے پیچیدہ ہونے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ کسی بھی توضیح کو اس بات کو مدِنظر رکھنا پڑے گا کہ سود کی پابندیوں میں نرمی پہلے پہل مغربی یورپ میں کیوں واقع ہوتی اور مشرقِ وسطیٰ میں کیوں نہ ہوئی۔ اگر ابتدائی قرونِ وسطیٰ میں کوئی خطہ ایسا تھا، جہاں سود کی پابندیوں پر نرمی کی طلب بہت زیادہ تھی، تو وہ مشرقِ وسطیٰ تھا نہ کہ مغربی یورپ۔ یہ وہ مقام ہے جہاں باب دوم میں تجویز کیا گیا ڈھانچہ اس بات کی وجدانی رہنمائی مہیا کرتا ہے، کہ یہ مغربی یورپ کیوں تھا اور مشرقِ وسطیٰ کیوں نہ تھا، جہاں سود کی پابندیاں آخرکار نرم کی گئیں۔

سود کی پابندیوں کا تجزیہ کرنا کچھ اور وجوہات کی بنا پر بھی ضروری ہے، جو مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے معاشی نظاموں پر اُن کے دیرپا اثر سے آگے ہیں۔ یہ معیشتوں کے دوسیٹوں کے درمیان موازنے کیلئے ایک عمدہ نکتہ مہیا کرتے ہیں، کیونکہ یہ، قرونِ وسطیٰ کے زیادہ تر عرصے تک

www.MashalBooks.org

اسلام اور عیسائیت دونوں میں حاوی تھیں، پابندیوں کے دونوں سیٹ ابتدائی طور پر ایک جیسی وجوہات کی بناپر وجود میں آئے، کیونکہ حکمرانوں اور مذہبی حکام دونوں نے ایک ایسے معاشی تناظر میں یہ پابندیاں عائد کیں، جہاں زیادہ تر قرض بنیادی طور پر خرچ کے مقاصد کیلئے لیا جاتا تھا۔ اس ماحول میں، قرض دار اکثر اوقات غریب ہوتے تھے یا حال ہی میں کسی منفی معاشی واقعے کا شکار ہوتے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ یا تو خراب فصلوں کی وجہ سے فاقہ کشی کو روکنے کیلئے قرض لیتے تھے یا آنے والے سال کی فصل کیلئے کافی بیج مہیا رکھنے کیلئے۔ یہ قرض دار عموماً انتہائی زیادہ شرح سود پر قرض لیتے تھے، جو عموماً زندگی بھر کی قرضداری پر منتج ہوتے تھے یا اس سے بھی زیادہ بُری صورتِ حال پر، جیسا کہ بچوں کو غلامی کیلئے بیچ دینے پر کیونکہ سماجی تحفظ کے جال کمزور تھے اور نقصان کی صورت میں بیمہ کی مارکیٹیں غیر موجود تھیں، لہٰذا سود پر پابندی کی مذہبی شقیں ہمسایوں کے درمیان بلاسود قرض دینے کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں اور زیادہ سود والے قرضوں کی طلب کی حوصلہ شکنی کرتی تھیں۔(4)

تاہم، جب سرمایہ کاری کیلئے قرضداری قابلِ عمل ہوگئی تو سود کی پابندیوں نے ایک بہت مختلف قسم کی رُکاوٹوں کا ایک سیٹ عائد کردیا۔ ان شرائط کے تحت، سود پر یکسر پابندی نے باہمی طور پر طے شدہ اُن سودوں کو روک دیا جن میں مناسب قسم کا سود شامل ہوتا تھا اور اس طرح معاشی بڑھوتری کو روک دیا۔ تاہم سود کی پابندیاں دونوں مذاہب میں کاروباری توسیع کے باوجود، صدیوں تک قائم رہیں۔ سود کی پابندیوں کا دونوں مذاہب میں قائم رہنا ایک ایسا معمہ ہے جس کا کوئی واضح جواب نہیں ہے۔ دونوں مذاہب میں، کاروبار کے حق میں نئی تشریحات وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، لہٰذا اس کا جواب محض یہ نہیں ہوسکتا کہ کچھ مذہبی فرامین کی نافرمانی ہوتی تھی یا مذہب کاروبار کے خلاف تھا۔ وہ سوالات جو جواب چاہتے ہیں یہ ہیں: سود کی پابندیاں مشرقِ وسطیٰ میں مغربی یورپ کی نسبت زیادہ عرصے تک کیوں قائم رہیں؟ کیا پچھلے ابواب میں تجویز کیا گیا ڈھانچہ ان اختلافات پر روشنی ڈالتا ہے؟ ان پابندیوں کا حتمی معاشی اور ادارہ جاتی اثر کیا تھا؟ یہ باب ان سوالات کا جواب دیتا ہے۔ تاہم پہلے کچھ تاریخی پسِ منظر ضروری ہے۔



## اسلامی ممانعتِ سود کی تاریخ

قرضوں پر سود لینا ہمیشہ سے اسلام میں ایک گناہ رہا ہے۔ قرآن میں ربوا کے گناہ ہونے کی تفصیل بیان کرنے والے بہت سے اقتباسات ہیں، جو کہ قبل اسلام کا ایک سودی عمل تھا جس میں قرض خواہ قرض کے اصل زر کو دُگنا پھر دوبارہ دوگنا کر دیتا تھا جب کوئی قرضدار اس کا وقت پورا ہونے پر اسے ادا نہ کرسکتا۔(5) اس کا نتیجہ عملی طور پر قرضدار کیلئے غلامی تھا، کیونکہ قرض ایک دفعہ ادائیگی میں ناکامی میں بڑھتا چلا جاتا تھا: لہٰذا سود لینے پر پابندیاں اس صورت سے نمٹنے کیلئے موزوں ترین طریقہ تھا، جہاں انتہائی زیادہ سود والے قرضے بڑے معاشرتی مسائل پیدا کردیتے تھے۔ ابتدائی دور کے مسلمان ربوٰ کو کسی بھی قسم کے سود کے برابر قرار دیتے تھے۔ ربوٰ کے خلاف چند قرآنی احکام میں درج ذیل شامل ہیں:

''وہ لوگ جو ربوٰ کو خرچ کرتے ہیں وہ نہیں اُٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھوڑ کر مضبوط بنالیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت اور ربوٰ ایک ہی چیز ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے۔ جو کوئی بھی اللہ کی طرف سے وعید ملنے پر باز آجاتا ہے، تو وہ اپنے ماضی کے لئے ہوئے (سود) کو لے سکتا ہے اور اُس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے؛ لیکن جو کوئی بھی دوبارہ ایسے کرتا ہے......تو وہ لوگ جہنم کے باسی ہیں، اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ربوٰ کو مٹاتا ہے اور زکوٰۃ کو بڑھاتا ہے......اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود کے بقایاجات کو معاف کردو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے، تو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف سے جنگ کیلئے تیار ہوجاؤ: لیکن اگر تم باز آجاؤ گے تو تمہیں اپنا اصل زر واپس ملے گا۔ تم نہ کسی پر ظلم کرو گے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تاہم، اگر کوئی مشکل میں ہے، تو اُسے مہلت دو یہاں تک کہ وہ ادا کرنے کے قابل ہوجائے۔ اگرچہ تمہارے لئے معاف کردینا بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔(سورۃ البقرہ:280-274)

www.MashalBooks.org

اے ایمان والو! سود پر گزارہ مت کرو، اپنی دولت کو کئی گُنا بڑھاتے ہوئے۔ خدا سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ (سورۃ العمران iii۔ 130)

وہ جسے تم ربٰو کے ذریعے بڑھانا چاہتے ہو، اُس میں اللہ کی برکت شامل نہیں ہوگی؛ البتہ وہ زکوٰۃ جو تم دیتے ہو وہ تمہیں کئی گُنا لوٹائی جائے گی۔ (سورۃ الرّوم xxx.39)

نظریاتی طور پر، سود پر مکمل پابندی نے معاشی نتائج کو نقصان دہ طریقے پر متاثر کیا ہوتا جب ایک دفعہ، اسلام کی پہلی چار صدیوں میں معاشی پھیلاؤ کے دوران سرمایہ کاری کیلئے قرض دینا قابلِ عمل ہوگیا تھا۔ تاہم عملی طور پر پابندی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سرمایہ کار سے تاجر کی طرف سرمائے کا بہاؤ بالکل ہی رُک گیا تھا۔ اس طرح کے منافع بخش ماحول میں، قرضخواہ آرام سے سود کی پابندیوں سے بچنے کے راستے تلاش کر لیتے تھے۔ تراکیب کا ایک سیٹ جسے عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا، وہ سیدھی سادی ترکیبوں پر مشتمل تھا، جنہیں حِیَل کے نام سے جانا جاتا تھا (واجلہ حیلہ)، جسے پابندی سے بچنے کی سہولت کاری کیلئے بنایا گیا تھا۔ 6 حیلہ کی ایک مشہور مثال، پہلے بیان کی گئی دوہری فروخت کی ہے، جو اس طرح کام کرتی تھی: عبدل محمود سے 50 دینار کے عوض ایک قالین خریدتا ہے، اور محمود فوری طور پر یہی قالین عبدل سے 55 دینار میں واپس خرید لیتا ہے، جو کہ ایک سال میں قابل ادائیگی ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ محمود اپنا قالین اپنے پاس رکھتا ہے۔ عبدل سے 50 دینار وصول کرتا ہے، اور عبدل کو ایک سال میں 55 دینار دینے کا پابند ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ 10 فیصد سود پر ایک قرض ہے، اس طرح کہ اس کا سود دونوں قیمتوں کا فرق ہے۔ لیکن چونکہ یہ سرکاری طور پر ایک قرض نہیں ہے، بلکہ اس کی بجائے دوہری فروخت ہے، جو دونوں ہی اسلامی قانون کے مطابق جائز ہیں، لہٰذا دوہری فروخت قانون کے لفظی مفہوم کی خلاف ورزی نہیں کرتی، بشرطیکہ 50 دینار قالین کیلئے ایک معقول قیمت ہو۔ یہ دوہری فروخت نویں صدی تک بہت عام تھی اور مسلمان مدینہ میں اسے اتنا پہلے جتنا کہ آٹھویں صدی میں اسے استعمال کرتے تھے۔ (7)

سود کی پابندیوں سے بچنے کی دوسری صورتیں بھی عام تھیں۔ مثال کے طور پر ایسی دستاویزات موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ تیونس میں بارھویں صدی میں بہت سے قرض اور خریداریاں تھیں جن میں قرضخواہ، کرنسی کی مختلف اشکال میں تبادلہ کر کے منافع بناتے تھے 8 عثمانی



دور (1923-1299) میں، سودا کاری کی ایک عام شکل استگلال تھی، جو قرضدار کو ایسے ملوث کر لیتے تھے کہ وہ قرضخواہ کو غیر منقولہ جائیداد کا کوئی ٹکڑا دے دیتا تھا، جو مفروضہ طور پر بطور فروخت ہوتا تھا، لیکن درحقیقت یہ ایک رہن ہوتا تھا۔ معاہدوں کی ایسی شکلیں عثمانیوں سے بہت پہلے عام تھیں، اور حِیَل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے، کیونکہ کاروباری سودا کاری زیادہ پیچیدہ ہوتی گئی۔

مذہبی عمال محض حیل کی اجازت دینے سے آگے چلے گئے: وہ حِیَل کی تخلیق کرنے میں بھی عملی حصہ لینے لگے۔ اتنا پہلے جتنا کہ دوسری اسلامی صدی، مذہبی عمّال نے حِیَل کی مختلف شکلوں کو پہنچاننے اور ان کو تشکیل دینے پر مقالے لکھے۔ 9 حکام نے اس طرح رواج پذیر کاروباری قانون کو اسلامی قانون (شریعہ) سے ہم آہنگ کر دیا اگرچہ حِیَل کی جائزیت، وقت اور جگہ کے لحاظ سے مختلف ہوتی رہی، خاص طور پر مختلف فقہی مکاتبِ فکر میں، لیکن عام طور پر اُنہیں سرکردہ ماہرینِ قانون کی طرف سے منظوری کی سند مل جاتی تھی۔

یہ کوئی اتفاقی امر نہیں ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کا عروج، حِیَل کے ذریعے اسلامی قانون کی بڑے پیمانے پر تعبیرات نو کا بھی دور تھا۔ سود کے قانون کی تعبیرِ نو کے تسلسل نے کاروبار کو پھلنے پھولنے کی اجازت دینے میں ایک کردار ادا کیا: زیادہ سودے واقع ہوتے اور لمبے فاصلوں کی تجارت بھی عام اور نفع بخش ہوگئی۔ پہلی چار اسلامی صدیوں میں قانونی لچک ہر جگہ موجود تھی اور اس کا نتیجہ معاشی ترقی تھا۔

یہ سب کچھ چوتھی اسلامی صدی کے اختتام کے قریب کسی مرحلے پر تبدیل ہوگیا۔ اسلامی قانون میں سود کی پسپائی پر مزید پیشرفتوں کی شہادت، اور اس کے نتیجے میں ایسے سودوں کا ہونا جن میں برملا ضمانت شدہ سود شامل ہو دورِ وسطیٰ کے اسلام میں کاروباری اُدھار کو وسیع کرنے کا کوئی عام ذریعہ نہیں تھے۔

یہ بھی کوئی اتفاقی امر نہیں تھا، کہ سود کے قانون کی تعبیرِ نو میں سُست رفتاری، ضرب المثل ''اجتہاد کے دروازے بند ہونے'' کے ساتھ بیک وقت واقع ہوئی، جس سے ہر قسم کے قوانین کی اسلامی تعبیر نو بہت زیادہ سست رفتاری کا شکار ہوگئی۔ بارھویں صدی کے وسط تک، سود سے مشروط معاہدے بھی موجود تھے، لیکن فریقین یا تو کسی اور طرح کے معاہدے کے ذریعے ٹیکس وصول

www.MashalBooks.org

کرتے تھے یا سود کو کسی اور طرح سے چھپا لیتے تھے(10) اگر فریقین سود کی ادائیگی کو نہ چھپاتے، تو ایک فریق دوسرے کو عدالت میں لاسکتا تھا، جہاں یہ سودا، بغیر مزید قانون نتیجے کے قابلِ ابطال ہوتا تھا۔

عثمانیوں نے اس سے زیادہ سیدھے سود کے حامل قرض دینے کی اجازت دے دی۔ مثال کے طور پر، عثمانی مفتیِ اعظم ابوسعود (C.1490-1574) نے، ملائم پیرائے کے ناموں ''سودا'' یا ''قانونی سودا'' کے تحت معتدل سُود پر قرض دینے کی اجازت دے دی۔ وہ 15 فیصد سے زیادہ وصول کرنے کو ایک جُرم سمجھتا تھا، لیکن وہ مستثنیات کی اجازت کھلے دل سے دیتا تھا۔(11) تیمور کُران کی طرف سے جمع شدہ (2013) اور کُران اور روبن کی طرف سے استعمال کئے گئے (2017) اعداد وشمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ استنبول میں سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں معتدل سود لینا معمول تھا.....نجی قرضوں پر حقیقی سود 19 فیصد کے لگ بھگ تھا.....اگرچہ معاہدے عام طور پر کسی نہ کسی ترکیب کا حوالہ دیتے ہیں۔ اسی طرح اناطولیائی قیصری کے سترھویں صدی کے عدالتی ریکارڈوں کے مطالعہ میں، رونلڈ سی جینگز (Ronald C.Jennings) بیان کرتا ہے کہ قرض خواہ، اسلامی قانون کے مطابق اور سیکولر قانون کے مطابق، اور ججوں کی عدالت، مذہبی علما اور سلطان کی منظوری اور اجازت سے، اُدھار پر باقاعدگی سے سود وصول کرتے تھے۔ لیکن جینگز یہ رائے دیتا ہے کہ تقریباً تمام سود کے حامل سودے کسی نہ کسی قسم کی ترکیب استعمال کرتے تھے۔ (12) یہی بات سترھویں صدی میں، اہم کاروباری شہر برصہ کے بارے میں بھی صحیح ہے: 10 سے 15 فیصد کی حد کے درمیان سود جائز تھا، لیکن فریقین بنیادی طور پر ایسے سودے کسی نہ کسی ترکیب کے ذریعے کرتے تھے۔

یہ بات ممکن نہیں ہے کہ زیادہ تر قرض خواہ ایسی تراکیب کی طرف رجوع کرتے۔ بہت سی عالمانہ تصانیف یہ ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی قانون کے بارے میں زبانی جمع خرچ.....بجائے حقیقی طور پر ترکیب کو استعمال کرنے کے..... پوری سلطنتِ عثمانیہ میں جاری وساری تھا۔ مثال کے طور پر، وقف کے متولّیوں کی طرف سے قرضداروں سے ضمانت طلب کی جاتی تھی جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ براہِ راست سود پر قرض دیتے تھے۔ عدالتیں برصہ میں نقدی اوقاف کی طرف سے استعمال کی جانے والی قانونی دستاویزات کو تسلیم کرتی تھیں، لیکن اُن کی نسبتاً مستقلِ منافع جات یہ ظاہر



کرتے ہیں کہ معاشی مفاد ہی غالب تھا۔(13)

اسلامی تاریخ کے زیادہ تر حصے میں سود پر قرض دینا بغیر کسی سزا کے خوف کے واضح طور پر ممکن تھا۔ جب تک فریقین کوئی حیلہ اختیار کرتے تھے، عدالتیں سودے کی پُشت پناہی کرتی تھیں، کہ کہیں قرض دار مکر نہ جائے۔ تاہم، محض اس حقیقت کا کہ حیلے کے ذریعے قرض دینے کا عمل ایسے دو افراد کے درمیان ہوتا تھا جو ایک دوسرے کو جانتے تھے، یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ چیز بینکوں جیسی بڑے پیمانے کی تنظیموں کی ترقی کیلئے مفید تھی۔ اس غرض کیلئے کہ عدالت کسی حیلے کی پُشت پناہی کرے، فریقین کو حقیقتاً حیلے کو مکمل کرنا پڑتا تھا۔ محض دوستوں یا ہمسایوں کیلئے ہی یہ ممکن تھا کہ وہ ایسا کرنے سے احتراز کریں، کیونکہ معاشرتی پابندیاں ہی ایک مضبوط محرک مہیا کرسکتی تھیں کہ وہ دو فریق جو ایک دوسرے کو جانتے تھے قرض کو واپس کریں۔ یہی بات بینکوں جیسی بڑی تنظیموں کیلئے صحیح نہیں ہے، جہاں قرض خواہ مستقبل کے خریداروں کو بہت کم جانتے ہیں، کسی حیلے کو نامعلوم تعلقداروں کے ساتھ بڑی بڑی رقموں کے لئے مکمل کرنا، قرض دینے کو بہت زیادہ غیر محفوظ اور مہنگا بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے حیلے کو رو بہ عمل لانے کیلئے سرمائے کا زیادہ خرچہ، زیادہ نگرانی تاکہ قرضدار حیلے کے مکمل ہونے سے پہلے مکر نہ جائے، اور نادہندگی کا بہت زیادہ خطرہ کہ کہیں حقیقتاً حیلہ واقع ہی نہ ہو۔ اس نے امانتوں کی رقمیں لینے اور ان امانتوں کی رقموں پر کھلے بندوں سود لینے کو بھی بالکل ناممکن بنا دیا۔

یہ جدید بینکنگ کے لازمی اجزا سے بالکل ہی متناقض تھا۔ جدید بینک کسی نہ کسی طرح نگرانی میں ملوث ہوتے ہیں.....وہ اُدھار کھانے کے حساب کتاب کی پڑتال کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے پاس رجوع ہوتا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ قرضدار وعدے سے مکر جائے۔ جدید بینک امانتیں قبول کرتے ہیں، جو امانتیں جمع کرانے والوں کیلئے پُرکشش ہوتی ہیں کیونکہ اُن پر سود ادا کیا جاتا ہے اور بینک ان امانتوں کو زیادہ منافع بخش کاروباروں میں لگاتے ہیں.....عموماً بینک کے دوسرے صارفین کو سود پر قرض دے کر۔ یہ سرگرمیاں مشرقِ وسطیٰ دورِ وسطیٰ کے ایک سرمایہ کار کیلئے نبھانی بہت غیر محفوظ اور مہنگی تھیں۔ لہٰذا بینک کی طرح کی کوئی چیز مقامی طور پر مشرقِ وسطیٰ میں کبھی وجود میں نہ آسکی۔ نا صرف بینک غیر موجود وسائل کو جمع کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، بلکہ قرونِ وسطیٰ کے دور کی کوئی شہادت ایسی نہیں ہے، کہ کوئی افراد ایسے تھے، جن کا مکمل پیشہ بینکنگ ہو، مغربی

www.MashalBooks.org

بینکنگ سے متعلقہ بہت سے عناصر، مشرقِ وسطیٰ کے قرونِ وسطیٰ اور ابتدائی جدید دور میں بالکل معدوم تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں، قرض خواہ بنیادی طور پر شراکت داری کے ذریعے قرض دیتے تھے، جو حجم اور سرمایہ کے خرچے کے لحاظ سے چھوٹے رہتے تھے۔(14)

اوپر حوالہ دیئے گئے اعداد وشمار، بینکنگ کے فقدان کی ایک اور شہادت مہیا کرتے ہیں۔ جینگز کے عثمانیہ کے بارے میں اعداد وشمار یہ اشارہ کرتے ہیں کہ زیادہ تر قرض چھوٹے ہوتے تھے۔ قرضخواہ عموماً غریب ہوتے تھے، اور قرض خواہی انتہائی غیر مرتکز تھی۔ نہ تو بینک کا نہ ہی رقم قرض دینے والوں کا بڑا طبقہ موجود تھا۔ تمام قرضوں کا 97 فیصد افراد لیتے تھے اور تمام قرض کا 99 فیصد منفرد افراد پیش کرتے تھے۔(15) کُران کے (2013) کے عثمانی اعداد وشمار کے سیٹ میں، تمام قرضے چھوٹے ہوتے تھے اور یا تو افراد کی طرف سے یا نقدی اوقاف کی طرف سے دیئے جاتے تھے۔ نقدی اوقاف ایک عثمانی ادارہ جاتی جدّت طرازی تھی، جو بینکوں کی جگہ لے سکتی تھی۔ لیکن اس نے یہ جگہ نہ لی۔ لہٰذا یہ مزید بحث ومباحثے کا جواز بن سکتا ہے۔

وقف یا مقدّس تنظیم کا ادارہ، پہلی اسلامی صدی سے ہی موجود تھا۔ ابتدائی طور پر اوقاف کے اثاثوں کو غیر منقولہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن آٹھویں صدی کے آغاز میں اس تقاضے کو نرم کر دیا گیا، اور عثمانی دور میں، وقف کے فنڈوں کو استعمال کرتے ہوئے قرض دینے کی اجازت دینے کیلئے، مزید نرم کر دیا گیا۔(16) یہ قرض خواہ اوقاف یا نقدی اوقاف ابتدائی طور پر ایسے کام کرتے تھے: وقف کا مینیجر اس کے عطیوں کے سرمائے کو بہت سے قرضداروں میں بطور قرض تقسیم کر دیتا تھا اور اس کے سرمایہ کاری کے منافع کو سماجی اور مذہبی مقاصد کیلئے صرف کرتا تھا۔ نقدی وقف کا بانی قرض پر شرعی پابندی کی خلاف ورزی کئے بغیر منافع کماتا تھا، اس طرح کہ وہ قرض گُم پتی دار یا قانونی حیلے کے ذریعے دیتا تھا۔(17)

سرکردہ قانونی ماہرین ہمیشہ نقدی اوقاف کی منظوری نہیں دیتے تھے۔ نقدی اوقاف کیونکہ بنیادی طور پر اپنی آمدنی سود کے حامل قرضوں سے حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا یہ نزاع کو جنم دیتے تھے۔ تاہم، کیونکہ نقدی وقف عام اور مالیاتی لین دین کیلئے لازمی ہوگئے، لہٰذا قانونی ماہرین اُن کی جائزیت کو قبول کرنے کیلئے زیادہ آمادہ تھے۔ ایک واقعے نے، جسے ''نقدی وقف کے تنازعے'' کے طور پر جانا جاتا ہے، جو سولھویں صدی کے زیادہ تر حصے میں چلتا رہا، اُن کی حتمی



قبولیت حاصل کر لی۔ یہ تنازعہ 1545 میں عروج پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد کہ جب ایک قانون دان نے نقدی وقف کی ممانعت کرتے ہوئے ایک رائے جاری کی، نقدی وقف اس وقت تک اچھی طرح مضبوط ہو چکا تھا۔ مفتیِ اعظم ابوسعود نے اس رائے کی مخالفت کی، اور اُس کی رائے غالب آ گئی۔ ابوسعود کا حتمی تعلق اُس کے قانون متن سے نہیں تھا، بلکہ اُس کے ساتھ تھا جو عوامی استعمال میں تھا اور لوگوں کی بھلائی کیلئے تھا، جس کا نتیجہ واضح طور پر نقدی اوقاف کو قائم کرنے کی صورت میں نکلا۔(18)

یہ واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی قانون، کسی ''غیر اسلامی'' کام کے زبردست مطالبے کے ردِّعمل میں لچکدار تھا۔ لیکن یہ ردِّعمل .....نقدی وقف .....بھی اُن پابندیوں کا مظہر تھا جو وسیع تر سیاسی معیشت کے توازن کی طرف سے مقرر کی گئی تھیں، جہاں مذہبی حکام حکمرانوں کو حکمرانی کا جواز بخشتے تھے۔ بایزید دوم (1512-1481) کے عہد میں استنبول میں نقدی اوقاف کی تعداد مسلسل بڑھتی رہی: 1505 میں زمینی اوقاف سے زیادہ نقدی اوقاف قائم ہوئے اور 1533 تک نقدی وقف استثنا کی بجائے ایک قاعدہ بن گیا۔(19) نقدی اوقاف کی مقبولیت نا صرف بینکوں ایسے دوسرے متبادلات جو سود کی حامل طلب کو پورا کرنے کے قابل ہوتے، کے فقدان کی وجہ سے، بلکہ نقدی وقف کے اپنے مخصوص رویّوں کی وجہ سے بھی تھی، جہاں قانون دان اُن کی اجازت دیتے تھے، وہ رقم قرض دینے والوں کو اسلامی قانون کے اندر کام کرنے کی اجازت دیتے تھے۔(20)

وقف مینجر کی طرف سے شریعت کیلئے اعلیٰ قسم کے زبانی خرچ کی وجہ سے نقدی وقف، وقف کے نظام میں شمولیت کے ذریعے گناہ کے الزام سے بری کر دیا گیا۔ کیونکہ وقف کے نظام میں شمولیت کی وجہ سے اُنہیں کسی حد تک تقدّس کا درجہ حاصل ہوگیا۔ تاہم اس خصوصیت کا مطلب بھی یہی تھا کہ وہ مغربی بینکوں کی نسبت بہت زیادہ پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے، کیونکہ مینجروں کو وقف کے منافع جات کو پہلے سے مخصوص شدہ سماجی اور مذہبی مقاصد کیلئے خرچ کرنا ہوتا تھا۔ اگرچہ ان سرمایہ کاریوں نے معاشرے کیلئے خاصی بہتری کی ہوگی، لیکن، انہوں نے وقف مینجروں کو ایک نااہلیانہ طریقے سے فنڈوں کی سرمایہ کاری کرنے پر مجبور کیا، کیونکہ وہ فنڈوں کو کسی دوسرے طریقے سے انتہائی منافع بخش موقع کیلئے استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ

کہ، وقف کا قانون نقدی اوقاف کو، اپنے کاروبار کو بڑھانے اور اس کی شاخیں بنانے سے روکتا تھا، کیونکہ اُن سے یہ تقاضا کیا جاتا تھا کہ وہ کاروبار سے حاصل ہونے والی رقم کو پہلے سے مخصوص مقاصد کیلئے خرچ کریں بجائے اُس کو وقف میں دوبارہ سرمایہ کاری میں لگانے کے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عمل جس کے ذریعے ترقی، ترقی کو جنم دیتی، کچل دیا گیا، اور ایسے وقف چھوٹے ہی رہے۔ لہٰذا نقدی اوقاف کبھی کوئی۔ ایسی شکل اختیار نہ کر سکے جو دور سے بھی جدید بینکوں سے مشابہہ ہوتی۔ تاہم، ایسا عمل مغربی یورپ میں دسویں سے لے کر چودھویں صدیوں تک، اُن مختلف محرکات کی وجہ سے واقع ہوا جو سود پر قرض دینے کے ساتھ منسلک تھے۔



# سُود پر عیسائی پابندیوں کی تاریخ

اسلامی اور عیسائی، سود کی تاریخوں کے درمیان بہت سی مشابہتیں ہیں۔ دونوں مذاہب نے قبل جدید دور میں سود کی ممانعت کی۔ اگرچہ اس کی ممانعت عیسائی مذہب کا بنیادی حصہ نہیں تھی۔ چوتھی صدی سے پہلے، کلیسا نے سود کے معاملے پر بہت کم کچھ کہا۔ (21) سود پر قرض دینے کی بُرائیوں کو اختیار کرنے والا اصول ابتدائی یہودی عیسائی روایت میں موجود تھا، لیکن بائبل (New Testament) میں سود کی کوئی واضح ممانعت نہیں تھی۔ سود کی بڑے پیمانے پر مذمت چوتھی صدی کے آغاز میں شروع ہوئی، جب متعدد چرچ کونسلوں اور سائناڈز نے اسے ایک مہلک جُرم قرار دیا۔ ایلویرا (306)، کارتھیج (348-345)، لوڈیشیا (372)، ہپو (393) آرس (443) اور ٹیراگونا (516) کی 9 کلیسائی کونسلوں نے کلیسا کے لوگوں کی طرف سے سود پر قرض دینے کی ممانعت کی، اگرچہ ایک عام اصول کے طور پر اسے ایک اخلاقی فرض کے طور پر تمام عیسائیوں کو منع کر دیا گیا۔ (22) فیصلہ کُن لمحہ 325 میں آیا، جب ایک سود مخالف قانون نکائیا (Nicaea) میں ہونے والی پہلی عالمی عیسائی کونسل میں شامل کر لیا گیا۔ چھوٹی کلیسائی کونسلوں کے برعکس جن کا اطلاق صرف مخصوص علاقوں پر ہوتا تھا، اس کونسل نے ایسے عقائد وضع کئے جو ہمہ گیر طور پر لاگو ہوتے تھے، اور اس طرح اس نے سود لینے کے گناہ کو پوری عالمِ عیسائیت میں قائم کر دیا۔ (23)

پانچویں صدی کے مغربی سلطنتِ رُوما کے زوال اور دسویں صدی کے اواخر میں کاروباری انقلاب کے آغاز کے دوران، کاروبار محدود تھا، اور زیادہ تر قرض خرچ کیلئے جاتے تھے۔ نتیجتہً کلیسا کو سود کی پابندی پر دوبارہ غور کی ضرورت کم ہی تھی..... سیکولر حکام..... بشمول شارلمین۔ نے عمومی طور پر کلیسا کی طرف سے سود کی تمام مشکلوں پر پابندی کی حمایت کی۔ تاہم کاروباری انقلاب کے آغاز کے ساتھ، معاشی ماحول تبدیل ہو گیا..... جب یورپ میں تجارت بحال ہوئی، تو سرمایہ کاری کیلئے قرض دینا زیادہ اہم ہو گیا: قرونِ وسطیٰ کا مورّخ رابرٹ ایس لوپز (Roberts.

(Lopez یہ کہتا ہے کہ ''بے دریغ قرضہ کاروباری انقلاب کیلئے بہت بڑا محرّک تھا'' (24) بہت حد تک مشرقِ وسطیٰ کی مانند، اس کا مطلب یہ تھا کہ سود کی پابندیاں معاشی ترقی کیلئے ایک روک ثابت ہوئیں، سیاسی اور مذہبی حکام اس طرح متضاد اہداف کے درمیان معلّق تھے، معاشی ترقی کو آگے بڑھائے .....جس کا لازماً اُنہیں نے اپنا حصہ لینا تھا.....اور قانونی اور اصولی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے درمیان۔

مشرقِ وسطیٰ کے مذہبی حکام نے اسی طرح کی صورتِ حال کا جواب پہلی چار اسلامی صدیوں میں، گریز کی ایسی راہوں کی اجازت دے کر دیا، جنہوں نے نمایاں طور پر اصول کی حکم عدولی نہ کی۔ کلیسا نے اس کے اُلٹ نقطۂ نظر اپنایا، کم از کم ابتدائی طور پر، بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں سود کی پابندیوں کو سخت کر کے۔ کلیسا نے دوسری، تیسری اور چوتھی لیٹران کونسلوں (1179, 1139 اور 1215) میں ایسے احکام جاری کئے جنہوں نے سودخواروں کو کلیسا سے خارج کرنے پر پابندی لگادی، سودخوروں کی عیسائی قطعات زمین میں تدفین سے انکار کر دیا، اور سودخواروں کی نذروں پر پابندی لگادی۔ (25) کلیسا نے بارھویں صدی کے اواخر میں ان پابندیوں کو اور سخت کر دیا، جب پوپ یوجین سوم (Eugene III) (1145-1153) اور پوپ الیگزینڈر سوم (Alexander III) (1159-1181) نے رہن کو ممنوع قرار دے دیا، ایک اہم رخنے کو بند کرتے ہوئے جو اس پابندی سے بچنے کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔ ایلگزینڈر سوم اور اربن سوم (Urban III) (1185-1187) نے یہ قرار دیا کہ جُرم کا تعین کرنے والی چیز نیت تھی نہ کہ اُس کی ہیئت 1234 میں پوپ گریگوری نہم (Gregory IX) (1227-1241) نے اپنی ڈی کرٹیلز (Decretales) (پوپ کے فرامین کا مجموعہ) جاری کیا جس نے ہمیشہ کیلئے سودخوروں کو شہری حقوق سے محروم قرار دے دیا (اُنہیں عوامی عہدہ، اعزازات یا عدالتوں میں شہادتیں دینے کے نااہل قرار دے دیا) شہزادوں کو سودخوروں کو اپنی سلطنت سے نکالنے، مالکان جائیداد کو سود خوروں کو اپنی جائیداد کرائے پر دینے کا حکم دیا اور سودخوروں کی وصیتوں اور ایمان کے اقرار کو منسوخ قرار دے دیا۔ (26) سادہ الفاظ میں، پوری بارھویں اور تیرھویں صدیوں کے دوران، کلیسا کی ''سود کے خلاف مہم'' کا خلاصہ کسی بھی شکل میں شدید ممانعت کی شکل میں آ گیا۔ اور قرض خواہ کو بدترین قسم کے گنہگار کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔



ان مذمتوں کے باوجود، متعدد سیکولر حکمرانوں نے تیرھویں صدی میں درمیانہ سود کی اجازت دے دی، اور ایسے قوانین وضع کئے جنہوں نے محض سود کی قانونی حدود مقرّر کیں۔ متعدد حکمرانوں نے کم از کم جزوی طور پر ایسے قوانین ذاتی وجوہات کی بنا پر جاری کئے۔ بہت سے حکمرانوں کو قرض تک رسائی کی ضرورت تھی، جو اکثر اوقات جبری قرضوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ ایسے قرضے، جو تیرھویں صدی سے وینس، جینوا، سینا، اور فلورنس میں معروف تھے، غیر متنازعہ تھے اور اُن پر نسبتاً کم سود وصول کیا جاتا تھا۔ (27) سیکولر شہزادوں کو دیئے جانے والے بڑے قرضے کم محفوظ تھے اور اُن میں نادہندگی عام تھی، اور اس کا عکس اُن سود کی شرحوں میں نظر آتا تھا جو وہ وصول کرتے تھے۔

پورے مغربی یورپ میں حکمران یہودی ساہوکاروں کو اجازت دیتے تھے اور سود پر قرضہ دینے کیلئے عیسائی مرتہنوں کا انتخاب کرتے تھے۔ مشہور ترین ساہوکار نومبارڈ تھے، جو تیرھویں صدی کے وسط میں پورے یورپ میں پھیلے ہوئے تھے۔ لومبارڈی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے، وہ جہاں کہیں بھی کام کرتے تھے۔ اُنہیں غیر ملکی سمجھا جاتا تھا اور اُن سے مقامی مہاسیٹھوں کی طرف سے اجازت نامہ حاصل کرنے کا تقاضا کیا جاتا تھا۔ برجز میں، لومبارڈوں کو 1281 میں دیئے جانے والے پہلے اجازت نامے واضح طور پر یہ شرط عائد کرتے تھے کہ سود کی اجازت نہیں ہے اور بصورتِ دیگر بھاری جُرمانوں کی سزا دی جاتی تھی۔ تاہم، یہ جُرمانہ سال میں ایک دفعہ ادا کرنا ہوتا تھا، قطع نظر بے ضابطگیوں کی تعداد کے.....جو اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ یہ رعایت سود کی اجازت دے رہی تھی نہ کہ اسے منع کر رہی تھی۔ 28 یہ شرط محض پچیس سال بعد ختم کر دی گئی: 1306 میں میونسپل حساب کتاب میں یہ بیان کیا کہ حومبارڈون کو دو پینی کی ہفتہ وار شرح پر قرض دینے کی اجازت تھی، جو کہ ایک پاؤنڈ فی ہفتہ بنتی تھی (1/3 43 فیصد سالانہ) اور اس سے زیادہ نہیں۔ 1/3 43 فی صد سالانہ کی سود کی حدود صرف اکیلے برجز میں نہیں تھیں بلکہ پورے مغربی یورپ میں ہر جگہ موجود تھیں، بشمول ماقی ماندہ زیریں ممالک کے، جیسا کہ شمالی فرانس، مغربی جرمنی، کاسٹائل اور ایراگون۔ پورے مغربی یورپ میں مرتہنوں کی طرف سے مقامی حکمرانوں کو ادا کئے جانے والے جُرمانوں کو باقاعدہ لائسنس فیس میں تبدیل کر دیا گیا، جو کہ مالیات کا ایک اہم ذریعہ تھی۔ جو اکثر اوقات ساہوکاروں کیلئے بہت کم نقد منافع چھوڑتی تھی۔ اس

www.MashalBooks.org

کے بدلے میں حکمران مرتہنوں کی اجارہ داریوں کو نافذ کرتے اور اُنہیں قائم رکھتے تھے اور اُنہیں دوسرے قانونی تحفظ اور خدمات مہیا کرتے تھے۔ 29۔ جدول 4.1 تیرھویں تا پندرھویں صدی ایسے سود کے قوانین کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔

**جدول 4.1:** اواخر قرونِ وسطیٰ کے مغربی یورپ میں سود کے قوانین

| مقام | تواریخ | قانون |
|---|---|---|
| قانونی انتہائی ممکنہ مقداریں کا تالونیا | انتہائی ممکنہ مقداریں، عمومی قوانین | |
| دسویں صدی: 1235 | دسویں صدی: قانونی سب سے زیادہ شرح 12.5%: 1235 عیسائیوں نے 12% پر قرض دینے کی اجازت دے دی۔ | |
| وینس | بارھویں تا چودھویں صدی | روایتاً 20% پر قرضے، عدالتوں نے 12-15% شرح مقرر کی۔ |
| انگلستان | بارھویں تا پندرھویں صدی | صرف بہت زیادہ سود، جو کہ سزا کے تابع تھا۔ |
| ایرے گان | 1241 | یہودی اور مسلمان 20% تک محدود، عیسائی 12% تک محدود |
| قرطبہ | 1241 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 12.5% |
| اشبیلیہ | 1250 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 12.5% |



| | | |
|---|---|---|
| مُرسیہ | 1266 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 12.5% |
| فلورنس | 1345-1346 | ایک مالیاتی بحران کے بعد سود کی تمام سزا بند کر دی گئی۔ |
| فرانس | 1349 | شیمپین اور برائی میں میلوں کیلئے 15% تک سود کی اجازت دی گئی |
| لندن | 1363 | سود کی سزا سول حکام کا کلی اختیار بن گیا۔ |

## قانونی انتہائی ممکنہ مقداریں رہن کی دُکانیں

| | | |
|---|---|---|
| میلان | بارھویں صدی کا اختتام | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 15% |
| ویرونا | 1228 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 12.5% |
| صقلیہ | تیرھویں صدی کا وسط | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 10% |
| موڈینا | 1270 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 20% |
| جینووا | تیرھویں صدی | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 15% |
| انگلستان | تیرھویں صدی | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 43 1/3% |
| پروونیس | تیرھویں صدی | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 300% |
| جرمنی | تیرھویں چودھویں صدی | تیرھویں: قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 173%; چودھویں |
| | | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 43 1/3% |
| برجز | 1306,1404,1432 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 43 1/3% |
| فرانس | 1311, 1361 | 1311: قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 20% |

www.MashalBooks.org

| | | |
|---|---|---|
| | | 1361: قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 86% |
| لومبارڈی | 1390 | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 10% |
| برکنڈی | چودھویں صدی کا اختتام | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 87% |
| فلورنس | پندرھویں صدی | قانونی زیادہ سے زیادہ شرح 20% |

معاشی تاریخ میں تحقیقات، جلد 47 نمبر 2، جیرڈ رُوبن ''تمسکاتِ ادائیگی، سود کی پابندیاں، اسلام اور عیسائیت میں غیر شخصی تبادلہ'' صفحات 227-213 ,2010، میں سے ایلسوئیر Elsevier کی طرف سے اجازت کے ساتھ دوبارہ چھاپا گیا میز کیلئے ذرائع ہیں ڈی روور (de Roover) (1948,P.104) لین (Lane) (صفحہ 63-1966-61) کیولا (Cipolla) (1967، صفحہ 65)۔ گلکرائسٹ (1969 صفحہ 133-112) گرائس ہچنسن (Grice Hutchinson) (1966,1978 صفحہ، 41-36، 48) ہیلم ہولز (Helmholz) (1986) لی کوف (Le Goff) (1988 صفحہ 72) ہومر اینڈ سائیلا (Homer and Sylla) 1991 صفحات 97، 103، 110) اور گیلپی اینڈ جولنین لیبروئیر (Gelpi and Julien-Labruyere) (2007، صفحہ 27)۔

بہت سی جگہوں پر جائز ہونے کے باوجود، ابھی تک سود پر قرض دینا کلیسا کی طرف سے واضح طور پر ممنوع تھا۔ لہٰذا یہ بات حیران کُن نہیں ہے کہ یورپی ساہوکاروں نے بھی، اپنے مشرقِ وسطیٰ کے مثیلوں کی طرح قرض دینے کے متبادل میکانئے تلاش کر لئے۔ ابتدائی متبادلات جائز مقاصد کیلئے شروع ہوئے۔ اس کی مثالوں میں شامل ہے۔ شراکتیں (سوسائٹاز یا ئمنڈا) اور سَینس Consus یا رینٹ (Rente) جو کہ منافع بخش اشیا پر سالیانہ تھا۔ ان معاہدات کی خصوصیات سود کے حامل قرضوں کے مشابہہ تھیں اور یہ کاروباری تعلقات میں گہرے طور پر رچ بس گئیں۔

سوسائیٹاز نے عیسائی اسقفوں اور مذہبی علما کیلئے پہلا حقیقی مسئلہ پیش کیا، کیونکہ کوئی بھی شخص، کلی طور پر سرمائے کو نقصان کے خطرے میں ڈال کر، شراکت داری سے منافع حاصل کرسکتا تھا۔ یہ مسئلہ 1270 سے 1450 کے دوران بحث مباحثوں کے ایک سلسلے کے نتیجے میں حل ہوا، جب سوسائٹاز کو عیسائی فکر کے تناظر میں جائز قرار دیا گیا۔ اس طرح کہ اس میں نقصان کو



صلے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا۔ تاہم کلیسا نے اس جواز کو عمومی طور پر سود کے حامل قرضوں تک نہ پھیلایا اس نے صرف سوسائٹاز کیلئے گنجائش پیدا کی، جو اس وقت تک کاروبار کیلئے ضروری تھا۔ اسی طرح سینس کو بھی مذہبی حکام کی طرف سے عیسائی فکر کے تناظر میں جائز قرار دیا گیا۔ سینس ایک سالیانہ کی مانند تھا۔ اور اشرافیہ اور کسانوں دونوں کیلئے طویل مدت کی سرمایہ کاری کیلئے ایک معمول کی شکل تھی، خاص طور پر فرانس اور اٹلی میں (30) جب رقم کی معیشت پھلی پھولی، تو قرض داروں نے ادائیگیوں کو نقدی میں منتقل کر دیا اور سینس سود کے حامل قرض سے مشابہ ہوگیا۔ جس کی شرحیں 4 فیصد سے 10 فیصد تک تھیں۔ (31) پوپ انوسینٹ چہارم (Innocent4) نے 1251 میں اُنہیں جائز قرار دیا، لیکن کلیسا نے اس مسئلے کو دو مزید صدیوں تک مکمل طور پر حل نہ کیا۔ کلیسا نے آخر کار اس کیلئے عیسائی فکر کے اندر جواز تراش لئے، اگرچہ اس نے جوازوں کا اطلاق سینس پر کیا، جو اس قدر رواج پذیر ہو چکا تھا کہ ''کوئی بھی شخص اس کے برعکس کوئی معمول کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ 32

سوسائٹاز اور سینس اپنے وسیع پیمانے کے استعمال اور ان کی کاروباری ضرورت کی وجہ سے جائز قرار پائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسلامی حَیل کی طرح کی ''تراکیب'' تھیں جنہیں سود کی پابندی سے بچنے کیلئے شعوری طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ان سودوں میں ایسے اخراجات اور نقصان کے خطرات تھے کہ جو ممکنہ طور پر، اُن لوگوں کیلئے جو انہیں ان کے فطری مقاصد کے علاوہ استعمال کرتے تھے۔ زیادہ تر پوشیدہ منافع جات کو ختم کر دیتے تھے۔ تاہم سوسائٹاز اور سینس کو جواز بخشنے والے دلائل، عیسائی سود کے نظریے کو ڈھالنے میں اہم تھے۔ کلیسا نے بعد میں ان دلائل کو مجاز سودوں کے سیٹ کو بڑھانے کیلئے استعمال کیا۔

جب تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں کاروبار مزید پھیلا، اور جب وینس اور جینوا کے تاجر بحیرہ روم اور پورے برّ اعظم میں کاروبار کر رہے تھے، تو یہ بات زیادہ سے زیادہ عیاں ہوگئی کہ کلیسا کے سود کی پابندیوں کا کاروبار پر عملی طور پر اثر پڑ رہا تھا۔ یہ چیز ساہوکاروں کے سود کی پابندیوں سے بچنے کے طریقوں سے منعکس ہوتی تھی۔ سوسائٹاز اور سینس کے برعکس، جنہیں جائز مقاصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ساہوکاروں نے ایسی مالیاتی دستاویزات کو استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، جن کا بنیادی مقصد پابندی سے بچنے کی راہ نکالنا تھا۔ اس کی ایک مثال تیرا معاہدہ تھا،

www.MashalBooks.org

جو تین مختلف قسم کے سودوں پر مشتمل تھا: ایک شراکت کا معاہدہ (Societas)، شراکت کی بنیادی رقم پر بیمہ، اور ایک ایسا معاہدہ جس میں ایک شخص ایک غیر یقینی مستقبل کے فائدے کو ایک کم یقینی فائدے کے بدلے بیچ دیتا تھا۔ ہر انفرادی معاہدہ صحیح تھا، لیکن جب یہ اکٹھے ہو جاتے۔ تو یہ ایک نقصان سے مبرا قرض کی نقل بن جاتے تھے۔ دوسرے مثالوں میں رہن بلا معاوضہ تبادلہ اور بناوٹی بکریاں شامل ہوتی تھیں۔ یہ معاہداتی شکلیں آخر کار عیسائی مذہبی حکام کی طرف سے جائز قرار دے دی گئیں، اکثر اوقات انہیں دوسرے جائز معاہدوں کی شکل میں حل کر کے۔ اہل کلیسا اُن معمولات کی اجازت ایسے، نظریاتی تصورات کو اپیل کر کے، دیتے تھے، جیسا کہ (Lucrum Cessans) لوکرم سیئنز (لفظی طور پر) ''نافع کو روکنا'' جو کہ اُدھار دی ہوئی رقم کی موقع کی قیمت کیلئے ایڈیم سمتھ (Adam Smith) سے پہلے کی اصطلاح ہے۔ (Damnun Emergens) ڈیمنم ایمرجنسی (رقم اُدھار نہ دینے کی وجہ سے ہونے والا نقصان) اور (interesse) انٹریس (جو بنیادی طور پر دیر سے کی جانے والی ادائیگی کی سزا)، جن میں سے سب بہت تیزی سے مذہبی حلقوں میں رواج پا گئیں، اور کلیسا کی، پابندی کی سرکاری نرمی کی پیشن گوئی کرتی تھیں۔(33)

سود مخالف اصول کو آخری دھچکا لیٹران پنجم (Lateran V) (1512-1517) میں لگا، جب کلیسا نے سرکاری طور پر (Monte dipietn) مونٹے ڈی پائیٹا یا پاکباز رہن کے، بینک کی منظوری دی۔ مونٹے (Monte) بنیادی طور پر خیراتی مذہبی ادارے تھے، جو 1462 میں پروگیا (Perugia) اور اورویٹو (Orvieto) نامی فرانسکن افراد کی طرف سے متعارف کرائے گئے، جو غریبوں کو قرض مہیا کرنے کیلئے رقم اکٹھی کرتے تھے۔(34) مونٹے بطور عوامی رہن کی دُکانوں کے اس انداز سے بنائے گئے تھے کہ وہ غریبوں کو قرض حاصل کرنے میں مدد کریں اور عیسائیوں کو سود کے گناہ سے بچائیں، جو صرف 15 فیصد تک سود وصول کرتے تھے جو اخراجات پورے کرنے کیلئے ہوتا تھا۔ یہ شرح دوسرے مرتہنو کی طرف سے کی جانے والی پیشکش سے کافی کم تھی لیکن پھر بھی اتنی زیادہ تھی کہ کلیسا کی طرف سے اس کی مذمت کی گئی۔ مونٹے (Monte) پورے یورپ میں تیری سے پھیل گئے .....صرف اٹلی میں ہی ستاسی موجود تھے.....اس سے پہلے کہ کلیسا نے لیٹران پنجم میں اس کی منظوری دی۔ مونٹے کیونکہ وہ پہلے ادارے تھے جو چرچ کی طرف سے منظور



کئے گئے سود پر کھلے بندوں قرض دیتے تھے، لہٰذا یہ عوامی لائسنس یافتہ مرتہنوں کے غائب ہونے کا سبب بنے اور غریبوں کے لیے اخراجات کے لیے قرضوں کا بنیادی ذریعہ بن گئے۔ بلاشبہ، لوئی جی پاسکلی (Luigi Pascali) (2016) کی طرف سے پیش کیا گیا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ قرضوں تک زیادہ رسائی، جو مونئے کی طرف سے پیش کی گئی، کا ایک ایسا اثر تھا جو آج تک قائم ہے..... وہ علاقے جن میں ماضی میں مونٹے موجود تھے اب فی کس زیادہ بینکوں اور قرض کی زیادہ دستیابی کے حامل ہیں۔(35)

www.MashalBooks.org

# اسلامی اور عیسائی سُود کی پابندیوں میں اختلافات کی توضیح

پہلی جھلک میں، عیسائی اور اسلامی سود کی پابندیاں قدرے خالی از علّت نظر آتی ہیں۔ مغربی یورپ اور مشرق وسطیٰ دونوں جگہوں پر ساہوکار (سود کی پابندیوں کا حکم دیتے ہوئے) حیلے یا مذہبی حکام کی طرف منظور شدہ پیچیدہ مالیاتی قانونی دستاویزات کو استعمال کرتے ہوئے سود کی پابندیوں کو حکم دے جاتے تھے۔ لیکن ان تاریخوں کی تفصیلات انی معیشتوں کے اختیار کردہ راستوں میں زیادہ عمومی اختلافات کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ایک واضح مشابہت یہ ہے کہ ابتدائی اسلامی قانونی تاریخ کی تابانی، مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کے عروج کے پہلو بہ پہلو واقع ہوئی اور بعد میں کسی لمحے، اسلامی قانونی نظریہ اور معاشی کارکردگی دونوں جمود کا شکار ہو گئے۔ لیکن سود کی اسلامی پابندیاں کبھی پوری طرح کم کیوں نہ ہوئیں؟ سود پر اسلامی نظریہ کیوں جامد ہو گیا، اور یہ ہمیں مشرقِ وسطیٰ کی وسیع تر معاشی کارکردگی کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے؟

اس کتاب میں اختیار کیا گیا ڈھانچہ یہ رہنمائی کرتا ہے کہ ایک مسلمان ساہوکار کو سودا کاری کا فیصلہ کرنے سے پہلے تین چیزوں کا جائزہ لینا پڑتا تھا: ہر قسم کے سودے کے تحت حاصل ہونے والا کُل منافع، دُنیاوی سزائیں (بنیادی طور پر معاہدے کی غیر اطلاق پذیری)، اور آخرت کی سزائیں۔ ''دوہری سزا'' کے پیشِ نظر..... دُنیاوی اور اُخروی..... کسی ایسے سودے کو اختیار کرنے سے جو صریحاً اسلامی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہو، ساہوکاروں کو یہ ترغیب ملتی تھی کہ وہ سودے لاگت کو حیل کے ذریعے اپنے اوپر لیں، جو انہیں اسلامی قانون کے ساتھ مربوط ہونے کی اجازت دیتا تھا۔ جو کچھ مجاز تھا اس کے لفافے کو مزید آگے دھکیلنے کی کوئی ترغیب موجود نہیں تھی۔ زیادہ تر معاملات میں، کھلے بندوں سود پر قرض دینے کے اضافہ فوائد اتنے زیادہ نہیں تھے، جو ایسا



کرنے کے خساروں پر قابو پا سکتے۔

لہٰذا دو بنیادی قوتیں تھیں جو، سود کی پابندیوں میں تبدیلی کے مطالبے کو متاثر کر رہی تھیں۔ پہلی قوت تہہ میں مضمر معاشی حالات پر مشتمل تھی: جہاں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاریوں کے منافع بخش مواقع دستیاب تھے، وہاں سود کے حامل قرضوں کی طلب زیادہ تھی اور اس طرح سود کی پابندیوں میں نرمی کی طلب بھی زیادہ تھی۔ دوسری قوت قرض دینے کی لاگتیں تھیں..... دُنیاوی اور اخروی..... زیادہ تر پورے مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں، ''دوہری لاگت'' کی موجودگی، جو مشترکہ طور پر حکمرانوں اور مذہبی حکام کی طرف سے لاگو کی جاتی تھی، ان خلاف ورزیوں کے فوائد پر حاوی تھیں۔ خلاصہ یہ کہ سود مخالف قوانین اور پالیسیوں میں تبدیلیوں کی طلب نہ ہونے کے برابر تھی۔

ساہوکاروں کے اقدامات، اس وسیع تر توازن کا صرف ایک جزوی حصہ تھے۔ جس میں اسلامی نظریہ جمود پذیر ہو گیا۔ ایک دوسرا اہم جزو یہ تھا کہ مسلمان حکمران کسی ایسی چیز کی اجازت دینے کیلئے، جو مذہبی حکام کی اجازت سے ماورا ہو، کوئی ترغیب محسوس نہیں کرتے تھے۔ مسلمان حکمران سود کو جائز قرار دینے کے معاملے میں ایک مخمصہ کا شکار تھے..... ایک طرف اگر وہ ساہوکاروں کو کھلے بندوں سود لینے کی اجازت دیتے تو انہیں فائدہ ہوتا تھا۔ زیادہ تیزی سے بڑھتا ہوا کاروبار اُن کے ٹیکس کی بنیاد کو بڑھانے کا سبب بنتا۔ جو انہیں مذہبی اشرافیہ کی طرف سے مہیا کردہ توسیع اقتدار پر کم انحصار کرتے ہوئے اپنے اقتدار کو توسیع دینے کا موقع مہیا کرتا۔ لیکن کھلے بندوں سود کی اجازت دینے کا خسارہ بہت زیادہ تھا، کیونکہ اُن کے اقتدار کی جائزیت اسلامی قانون کی اُن کی اطاعت پر منحصر تھی۔ اسلامی اصول یہ بیان کرتا ہے کہ اچھے مسلمانوں کو اُن حکمرانوں کی پیروی کرنی چاہیے جو اسلام کے مطابق عمل کریں اور ایسے حکمرانوں کا جو ایسا نہ کریں تختہ اُلٹ دیا جانا چاہیے۔ لہٰذا، حکمران ایسے اعمال کی اجازت دے کر خوش تھے جو صریحاً اسلامی قانون کی خلاف ورزی نہ کریں، لیکن اس سے مزید آگے کسی چیز کی اجازت نہ دیں۔ لہٰذا مسلمان حکمرانوں کیلئے مناسب ترین حل واضح تھا: اُس چیز کی اجازت دیں جس کی اجازت مذہبی حکام دیں اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی اجازت نہ دیں۔

دریں اثنا، مسلم مذہبی حکام، ایسے اعمال کی اجازت دے کر، جن پر طبقۂ شہریان اکثر عمل کرتا تھا، اپنا مقصد حاصل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اگر لوگ مذہبی اشرافیہ کو، سود پر قرض دینے پر

اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے محروم دیکھتے، تو یہ چیز اُن کے اس طرح کے باقی معاملات پر اثر انگیزی میں بھی جھلک سکتی تھی، جیسا کہ شادی، وراثت یا سیاسی طاقت۔ تاہم مذہبی حکام، اگر مذہبی اصول کی ڈرامائی طور پر اچانک تعبیر نو کرتے، تو وہ اقتدار کی جواز بخشی کی اپنی اہلیت کھو دیتے: اسلام اور عیسائیت دونوں میں حاکمیت کا بنیادی ذریعہ مذہبی طبقے کی ابدی سچائیوں پر اجارہ داری ہے۔ ان باہم متصادم محرمات کہ ایک تعبیر نو کی طرف دھکیلے اور دوسرا ماضی کے تحفظ پر ..... مذہبی حکام کے مفاد میں یہی تھا کہ وہ کوئی درمیانی راستہ نکالیں۔ اور کیونکہ نہ تو ساہوکاروں نے اور نہ ہی سیاسی حکام نے مجاز امور کے معاملے کو زیادہ دور تک نہ کھینچا، لہٰذا مذہبی حکام کے لئے ایسے حیل کی اجازت دینے کی ترغیب پیدا ہوئی، جو رواج پذیر ہو چکے تھے، لیکن اس سے بڑھ کر نہیں۔ مذہبی اشرافیہ ایک مہنگی اصول کی تعبیر نو کا معاملہ کیوں اپنے ذمے لیتی، جبکہ کوئی بھی اس کا تقاضا نہیں کر رہا تھا؟

سادہ لفظوں میں، ساہوکاروں اور تاجروں کی طرف سے سود کی پابندیوں میں تبدیلی کے مطالبے کی غیر موجودگی میں، حکمرانوں اور مذہبی حکام کو ان پابندیوں کو نرم کرنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ ان قوتوں نے ایک دوسرے کو تقویت پہنچائی، جو ایک ایسی صورتِ حال تک پہنچ گئی، جہاں متعلقہ فریقوں میں سے کوئی بھی سود کے قوانین کی مکمل نرمی نہیں چاہتا تھا، بلاشبہ ایسا ممکن تھا کہ کوئی بیرونی واقعہ، تاجروں کے اندر سود کے حامل قرضوں کے مطالبے کو بھڑکا دیتا، جو جوابی طور پر تمام متعلقہ فریقوں کے فیصلہ ساز حساب کتاب کو تبدیل کر دیتا۔ تاہم، نکتہ یہ ہے کہ، اس توازن کی خود کو تقویت، بخشنے والی نوعیت کا مطلب تھا کہ ایسے کسی واقعے کیلئے رائے عامہ کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کی سود کی تاریخ اور زیادہ عمومی تاریخ کے درمیان تعلق واضح ہے۔ جب اسلام کی پہلی چار صدیوں میں اسلامی نظریہ بلا تامّل، وقت کے ناگزیر تقاضوں کو قبول کرنے پر آمادہ تھا، تو کاروبار اور تجارت خوب پھلے پھولے۔ اسلام کے سود کے بارے میں نظریے کی بھی یہی صورتِ حال ہے۔ پہلی چند اسلامی صدیوں کے دوران چونکہ مسلمان مذہبی علما نے ساہوکاروں کی خواہشات کو پورا کیا تو مجازِ حیل کا مجموعہ بہت تیزی سے پھلا پھولا۔ کسی لمحے سود کی پابندیوں کے بارے میں اسلامی تعمیر نو سُست رفتار ہوگئی اور کبھی سود کی مکمل اجازت نہ دی جا سکی۔ سود کے



اصول کا جمود اسلامی فکر کے اُس وسیع تر جمود کے متوازی چلا، جسے ''اجتہاد کے دروازے کی بندش'' کہا جاتا ہے۔ بعد میں ہونے والا توازن وہ تھا جو بہت کم اندرونی طور پر پیدا ہونے والا ادارہ جاتی تبدیل کے ساتھ وابستہ تھا: اقتدار کا مذہبی جواز بیشتر اسلامی ریاستوں میں اہم رہا، اور اندرونی عوامل اس جمود کو ممکنہ طور پر ختم نہ کر سکے۔

یہ نتائج مغربی یورپ میں پائے جانے والے نتائج سے مختلف ہیں، جہاں قرونِ وسطیٰ کے آخری دور میں سیاسی اور مذہبی حکام کے درمیان، جواز بخشی اقتدار کا تعلق ڈرامائی طور پر تبدیل ہو گیا، غالباً وہ سب سے عجیب وغریب چیز جس کی اس ڈھانچے میں توجیہہ کی جا سکتی ہے یہ ہے کہ عیسائیت میں بارھویں اور تیرھویں صدیوں کے دوران سود کی پابندیوں کو برقرار رکھا گیا۔ سطحی طور پر کلیسا کے رویے کی عقلی توجیہہ واضح نہیں ہے..... کلیسا عین اس وقت پابندی کو کیوں برقرار رکھے گا، جب قرضوں تک رسائی تجارت کو بڑھاوا دینا شروع کر رہی تھی۔

کاروباری انقلاب سے پہلے زیادہ تر قرضے اخراجات کے مقصد سے لئے جاتے تھے، اور سود کی پابندیاں معیشت میں بمشکل ہی کوئی رُکاوٹ پیدا کرتی تھیں۔ یہ صرف اُس وقت تھا، جب دسویں صدی کے آخر میں کاروباری مواقع بڑھنا شروع ہوئے..... اور اس سے بھی بہت زیادہ حد تک بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں کاروباری انقلاب کے عروج پر..... کہ سود پر پابندیاں نقصان دہ ہوگئیں۔ اس طرح کاروبار کی بڑھوتری نے مغربی یورپ کے حکمرانوں کو درپیش محرکات کو تبدیل کر دیا۔ جب سود کے متبادلات زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال ہونے لگے، تو حکمرانوں میں درمیانہ درجے کے سود کو جائز قرار دینے کیلئے زیادہ جذبۂ محرکہ پیدا ہوا، جو اُنہوں نے پورے برِاعظم میں کر دیا۔ (دیکھئے جدول 4.1) مشرقِ وسطیٰ کے برعکس، جہاں سود کو جائز قرار دینے کے فوائد اقتدار کے مذہبی جواز بخشی سے وابستہ نقصانات سے مغلوب ہوگئے تھے۔ مغربی یورپ میں اقتدار کی جواز بخشی کے تعلقات تقریباً اتنے زیادہ نہیں تھے۔ مغربی یوروپی حکمرانوں نے، مذہبی مذمت کے باوجود، کاروبار کی بڑھوتری کا جواب سود کے ضابطوں کو نرم کر کے دیا۔

جب اتنے زیادہ افراد نے کلیسا کے احکامات کی اتنی صریح خلاف ورزی شروع کر دی۔ تو کلیسا کی اقتدار کی جواز بخشی کی صلاحیت کمزور ہوگئی۔ جوں جوں زیادہ منافع بخش کاروباری مواقع

حاصل ہوتے گئے، تو تاجروں نے کلیسا کے احکام سے مزید احتراز کرنا شروع کر دیا اور سیکولر حکام سے مزید تحفظ طلب کرنے لگے۔ اس چیز نے حکمرانوں کیلئے سود کو جائز قرار دینے اور کاروبار کے حامی دوسرے اقدامات اُٹھانے مزید کا جذبہ محرکہ پیدا کیا..... جبکہ اس نے مذہبی جواز بخشی کی اہمیت کو اور بھی کم کر دیا۔ لہٰذا کلیسا کا سیکولر حکمرانوں کے مقابلے میں طاقت کا زوال، کاروبار کے عروج اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشی اور سیاسی اشرافیہ کے درمیان باہمی تعامل، کا سبب تھا اور نتیجہ بھی۔

کلیسا کا اقتدار کی توسیع میں اپنے کم ہوتے ہوئے کردار کے خلاف پہلا ردِّعمل، عیسائی بادشاہت کے جواز کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنا اور اس طرح اقتدار کی توسیع میں اپنے کردار کی توثیق کرنا تھا۔ (دیکھئے باب 3) گیارھویں صدی کے اواخر میں پوپ گریگوری ہفتم (عہد 1073-1085) کے ساتھ شروع ہو کر، اور تیرھویں صدی کے وسط تک جاری رہتے ہوئے، کلیسا نے..... پہلی مرتبہ..... بادشاہت عطا کرنے اور حکمرانوں کو معزول کرنے کے اپنے حقوق کا دعویٰ کیا، یہ دعوے ٹھیک اُس وقت سامنے آئے، جب کلیسا نے اپنے سود کے خلاف موقف کو مزید سخت کر دیا۔ یہ چیز اس کتاب میں پیش کئے گئے ڈھانچے کے تناظر میں ایک مفہوم رکھتی ہے۔ کیونکہ کلیسا، اقتدار کو توسیع دینے کی اپنی اہلیت میں بڑھوتری کی کوشش کر رہا تھا۔ لہٰذا بیک وقت مذہبی اصول کی تعبیر نو کرنا اس کے لیے ایک حماقت ہوتی۔ یہ چیز عیسائی مذہبی اصول میں ابدیت کے عقیدے کو تباہ کر ڈالتی، جو کہ اقتدار کی جواز بخشی کی اس کی صلاحیت کو متاثر کرنے والا کلیدی جز دیتے۔

کلیسا کی، عیسائی بادشاہت کیلئے جواز بخشی کو تبدیل کرنے حتمی ناکامی نے، سود پر قرض دینے پر اس کی حیثیت کو متاثر کیا۔ ڈھانچہ کی منطق یہ رہنمائی کرتی ہے کہ کلیسا کو سود کی پابندیوں کو صرف اُس کے بعد نرم کر دینا چاہیے تھا، جب اس کی جواز بخشی کی اہلیت ختم ہوگئی تھی۔ اور یہ تیرھویں صدی کے وسط میں کلیسا کی جواز بخشی کی طاقت کی اہمیت کم ہونے کے بعد ہی تھا کہ سیاسی حکام نے اپنی پابندیوں کو نرم کر دیا، اور آنے والی کئی صدیوں کے دوران کلیسا نے بھی اس مثال کی پیروی کی۔ ''سود کے خلاف مہم چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے اواخر میں رُک گئی، اور کلیسا نے بھی آہستہ آہستہ بعد میں، سود کے متبادلات کی اجازت دینا شروع کر دی۔



اس کے مقابلے میں، سود کو نرم کرنے کیلئے کاروباری دباؤ مشرقِ وسطیٰ میں مغربی یورپ سے پہلے موجود تھا۔ لہٰذا سود کی پابندیوں کی ابتدائی نرمی پہلے مشرقِ وسطیٰ میں واقع ہوئی۔ لیکن مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی جائزیت کی زیادہ اہمیت کی وجہ سے، اسلام میں سود کی پابندیاں مکمل طور پر کبھی ختم نہ ہوئیں، اور وہ اندرونی طریقہ ہائے عمل جنہوں نے آخر کار عیسائی سود کی پابندیوں اور عمومی طور پر حکمرانوں کو اقتدار کا جواز بخشنے کی اہلیت دونوں کو ختم کر دیا، مشرقِ وسطیٰ میں کبھی واقع نہ ہوئے۔

یہ منطق اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ سود کی پابندیاں آخر کار مغربی یورپ میں کیوں نرم ہوگئیں لیکن مشرقِ وسطیٰ میں نہ ہوئیں۔ یہ تواریخ اُن زیادہ عمومی اختلافات کی طرف بھی توجہ دلاتی ہیں، جو دونوں خطوں کے توسیع اقتدار کے انتظامات میں تھے، اور اُس سے پیدا ہونے والے وہاں کے معاشی نتائج کی طرف بھی..... اب اُس معمے کی طرف واپس رجوع کرنا اہم ہے، جو اس باب کے شروع میں پیش کیا گیا تھا: مشرقِ وسطیٰ میں کیوں کبھی کوئی ملکی بینکنگ کا نظام نہ اُبھرا؟ کیا مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں سود کی پابندیوں کے مختلف راستوں سے موخر الذکر میں تو بینکوں کی حوصلہ افزائی کی لیکن اوّل الذکر میں نہیں؟ اگرچہ مغرب کے بینکنگ نظام کا تصور کرنا بغیر سود کے مشکل ہے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ سود کی پابندیوں سے پوری تاریخ میں دونوں خطوں میں آسانی سے اجتناب برتا جاتا تھا۔ پس سود کی پابندیوں نے کس طرح مشرقِ وسطیٰ کی بینکنگ کی پیدائش کو روکا، اگر ایسا تھا بھی تو؟

www.MashalBooks.org

# راستے پر منحصر نتائج

آخرکار، مغربی یورپ میں جدید بینکنگ اور مالیاتی کام شروع ہوگئے، جبکہ مشرقِ وسطیٰ کی ساہوکاری بڑی حد تک جانے پہنچانے رشتوں تک محدود رہی۔ ایسا کس طرح ہوا؟ یہ بات کسی بھی طرح واضح نہیں ہے کہ دونوں خطوں میں سود کی پابندیوں کا مالیاتی اداروں کے اختلاف سے کوئی تعلق تھا: ساہوکار دونوں خطوں میں آسانی سے سود کی پابندیوں سے بچ جاتے تھے۔ اور مناسب شرح پر سود، جب تک وہ کوئی حیلہ اختیار کرلیں، دونوں خطوں میں عام تھا۔ اگرچہ، مغربی یورپ میں جدید بیکنگ کی پوری تاریخ کا کھوج لگانا اس کتاب کے دائرہ کار سے باہر ہے......اس کیلئے بہت سی جلدیں درکار ہوں گی......لیکن یہ چیز کہ ان دونوں خطوں میں تمسکات ادائیگی کس طرح ارتقا پذیر ہوئے، سود کی پابندیوں کے شدید اثرات پر کچھ روشنی ڈالتی ہے۔ تمسکات مغربی یورپ میں ایک اہم مالیاتی دستاویز تھی ...... ایڈون ایس ہنٹ (Edwin S. Hunt) اور جیمز مرے (Jamesimurray) انہیں ''قرونِ وسطیٰ کے عروج کے دور کی اہم ترین مالیاتی جدّت طرازی'' قرار دیتے ہیں۔(36) تمسک ادائیگی سے بہت زیادہ مشابہہ ایک قانونی دستاویز، سفتاجہ (جمع سفاتیج)، قرونِ وسطیٰ کے مشرقِ وسطیٰ میں وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی تھی۔ یہ حقیقت کہ یکساں لیکن مختلف......دستاویزات ان دو خطوں میں موجود تھیں، ایسی مزید عمومی قوتوں کے تجزیے کی گنجائش پیدا کرتی ہے جنہوں نے اختلاف کو متاثر کیا۔ ان دستاویزات کے درمیان کیا فرق تھا؟ وہ کیوں ایک دوسرے سے مختلف تھیں؟ اس کا طویل مدنی معاشی نتائج پر کیا اثر تھا۔ خاص طور پر مغربی بینکنگ کی ترقی کے حوالے سے؟

یورپی تمسکاتِ ادائیگی قرض کی دستاویزات ہوتی تھیں، جن کا اجرا ایک جگہ پر ہوتا تھا اور ادائیگی ایک اور جگہ پر۔ یہ ادائیگی ایک مختلف کرنسی میں ہوتی تھی۔ جو اس مارکیٹ کے نرخ پر قابلِ ادائیگی ہوتی تھی جس کا حوالہ جاری ہونے والے مقام سے دیا جاتا تھا، جس میں میعادِ



ادائیگی کی پختگی کا بھی ذکر ہوتا تھا، جو اس دورانئے سے مطابقت رکھتی تھی جو ایک اور چھ ماہ کے درمیان ہوتا تھا۔ تمسکاتِ ادائیگی درج ذیل طریقے سے کام کرتے تھے: ایک قرض خواہ نے ایک قرضدار سے فوری نقدی کیلئے ایک نوٹ خریدا، جس نے اسے غیر ملک میں اس کے ایک نمائندے سے ادائیگی کا مطالبہ کیا، میعاد مکمل ہونے پر، اس نمائندے نے ساہوکار کے نمائندے کو ایک مختلف کرنسی میں رقم ادا کردی۔ انہوں نے تاجروں کو اخراجات (مسلح محافظوں) اور خطرات (ڈاکہ زنی) جو کہ بینکوں کو ایک جگہ دوسرے جگہ منتقل کرنے کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، سے بچنے میں مدد دی......ایسے اخراجات ہرگز معمولی نہ تھے......مثال کے طور پر سونے چاندی کو نیپلز سے روم لے جانے کا خرچہ سامان کی قیمت کے 8 سے لے کر 12 فیصد کے درمیان تھا۔ (37) تمسکاتِ ادائیگی رقم کی زیادہ تر نقل وحرکت کو بھی ممکن بناتے تھے۔ مثال کے طور پر روئین (Rouen) میں اکٹھے کئے سکوّں کو اوے وگنن (Auignon) پہنچاتے میں اکیس دن لگئے تھے، جبکہ قاصد ایک نوٹ کو آٹھ دنوں میں پہنچا سکتا تھا۔(38)

سب سے پہلے جینووا کے لوگوں نے بارھویں صدی میں تمسکات ادائیگی کا استعمال کیا، لیکن تمسکات آنے والی صدی تک عام نہ ہوسکے۔ جبکہ شیمپین کے میلے میں تاجروں نے ان کا باقاعدہ استعمال کیا۔ آنے والی صدیوں میں وہ ہر جگہ عام ہوگئے، اوّل اوّل اٹلی میں، اور ارتقا پاتے ہوئے ایسی مالیاتی دستاویزات میں تبدیل ہوگئے، جنہوں نے قرض خواہوں کو، تبادلے کی شرحوں میں فرقوں کے ذریعے منافع کمانے میں بھی مدد دی۔ (39) قرضخواہ منافع کمانے کے قابل ہوگئے، اس طرح کہ وہ اپنے نمائندے کو تازہ ادا کئے ہوئے بل کی رقم سے نیا بل خریدنے کو کہہ دیتے، جو کہ قرضخواہ کے وطن میں قابلِ ادائیگی ہوتا، جو کسی اور قرضدار سے لیا جاتا۔ کیونکہ دوسرا سودا ایک دور دراز ملک میں واقع ہوتا تھا، لہٰذا قرض خواہ دوسرا بل پہلے سود سے مختلف شرح تبادلہ سے خریدتا تھا۔ شرح کا فرق قرض خواہوں کو تبادلے کے سودوں پر مناقع کا موقع فراہم کرتا تھا۔ (40) یہ جاننے کیلئے کہ یہ کس طرح کام کرتا تھا، ذیل کے مفروضاتی جدید تبادلے کے سودے پر غور کریں۔ مثلاً ایک بل جو لندن میں خریدا گیا اور وہ فلورنس میں قابلِ بازیابی ہے۔ L1:05f کی شرح پر دستیاب ہے، جبکہ ایک بل جو فلورنس میں خریدا گیا اور لندن میں قابلِ بازیابی ہے۔ 1f:L3 + کی شرح پر دستیاب ہے۔ ایک شخص لندن میں ایک بل کو L100 کے عوض خرید

www.MashalBooks.org

سکتا ہے اس کی ادائیگی فلورنس میں 50f پر کرسکتا ہے۔ پھر اس 50f کو ایک بل کو خرید سکتا ہے جو لندن میں 150L دیتا ہے، اور اس طرح 50 فیصد منافع پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص فلورنس میں ایک بل 100f کے عوض خرید کر بھی آغاز کرسکتا ہے اور اسے لندن 300L کے عوض بھجوا سکتا ہے اور اس سے ایک بل خرید سکتا ہے جو فلورنس میں 150f دیتا ہے۔ یہ بھی پچاس فیصد منافع ہے۔(41)

قرونِ وسطیٰ کے مشرقِ وسطیٰ کے تاجر بھی طویل فاصلے کے قرض کی قانونی دستاویزات استعمال کرتے تھے۔ ان میں شامل تھے قرض کا تبادلہ (حوالہ)، ادائیگی کے احکامات) سک اور رُقعہ (42) اور تمسکاتِ ادائیگی (سفتاجہ) سفاتیج کم ازکم آٹھویں صدی عیسوی سے موجود تھے، اس سے پہلے جب یوروپی اس طرح کے قرض کی دستاویزات استعمال کرتے تھے (43) سفاتیج تحریر شدہ ذمہ داریاں ہوتی تھیں جو مشہور تاجروں کی طرف سے جاری کئے جاتے تھے اور مشہور تاجروں سے طلب کئے جاتے تھے۔ اس خصوصیت کے ساتھ (یورپی بلوں کے برعکس) کہ اس کی واپس ادائیگی بھی اُسی طرح کی کرنسی میں کی جاتی تھی جو جاری کرنے والے کارندے کو ادا کی جاتی تھی۔ یورپی تمسکاتِ ادائیگی کی طرح، سفاتیج کا عمومی طور پر استعمال تجارت میں کیا جاتا تھا، لیکن انہیں اور مقاصد کیلئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر، عباسی مالیاتی انتظامیہ سفاتیج کو صوبائی خزانوں اور بغداد کے درمیان فنڈز کے تبادلے کیلئے استعمال کرتی تھی، رعایا سرکاری ملازمین کو رشوت سفاتیج کے ذریعے دیتی تھی اور ٹیکس کے سرکاری وصول کنندگان کو ادائیگی کرنے کیلئے سفاتیج سے کام لیتے تھے۔ سفاتیج، پوری سلطنت عثمانیہ میں استعمال اور لاگو کئے جاتے تھے۔ جہاں وہ اناطولیہ، جزائر انجئین، کریمیا، شام، مصر اور ایران کے درمیان سودوں کی سہولت کاری کرتے تھے۔(45)

یوروپی تمسکات ادائیگی کے برعکس، جس میں چار فریق ملوث ہوتے تھے، سفاتیج میں صرف تین فریق ملوث ہوتے تھے ارو وہ درج ذیل طریقے پر کام کرتے تھے۔ الف نے سفتاجہ کے بدلے میں ب کو کچھ رقم اُدھار دی، جوج کو دے دی گئی، جو کہیں اور رہتا تھا اور الف کو وہی رقم اُس کرنسی میں ادا کردی۔ ایک مخصوص قسم کا سفتاجہ اس طرح پڑھا جاتا تھا: ''ابومنصور نے مجھے کہا کہ میں اُس سے 25 دینار اور 2 قِراط لے لوں، جو کہ میں نے لے لئے اور جس کے بدلے میں نے



اُسے ایک نوٹ لکھ کر دیا جو تمہارے سامنے ادائیگی کیلئے پیش کیا گیا'' (46) سفاتیج نہ قابلِ تبادلہ تھے نہ ہی قابلِ گفت وشنید تھے، اور پیش کئے جانے پر فوری طور پر قابل بازیابی تھے۔ جاری کنندہ (قرضدار) ایک فیس وصول کرتا تھا۔ جو بعض اوقات قابلِ ذکر ہوتی تھی سفتاجہ کی قیمت کے ایک فیصد کے برابر کم بھی ہوسکتی تھی۔ اگر وہ کارندہ جس سے سفتاجہ کا مطالبہ کیا جاتا، ادائیگی میں تاخیر کردیتا، تو وہ بہت زیادہ جُرمانے کا مستوجب ہوتا جو اگر وہ ادا نہ کیا جاتا تو سفتاجہ کا حامل اس کیلئے اسلامی عدالت میں مقدمے کے ذریعے دعویٰ کرسکتا تھا۔(47)

یورپی تمسکات ادائیگی کی طرح، سفاتیج تحریری دستاویزات تھیں، جو قرض کو پھیلاتی تھیں اور تاجروں کو، نقل وحمل میں ہونے والے نقصان کے خطرے سے بچنے میں مدد دیتی تھیں۔ تاہم، یوروپی تمسکات کے برعکس، سفاتیج میں کرنسی کا تبادلہ ملوث نہیں ہوتا تھا..... تمسکات صرف ایک علاقے کے تاجروں کو اُسی کرنسی میں دوسرے علاقے میں ادائیگی کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ جب کچھ مسلمان ماہرین قانون نے سفاتیج کی اجازت دی، تو اُنہوں نے قرضخواہوں کو خود تبادلے کے سودے سے منافع حاصل کرنے سے منع کردیا۔(48) اس کی بجائے صرف قرضدار، سفاتیج میں کاروبار کرنے سے (اجرا کی فیس کے ذریعے) منافع حاصل کرسکتے تھے۔

تمسکات ادائیگی، مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں بڑی حد تک اس وجہ سے مختلف تھے کہ موخرالذکر میں سود پر قرض دینا جائز تھا، اگرچہ کلیسا نے تمسکات کی صحت کو پندرھویں صدی تک تسلیم نہ کیا۔ کیونکہ مغربی یوروپی قرضخواہ تبادلے کے سودوں پر قابلِ اطلاق واپسی کرسکتے تھے، لہٰذا وہ تمسکاتِ ادائیگی کو ضمانت شدہ سود کے حامل قرضوں کے متبادل کے طور پر استعمال کرنے پر آمادہ تھے، جو ابی طور پر بالکل عیاں سود کے ساتھ وابستہ مذہبی اور سماجی پابندیوں سے اجتناب کرتے ہوئے۔ بلاشبہ تمسکات ادائیگی تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں، وسیع پیمانے پر مالیاتی دستاویزات بن گئے، سیکولر حکمرانوں کے سود کی پابندیوں کو نرم کرنے کے جلد ہی بعد دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ میں حکمرانوں اور مذہبی حکام نے قرضخواہوں کو تبادلے کے سودوں پر بذاتِ منافع حاصل کرنے کی ممانعت کردی، اور سفاتیج، جہاں جائز تھے، اپنے اصل مقصد تک محدود کردیئے گئے: یعنی طویل فاصلوں کی نقل وحمل میں سکوں کے استعمال کے بغیر سہولت مہیا کرنا۔ اگرچہ تبادلے کے سودوں سے منافع حاصل کرنا، جائز تھا..... بصورتِ دیگر

صرّافی ایک قابل عمل پیشہ نہ ہوتا..... مسلمان مذہبی اور سیاسی حکام کو قرض دینے کے ساتھ ساتھ تبادلے سے منافع کمانے کو منع کر دیا۔(49) اسلامی قانون، فیس کے علاوہ، تبادلے کے سودوں سے پیدا ہونے والے منافع کو سودی خیال کرتا تھا۔ دولت مند قرض خواہ، یورپی تمسکات ادائیگی سے ملتی جلتی دستاویزات کو استعمال کر کے منافع نہیں کما سکتے تھے، کیونکہ ایسے سودے اسلامی عدالتوں میں قابلِ تنسیخ ہوتے تھے۔

یہ چیز ایک سوال کو جنم دیتی ہے: اسلامی مذہبی حکام نے ایک ایسا حیلہ کیوں نہ تخلیق کیا، جس کے ذریعے مسلمان قرض خواہ سفاتیج کو تبادلے کی شرحوں میں فرقوں سے منافع کیلئے استعمال کر سکتے؟ دو وجوہات ایسی ہیں جن کی بنا پر ماہرین قانون نے کبھی ایسا حیلہ وضع نہ کیا۔ اول۔ اگرچہ سفاتیج اور تبادلے کے سودے دونوں جائز تھے، لیکن ان دونوں کو یکجا کرنا ایک ناجائز دستاویز کی تخلیق پر منتج ہوتا، کیونکہ اس کا واحد مقصد ایک سودی فائدہ حاصل کرنا ہوتا۔ یہ دوہری فروخت سے مختلف ہے، جس میں دو جائز لیکن علیحدہ سودے یکجا ہوتے تھے۔ دوم، اُس وقت ایک شخص یہ سوال کر سکتا تھا۔ اسلامی حکام نے ایک ایسا حیلہ کیوں نہ قائم کیا، جو یورپی تمسک ادائیگی کی نقل ہوتا، لیکن سفتاجہ اور تبادلے کے سودوں کو علیحدہ رکھا؟(50) اگر الف اور ب مقامات پر تبادلے کی شرحوں میں فرق ہوتا تو یہ قرض خواہ کو کم نقصان کے خطرے والا منافع دیتا، جیسا کہ یہ یورپ میں دیتا تھا، تاہم سودوں کا یہ سلسلہ بھی اسلامی قانون کے تحت ناجائز ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ جہاں مذہبی علما نے سفتاجہ کی اجازت دی، اُنہوں نے یہ اجازت صرف تجارت کی ایک دستاویز کے طور پر دی۔(51) اسلامی قانون دان سفتاجہ کے بارے میں اس کی سودی نوعیت کی وجہ سے شکوک وشبہات کا شکار تھے؛ لہٰذا اُنہوں نے سفتاجہ تجارت کی سہولت کاری سے باہر کسی طرح کے استعمال کی ممانعت کر دی۔ دوہری فروخت کے برعکس، جو قانون کی روح نہیں لیکن لفظاً اس کی پیروی کرتی تھی۔ کیونکہ اس میں دو جائز سودوں کو یکجا کیا جاتا تھا، ایسا سودا، اسلامی قانون کی لفظی طور پر بھی پیروی نہ کرتا، کیونکہ یہ سفتاجہ کو ایک ناجائز دستاویز میں تبدیل کر دیتا۔(52)

خلاصہ یہ ہے کہ یورپی تمسکات کے ساتھ وابستہ کرنسی کے تبادلے کے زائد عنصر، جو کہ مشرقِ وسطیٰ کے تمسکات کے ساتھ وابستہ نہیں تھا نے یورپ کے دولتمند قرض خواہوں کو تبادے کے سودے سے بھی منافع کمانے کا موقع دیا، کیونکہ یہ منافع اُن دو سودوں سے حاصل ہوتا تھا، جو



مختلف شہروں میں تبادلے کی شرحوں کے اختلافات سے فائدہ اُٹھاتے تھے..... لہٰذا وہ قرض جو تمسکاتِ ادائیگی خریدتے تھے، کثر کارندوں کے ساتھ بین العلاقائی کاروبار میں ملوث ہوتے تھے۔ اس بظاہر مغرب یورپی کے تمسکات کا خالی ازعلت عنصر، کے مغربی یورپ کے مالیاتی اداروں کی تشکیل میں اہم راستے پر منحصر نتائج تھے۔ خاص طور پر، اس نے ایسے اداروں کی تشکیل کی حوصلہ افزائی کی، جو بین العلاقائی مالیات کو بڑھاوا دینے کے قابل تھے۔ مثال کے طور پر، فلورنس اور جینوا کے تاجروں نے، اُدھار کے سودوں کے مواقع مہیا کرنے کیلئے، لیامنز اور بینکن میں بالترتیب، پندرھویں صدی کے میلے منعقد کئے۔(53) زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، تمسکات ادائیگی میں تجارت نے بین العلاقائی تنظیمیں فارموں کی تشکیل میں سہولت پیدا کی، جو غیر شخصی قرض دہندگی کے لئے موزوں تھے، جو کہ ایک ایسا عمل تھا جس کی میڈیچی مہم نے مثال پیش کی۔

میڈیچی بینک جس کا صدر مقام فلورنس تھا، پندرھویں صدی میں شراکت داری کی شاخوں والا ایک غیر مرتکز قالب بن گیا، جس کی شاخیں پورے یورپ میں تھیں، جو تمام کسی حد تک بین العلاقائی مالیات اور تمسکاتِ ادائیگی میں کاروبار کرتی تھیں۔ میڈیچی ہاؤس شراکتی شاخوں کے ایک سلسلے پر مشتمل تھا، جو علیحدہ قانونی وجود تھے، جو بہت حد تک جدید دور کی ہولڈنگ کمپنی کی مانند تھا(54) یہ تمام شاخیں مبادلۂ زر کے عمل سے کاروبار کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر، میڈیچی بینک کے برجز شاخ کے ساتھ معاہدے کے دیباچے میں، جو کہ ایک مظہر تھی، شراکت کا مقصد تھا ''مبادلۂ'' اور سامانِ تجارت میں فلینڈرز میں برجز کے شہر میں کاروبار کرنا۔''(55)

تمسکات ادائیگی کے پیشِ کردہ مواقع سے فائدہ اُٹھانے کیلئے، میڈیچی بینکوں کی شاخوں نے، بطور مراکز اور بطور دوسری شاخوں کے کارندے، دونوں طرح سے کام کیا۔ میڈیچی کی شاخوں کے، یورپ کے تمام بڑے بڑے کاروباری مراکز میں نمائندے تھے، جو اس نظام کو شروح مبادلہ اور دارالمبادلہ کے اندر اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہنے کی گنجائش پیدا کرتے تھے۔(56)

میڈیچی کا ''مرکز اور شاخوں'' کا نظام۔ اُن محرکات کے جواب میں اُبھرا، جو اُن لوگوں پر مسلط کئے گئے جو مالیات میں کاروبار کرتے تھے۔ تمسکات ادائیگی کی منافع بخشی نے میڈیچی بینک جیسے اداروں میں بین العلاقائی شاخیں بنانے کا جذبۂ محرکہ پیدا کیا، تاکہ وہ شرح تبادلہ کے درمیان اختلافات اور سرمایے کی کمی کا فائدہ اُٹھا سکیں، جبکہ بیک وقت مختلف حصص میں سرمایہ

لگانے کا نہ کہ نقصان سے بچا جا سکے۔ اُدھار کھاتوں اور بین الاقوامی مالیاتی قوانین سے پہلے کے زمانے میں، ان پیچیدہ نظاموں نے، اٹلی میں سرمایہ دار کاروباری کرنے کا موقع دیا۔ اگرچہ میڈیچیوں نے ابتدائی طور پر نیم شخصی تعلقداروں کے ساتھ سودے طے کئے۔ اُن کے ساتھ جو اچھے قرضے کے نقصان والے سمجھے جاتے تھے۔ لیکن شاخوں کے نظام سے حاصل ہونے والے قرضے کے نظام نے ذاتی قرضے کے تعلقات کو اُبھرنے کا کم موقع دیا۔ بنیادی سرمایہ کے مالکان (فلورنس میں میڈیچی خاندان) کے نقطۂ نگاہ سے زیادہ تر مالیاتی سرگرمیاں نامعلوم تعلقداروں کے ساتھ کی جاتی تھیں۔

میڈیچی کمپنی کی طرف سے شروع کیا جانے والا شاخوں کا نظام، مغربی یورپ میں بینکنگ کے نظام کے ظہور کے راستے پر بنیادی قدم تھا۔ شاخوں کے ذریعے، میڈیچیوں نے اپنے سرمائے کو اس کے انتہائی قیمتی استعمال کی طرف مرتکز کر دیا۔ اگر سرمایہ دار فلورنس کے میڈیچیوں نے ہر جز میں سرمایہ کاری کا منافع بخش موقع دیکھا، تو شاخوں نے اس بات کا امکان بڑھا دیا کہ وہ اپنی رقم کو وہاں کاروبار میں لگائیں گے، کیونکہ ایک شاخ کا حصہ دار ایک امکانی قرضدار کے اعتماد کی تصدیق کر سکتا تھا، ساتھ ہی ساتھ کسی ایسے قرضدار پر مالی پابندیاں لگا سکتا تھا، اگر وہ ادائیگی میں دیر کرے (مثلاً مستقبل کی رقم میں کٹوتی کر کے)۔ بلاشبہ شاخ کا حصہ دار ایسے کسی موقع سے میڈیچی کو سب سے پہلے آگاہ کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، شاخوں کا آغاز غیر شخصی سرمایے کی فراہمی کے راستے پر ایک بنیادی قدم تھا..... ایسی سرمائے کی فراہمی جو اس سے پہلے نامعلوم تعلقداروں کے ساتھ ہوتی تھی..... جو کہ جدید بینکنگ کے نظام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

ایسے ادارے مشرقِ وسطیٰ میں بالکل بھی پیدا نہ ہوئے اور زیادہ تر تبادلاتی کاروائیاں، واقف کاروں اور خاندانوں کے درمیان باہمی ذاتی تعامل تک محدود رہتی تھیں۔ (57) کرنسی کے تبادلے کے عنصر کے بغیر دولت مند قرضخواہوں کیلئے، سفاتیج کو مالیات کی ایک دستاویز کے طور پر استعمال کرنے کا کوئی جذبۂ محرکہ نہیں تھا۔ اس کی بجائے سیاح تاجر..... نہ کہ سرمایہ کار..... بنیادی قرضخواہ رہے، اور سفاتیج تجارت کی سہولت کاری کی طرف منتقل رہے۔ غیر ملکی کارندے اُس وقت تک غیر ضروری تھے جب تک قرضدار اور بینک کے مالک کو اپنے کاروباری شریک پر اعتماد تھا، جس کے ساتھ اس کا عمومی طور پر کوئی سماجی یا ذاتی تعلق ہوتا تھا۔ سرمایہ دار مسلمان سفاتیج کو خرید کر



کوئی منافع حاصل نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا سفاتیج میں کاروبار کرنے والے نظام قائم کرنے کی کوئی ترغیب نہیں تھی۔ 58

بہت سے علماء نے اسلامی دنیا میں، وسیع پیمانے پر حیلے کے ذریعے سود کے حامل قرض دینے کے وجود کو اس بات کی ایک شہادت کے طور پر پیش کیا ہے کہ سود کا کوئی عملی اثر نہیں تھا۔ تاہم تمسکات ادائیگی کی تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ ایسے دلائل، پہلے درجے کے خوردسطح کے مشاہدات پر توجہ مرکوز کرنے کی کمزوری کا شکار ہیں۔ یہ چیز ایک ایسے راستے پر روشنی ڈالتی ہے، جس کے ذریعے مذہبی سود کی پابندیوں کا اس سطح کے راستے پر منحصر نتائج پیدا کئے..... ایسے نتائج، جو وقت کے کسی خاص نقطے پر مشاہدہ نہیں کئے جا سکتے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کنارے پر جمع ہو جاتے ہیں۔ جوئل موکائر (Joel Mokyr) کی اصطلاحات کو استعمال کرتے ہوئے، یہ تجزیہ یہ ظاہر کرتا ہے، سود کی پابندیوں کے مسئلے کے حل ہونے کے مغربی یورپی سیاسی قانونی اداروں کے ساتھ باہمی تعامل نے مالی ''خوردایجادات'' کے ایک سلسلے کی حوصلہ افزائی کی..... ایسی ضمنی تبدیلیوں کی، جو وقت کے ساتھ ساتھ، مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں بہت مختلف نتائج کی طرف لے گئیں۔

عیسائیت اور اسلام میں سود کی پابندیوں کی تاریخ مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں معاشی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر توجہ مرکوز کرنے میں مدد دیتی ہے..... بہت سے حوالوں سے یہ تواریخ، مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کے درمیان زیادہ عمومی ''مقداروں کے اس پلٹے'' کے متوازی ہیں، جو اسلام کے آغاز کے ایک ہزار سال کے اندر واقع ہوا۔ کاروبار کے حق میں مذہبی تعبیر نو، دسویں صدی تک یا اس کے لگ بھگ مغربی یورپ کی نسبت مشرقِ وسطیٰ میں زیادہ عروج پر تھی، زیادہ تر اسی طرح جس طرح مشرقِ وسطیٰ کی معیشتیں، مغربی یورپ کی معیشتوں کی نسبت زیادہ عروج پر تھیں۔ لیکن وسیع تر معاشی رُجحانات کی طرح، مغربی یورپ نے، تیرھویں یا چودھویں صدیوں میں کسی وقت سود کی پابندیوں کو نرم کر کے، مشرقِ وسطیٰ کو آن لیا، اور وہ 1600 تک مشرقِ وسطیٰ سے آگے تھا۔

سود کی پابندیاں، اُن معاشی قوسوں کا ایک عالم خرد تشکیل دیتی ہیں۔ جو قرونِ وسطیٰ میں مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں ارتقا پذیر ہوئیں۔ اگرچہ سود کی پابندیوں پر توجہ مرکوز کرنے سے

www.KitaboSunnat.com

ہماری نگاہیں دوسرے بہت سے ایسے تاریخی واقعات سے ہٹ جاتی ہیں، جنہوں نے دونوں خطوں کی معیشتوں کو متاثر کیا، لیکن یہ اُن بنیادی خصوصیات میں سے ایک پر روشنی ڈالتی ہے جنہوں نے قرونِ وسطیٰ کی سیاسی زندگی کو روشنی دی: سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے میں مذہبی اختیار کا استعمال۔ اس کتاب کا باقی ماندہ حصہ یہ دکھاتا ہے کہ سیاسی اور مذہبی حکام کے درمیان باہمی تعامل محض سود کی پابندیوں کی تاریخ سے کچھ زیادہ کی وضاحت کرتا ہے، اور یہ تعاملات معاشی کامیابی اور معاشی جمود میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔



www.MashalBooks.org

## (5)

# چھاپہ خانے پر پابندیاں

سال 2000 کے لگ بھگ، مغرب کی متعدد تفریحی ایجنسیوں نے ’’ہزاری کے اہم ترین لوگوں‘‘ کی فہرستیں شائع کیں۔ یہ فہرستیں پریشان کُن حد تک مغرب مرتکز تھیں ......اے اینڈ ای کی فہرست کے مطابق، سٹیون سپائیلبرگ (Staven Spielberg) کسی بھی مسلمان کی نسبت زیادہ اہم تھا، اور چین کے صرف ایک شخص (ماوزے تنگ) کے علاوہ باقی سب سے زیادہ اہم تھا ......لیکن تقریباً ان تمام لوگوں کے اندر ایک چیز مشترک تھی: جو ہانس گٹنبرگ (Johannes Gutenberg) یا تو اہم ترین شخص تھا (اے اینڈ ای لائف (Life) اور بائیو چینل (Bio Channel کے مطابق) یا مٹھی بھر اہم ترین لوگوں میں شامل تھا۔ یہ چیز گٹنبرگ کو انتہائی با اثر مفکرین (نیوٹن، ڈارون، مارکس، آئین سٹائین) حکمرانوں (چنگیز خان، نپولین، گاندھی) اور ثقافتی شخصیات (شیکسپیئر، ڈاونچی، مائیکل اینجیلو) جو کہ گزشتہ ہزار سال میں ہوئے، سے آگے تھا، گٹنبرگ ان میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ وہ ایک سرمایہ وار موجد تھا جو صرف ایک ایجاد کیلئے مشہور تھا: متحرک ٹائپ والے چھاپہ خانے کیلئے۔(1)

گٹنبرگ کی اہمیت پر اتفاق رائے سے، یورپی تاریخ پر ہونے والے اُن نتائج کا پتہ چلتا ہے جو چھاپہ خانہ نے پیدا کئے۔ گٹنبرگ نے متحرک ٹائپ والے چھاپہ خانہ کو 1450 میں جرمنی کے شہر مینز (Mainz) میں ایجاد کیا اور اس طرح معلومات کے ایک انقلاب کا آغاز کیا۔ بہت حد تک اکیسویں صدی کے آغاز میں انٹرنیٹ کی طرح چھاپہ خانہ اپنے وقت کی اہم ترین معلوماتی ٹیکنولوجی تھا، جس نے معلومات کے بہاؤ میں ایک بے مثال عروج پیدا کیا، چھاپہ خانہ سے پہلے،



شرحِ خواندگی کم تھی، کتابیں اور کتابچے غیر معمولی طور پر مہنگے تھے، اور معلومات کو دور دراز مقامات پر پہنچنے میں ہفتے یا مہینے لگتے تھے۔ بنیادی رُکاوٹ وہ وقت تھا جو دستاویزات کی کثرت سے نقلیں نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔ خانقاہوں اور یونیورسٹیوں میں دانش ور تکلیف دہ شدید محنت کے عمل سے طویل مقالہ جات کی نقلیں تیار کرتے تھے، جبکہ ہاتھ سے نقلیں بنانے والے مختصر دستاویزات، جیسا کہ قیمتوں کی فہرستوں اور مختصر کتابچوں کی نقلیں تیار کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یورپیوں کے پاس زیادہ چیزیں ایسی نہیں تھیں جنہیں وہ پہلے سے طے شدہ مان لیتے: بہت کم لوگوں کی کتابوں تک رسائی تھی، اور نئی معلومات اپنے وصول کنندہ تک پہنچنے تک پرانی ہو چکی ہوتی تھیں۔ چھاپہ خانے نے ان مسائل کو کم کرنے میں مدد دی۔ اس طرح کہ اس نے خیالات تک رسائی کو آبادی کے زیادہ بڑے حصے کیلئے کھول دیا۔ چھاپہ خانے کے معاشی فوائد واضح تھے، اور نتیجتہً یہ بہت تیزی سے پورے مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک، یورپ کے زیادہ تر بڑے شہروں میں کم از کم ایک چھاپہ خانہ ضرور تھا۔

چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کے براہِ راست معاشی اثرات معمولی نہ تھے۔ جیریمیا ڈِٹ مر (Jeremiah Dittmar) (2011) نے سینکڑوں یوروپی شہریوں کا تجزیہ کیا، اور اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ شہر جنہوں نے چھاپہ خانے کو جلدی اپنایا وہ باقی سب کے برابر ہونے کے باوجود پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت بہت زیادہ تیزی سے آگے بڑھے کیونکہ صنعتی دور سے قبل کی دُنیا میں شہروں کی بڑھوتری معاشی بڑھوتری کی اہم نشان دہی کرتی ہے، لہٰذا یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کا معاشی ترقی پر ایک مثبت اثر تھا لیکن چھپائی نے کس طرح معاشی بڑھوتری کو آگے بڑھایا؟ ایک چیز یہ تھی کہ اس نے، اُن خبروں کے صفحات کے ذریعے جن میں مالیاتی معلومات ہوتی تھیں، قیمتوں اور شرح تبادلہ کی معلومات کو زیادہ تیز اور وسیع پیمانے پر اشاعت میں سہولت پیدا کی۔ اس کا نتیجہ مغربی یورپ کے بہت سے اہم کاروباری مراکز میں ہر جگہ مالی اتحاد پیدا کیا۔ جس نے جوابی طور پر، نئے تجارتی راستوں کے قیام اور مالی دستاویزات کے زیادہ موثر استعمال جیسا کہ تمسکاتِ ادائیگی (دیکھئے باب چہارم) میں سہولت پیدا کی۔ چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ اور معاشی ترقی کے درمیان ایک اور تعلق چھپنے والی کتابوں کی تعداد میں تیز اضافے کا تھا۔ ایلجو بُورنگ (Eltjo Buringh) اور جان لویٹن وین زینڈن (Jan Luiten Van

(Zanden (2009) کا تخمینہ یہ ہے کہ 1454 اور 1500 کے درمیان چھپنے والی کتابوں کی تعداد 12.6 ملین تھی، بمقابلہ 10.9 کے لگ بھگ مسودات کے، جو چھاپہ خانہ سے قبل کی ہزاری میں پیدا کئے گئے۔(3) چھاپہ خانہ سے پہلے کی صدی میں ایک ہزار افراد کی طرف سے کھپنے والی تعداد ایک کتاب سے بھی کم تھی۔ سولھویں صدی کے اختتام تک ایک ہزار افراد کی طرف سے دکھنے والی کتابوں کی تعداد 29 تھی۔ جوں جوں تعداد بڑھتی گئی ..... پندرھویں صدی کے اختتام تک، بڑے سے بڑے پبلشر باقاعدہ چھپائی کے لگ بھگ 1500 نسخوں کی (4) چھپائی کی دابیں نکالتے تھے.....اُن کی قیمت جڑواں طور پر گرتی تھی۔ چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کے بعد بڑی بیرونی رسد میں سب سے اوپر، کاغذ کی تیاری کے عمل میں ٹیکنالوجیاتی تبدیلیوں اور تیل پر مبنی روشنائی نے کتابوں کی قیمتوں کو پچاسی فیصد کے لگ بھگ کم کر دیا۔(5) اس چیز نے 1500 اور 1800 کے درمیان آبادی کے زیادہ بڑے حصے تک کتابوں کی رسائی مہیا کی اور بلاشبہ، یورپ کی خواندگی میں بہت زیادہ اضافے کو ممکن بنایا۔ 1500 میں یورپ میں کسی بھی قوم کے ہاں خواندگی کی شرح 10 فیصد سے زیادہ نہیں تھی، لیکن 1800 تک یہ برطانیہ عظمیٰ اور نیدرلینڈز میں 50 فیصد سے زیادہ اور مغربی یورپ کے بہت سارے حصوں میں 20 فیصڈ اور 40 فیصڈ کے درمیان ہوگئی۔(6)

چھپائی کے پھیلاؤ کی کہانی، اس کتاب میں پیش کئے گئے دلائل کے تناظر میں، ایک حقیقت کی وجہ سے دلچسپ ہے: 1480 کی دہائی میں چھاپہ خانے کے بارے میں جان لینے کے باوجود، عثمانیوں نے 1727 تک عربی رسم الخط میں چھپائی کی اجازت نہ دی۔ بظاہر، یہ واضح نہیں ہے کہ عثمانی سلطان چھاپہ خانے سے کیوں خوف کھاتے تھے۔ نا صرف یہ کہ کتابوں کی شکل میں ایک انتہائی اہم صنعت تھی جسے مصنوعی طور پر دبایا گیا تھا، بلکہ چھپائی قیمتوں کی معلومات کے ذریعے مارکیٹوں کو باہم مربوط کر سکتی تھی، اہم واقعات کی خبروں کو سلطنت کے دور دراز گوشوں تک پھیلا سکتی تھی، یا سلطان کی مہمات کے حق میں پروپیگنڈے کو پھیلا سکتی تھی۔ بلاشبہ، باغی بھی سلطان کے خلاف پراپیگنڈے کے لئے اسے استعمال کر سکتے تھے، لیکن جب تک فوج پر اُس کا کنٹرول تھا، اس وقت تک یہ ناممکن تھا۔ یہ واقعات سوالات پیدا کرتے ہیں: عثمانیوں نے اتنے طویل عرصے تک چھپائی کی ممانعت کیوں کی؟ چھاپے خانے کی قبولیت کو اتنا موخر کرنے کے اگر کوئی نتائج تھے، تو وہ کیا تھے؟



اس کتاب میں اختیار کیا گیا ڈھانچہ ان دونوں سوالات سے نمٹ سکتا ہے۔ اس حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کے لیے کہ عثمانیوں نے کیوں چھاپہ خانے کی ممانعت کی، یہ ڈھانچہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ درج ذیل سوالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے: سلطنت عثمانیہ میں چھاپہ خانہ کی ممانعت سے کس نے فائدہ اُٹھایا؟ کیا اُنہوں نے سلطان کی حکمرانی کو توسیع دی؟ کیا وہ حکمرانی کو توسیع دینے والی اُس تنظیم کے اتنے اہم ارکان تھے کہ قوانین اور پالیسیوں پر سودا بازی میں اُن کی آوازیں سُنی جاتیں؟ ''وہ کتا جو نہ بھونکا'' کی بھی ایک وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر عثمانیوں نے چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کو تین صدیوں کے لیے روک دیا، تو یورپی حکمرانوں نے چھپائی کے پھیلاؤ کو کیوں نہ روکا؟ کیا یورپی حکمران چھپائی کے پھیلاؤ کو روکنے میں بے بس تھے؟ یا کیا توسیعِ حکمرانی کے ذرائع میں ایسے گہرے اختلافات تھے، جنہوں نے یورپی حکمرانوں کو تو چھاپہ خانے کی اجازت دینے کی ترغیب دی لیکن عثمانی حکمرانوں کو ایسا کرنے کی ترغیبِ معکوس دی؟ یہ بات خیال پیش کرتی ہے کہ ٹھیک ایسے ہی اختلافات تھے، جن کی وجہ سے دونوں خطوں نے چھاپہ خانے کے بارے میں مختلف ردِعمل اختیار کئے۔

www.MashalBooks.org

# یورپ میں ابتدائی چھپائی

اس ایجاد کو گٹن برگ کی طرف سے متعارف کروائے جانے کے پانچ سال کے اندر، جو کہ اس نئی ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے والا بڑا کام تھا، گٹن برگ کی بائبل، فروخت کیلئے دستیاب تھی۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک یورپ کے 100 سب سے بڑے شہروں میں سے ساٹھ کے اندر چھاپہ خانے تھے، اور 30 فیصد ایسے شہروں میں جن کی آبادی کم از کم ایک ہزار تھی ایک چھاپہ خانہ تھا، چھاپہ خانہ کٹن برگ کے جرمنی تک مرکوز نہ تھا: تقریباً ہر قوم کے پاس، صدی کے اختتام تک کم از کم ایک چھاپہ خانہ ضرور تھا۔ (دیکھئے جدول 5.1) غالباً اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ، اس عرصے کے دوران طابعین نے 27,000 سے زیادہ ایسی تصانیف چھاپیں جو ابھی تک موجود ہیں، اور پیدا ہونے والی تصانیف کی حقیقی تعداد، غالباً اس سے بہت زیادہ ہے۔

**جدول 5.1:** مُلکوں کے حساب سے، 1500 تک چھاپہ خانہ کے حامل شہروں کی، اور شائع ہونے والی تصانیف کی تعداد

| موجودہ ملک | 1500 تک چھاپہ خانہ والے شہروں کی تعداد | چھاپہ خانہ رکھنے والے شہروں کا فیصد | 1500 تک تصانیف |
|---|---|---|---|
| آسٹریا | 1 | 11% | 84 |
| بلجیم | 8 | 20% | 808 |
| چیک ریپبلک | 6 | 33% | 63 |
| ڈنمارک | 2 | 50% | 6 |
| فن لینڈ | 0 | 0% | 0 |
| فرانس | 46 | 35% | 5,766 |



| | | | |
|---|---|---|---|
| جرمنی | 51 | 32% | 7,662 |
| آئرلینڈ | 0 | 0% | 0 |
| اٹلی | 75 | 37% | 9,881 |
| نیدرلینڈز | 13 | 34% | 1,165 |
| پولینڈ | 5 | 21% | 27 |
| پُرتگال | 5 | 17% | 29 |
| سپین | 28 | 30% | 938 |
| سوئٹزرلینڈ | 10 | 50% | 877 |
| یونائیٹڈ کِنگڈم | 4 | 6% | 398 |
| میزان | 254 | 30% | 27,704 |

ذرائع: آبادی: بائروخ اے آل۔ (1988)؛ چھاپہ خانہ:۔

فیوراینڈ مارٹن (1958)، کلیر (Clair) (1976) برٹش لائبریری (2011)؛ صرف ایک ہزار آبادی سے زیادہ والے شہروں کو مدِّ نظر رکھا گیا۔

گٹن برگ اور اُس کے معاونین نے پہلی چھپائی کی ورکشاپیں مینز (Mainz) اور اس کے گردونواح کے علاقوں میں قائم کیں۔ اُنہوں نے چھپائی کی اجارہ داری تقریباً ایک دہائی تک قائم رکھی، جب اُن کے مخالفین نے سٹراس برگ میں 1459 ۔ (7) میں ایک بائبل چھاپی۔ ابتدائی طابعین یا تو زیرِ تربیت ملازمین تھے، یا میزس گٹن برگ کے کاروباری شراکت دار تھے۔ اس ٹیکنالوجی کی حقوقِ ملکیت کی حامل نوعیت کی وجہ سے، اس میں داخلے کے لیے بہت اہم رُکاوٹیں تھیں، جن میں سے سب سے بڑی دھاتی ٹائپ کے حصول کی تھی۔ ایک متحرک دھائی ٹائپ کے لیے استعمال ہونے والے طریقِ کار میں خام دھاتوں کے ایک مخصوص مرکب کی ضرورت ہوتی تھی، جو طابعین کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاں ایک راز رہا (8) اس کا مطلب یہ ہے کہ چھپائی کی صنعت پہلی چند دہائیوں میں بمشکل ہی مقابلاتی تھی۔ چند افراد جو چھاپہ خانے کا آغاز کرنے کی تربیت اور علم رکھتے تھے ابتدائی چھپائی پر حاوی تھے، اور یہ اُن کا اپنا

www.freeislamicbooks.org

اختیار تھا کہ وہ چھاپہ خانہ کہاں قائم کریں۔ ان اسباب کی بنا پر چھپائی، اپنی پہلی چند دہائیوں میں جرمن رہی ..... 1470 کی دہائی تک، ''طابع علما'' کے ایک چھوٹے سے گروہ ..... پڑھے لکھے، عام لوگوں کے ایک گروہ نے جو چھاپہ خانوں کو چلاتے تھے اور مسودات کی ادارت کرتے تھے۔ اس صنعت پر کنٹرول حاصل کرلیا۔ طابع علما اکثر اوقات یا تو پاوری تھے یا یونیورسٹیوں کے پروفیسر تھے۔ عملی طور پر وہ سرمایہ دار تھے..... ابتدائی طابعین میں سے بہت سے ایسے مقامات پر نقل مکانی کر گئے جہاں کتابوں کی طلب سب سے زیادہ تھی: پہلے بڑے بڑے کاروباری مراکز پر اور پھر یونیورسٹیوں والے شہروں میں (9) چھپائی 1470 کی دہائی میں تیزی سے پھیلی، خاص طور پر جرمنی اور اٹلی میں شمالی اٹلی میں طلب غالباً سب سے زیادہ تھی، جو اُس وقت یورپ کا امیر ترین خطہ تھا۔ صدی کے اختتام تک چھاپہ خانہ پورے مغربی یورپ میں ہمہ گیر طور پر مستعمل تھا۔ (دیکھئے شکل 5.1)

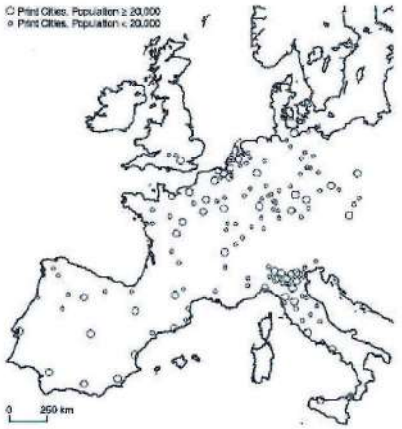


**شکل 5.1:** مغربی اور وسطی یورپ میں 1500 تک چھپائی کے شہر

جدول 5.1 نے یہ واضح کیا کہ گٹن برگ کے بعد پچاس سال کے اندر چھاپہ خانہ کس طرح تیزی سے پورے یورپ میں پھیل گیا۔ 1500 تک، 254 یورپی شہروں میں چھاپہ خانے تھے، بشمول تقریباً 30 فیصد مغربی اور وسطی یورپ کے اُن شہروں کے جن کی آبادی کم از کم



1,000 تھی۔ چھاپہ خانے مغرب یورپ کے دولت مند ترین خطوں .....اٹلی، فرانس (اُس وقت پیرس یورپ کا سب سے بڑا شہر تھا) اور زیریں ممالک ..... ساتھ ہی ساتھ جرمنی میں بہت کثرت سے تھے۔ جرمنی میں تو، منیز میں اس کی ابتدائی کی جڑوں کی وجہ سے، طباعت کا کلچر اُس کے مزاج کا ایک حصہ تھا، یہاں تک کہ سپین میں بھی، جو مغربی یورپ میں مسلم حکمرانی کے تحت، امیر ترین خطہ تھا، جس سے کہ کاروباری انقلاب کے دوران شمالی اٹلی کی شہری ریاستیں بازی لے گئیں، صدی کے اختتام تک 30 فیصد شہروں میں چھپاہ خانے موجود تھے۔ سب سے بڑے پندرہ طباعتی شہروں میں سے تیرہ یا تو اُس وقت کے معیارات کے مطابق بڑے شہر تھے (یعنی اُن کی آبادی کم از کم 20,000 تھی) یا وہ جامعاتی شہر تھے (دیکھیں جدول 5.2) یہ پندرہ شہر اُن 71 فیصد کتابوں کا سبب تھے، جو آج کے دن تک باقی ہیں ..... واضح طور پر، جبکہ طباعت کار پورے مغربی یورپ میں پھیل گئے، وہیں اُن میں سے بہت سے چند چیدہ شہروں میں مرکوز ہو گئے۔

**جدول 5.2:** 1500 سے پہلے سب سے بڑے طباعتی شہر

| شہر | 1500 تک تصانیف کی تعداد | 1500 میں آبادی | 1500 تک یونیورسٹیاں |
|---|---|---|---|
| وینس | 3,458 | 100,000 | کوئی نہیں |
| پیرس | 2,701 | 225,000 | ہاں |
| روم | 1,886 | 55,000 | ہاں |
| کولون | 1,488 | 45,000 | ہاں |
| لائپزگ | 1,324 | 10,000 | ہاں |
| لیونز | 1,320 | 50,000 | ہاں |
| آگسبرگ | 1,195 | 30,000 | نہیں |
| سٹراسبرگ | 1,115 | 20,000 | نہیں |
| میلان | 1,065 | 100,000 | نہیں |

www.MashalBooks.org

| | | | |
|---|---|---|---|
| نورمبرگ | 1,017 | 38,000 | نہیں |
| فلورنس | 765 | 55,000 | ہاں |
| بارسل | 746 | 10,000 | نہیں |
| ڈی وِینٹر | 598 | 7,000 | نہیں |
| بولونا | 530 | 50,000 | ہاں |
| اینٹورپ | 423 | 30,000 | نہیں |
| میزان | 19,658 | | |
| میزان کا فیصد | 71.00% | | |

ذریعہ: برٹش لائبریری (2011)

1500 سے پہلے چھپنے والی زیادہ تر کتابوں کی زبان لاطینی تھی (77 فیصد کی)، اگرچہ بہت سی مقامی زبانوں میں چھپتی تھیں، بشمول اطالوی کے (7 فیصد) جرمن (6-4 فیصد) اور فرانسیسی (5-4 فیصد) مذہبی تصانیف سب سے زیادہ مقبول تھیں، جو ابتدائی طور پر چھپنے والی تمام کتابوں کا تقریباً 45 فیصد تھیں، جن میں بائبل سب سے زیادہ بکنے والی کتاب تھی۔ (10) یہ چیز حیران کُن نہیں ہونی چاہیے، کیونکہ اُس وقت کے سب سے زیادہ خواندہ لوگ کلیسا کے افراد تھے۔ کلیسا طباعت کے ابتدائی گاہکوں میں سے سب سے بڑے گاہکوں میں شامل تھا۔ یہ چھاپہ خانہ کو آرڈی نینسوں کی چھپائی، مقبول عام مقدّس لوگوں کی تصانیف، حصص کی خریداریوں کے حساب، اپنی ترکی مخالف صلیبی جنگ کے پراپیگنڈے اور معافی ناموں کی چھپائی کے لیے استعمال کرتا تھا۔ مقامی کلیسا بھی کلیسا کی عبادات کے لیے کتابوں کا تقاضا کرتے تھے۔ 11 بہت سی خانقاہیں طباعت کاروں کو اپنے گوشوں میں خوش آمدید کہتے تھے، اور طباعت کاروں کو اٹلی کے چھوٹے شہروں میں مذہبی تصانیف کے لیے ایک بڑی منڈی مِل جاتی تھی۔

طلب کا ایک اور اہم ذریعہ تاجروں کی طرف سے تھا، جنہیں ریاضی کی کتب کی خواہش تھی مغرب میں ریاضی کی سب سے پہلے چھپنے والی کتاب، ٹرائز یولیسو اریتھ میٹک (Treuiso 1478 Arithmetic) میں شائع ہوئی، اور اقلیدس کی تصانیف سب سے پہلے وینس میں 1482 میں



شائع ہوئی۔ (12) شمالی اٹلی نے زیادہ تر ابتدائی ریاضی کے مقالہ جات چھاپے، کیونکہ یہی وہ جگہ تھی جہاں تاجرانہ سرگرمیاں سب سے زیادہ تھیں اور اس لئے ایسی تصانیف کی طلب بھی سب سے بڑھ کر تھی۔ اقلیدس کے 1519 کے پُرتگالی ایڈیشن کا انتساب، تاجروں کے لیے طبع شدہ تصانیف کی اہمیت کی عکاسی کرتا ہے: ''میں یہ حساب کی کتاب اس لئے طبع کر رہا ہوں کیونکہ، پُرتگال میں یہ چیز، ہندوستان، فارس، عرب، حبشہ اور اُن دوسرے مقامات کے ساتھ جنہیں ہم نے دریافت کیا ہے، سوداکاری کے لیے ضروری ہے۔ (13)

حکام کی طرف سے طباعت کے پھیلاؤ کو سُست کرنے یا جو کچھ طبع ہو رہا تھا، اُس کو کنٹرول کرنے کے لیے کچھ کوششیں ہوئیں۔ خاص طور پر کلیسا نے اُن کتابوں کے پھیلاؤ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جو اس کے مفادات کو چیلنج کرتی تھیں 1479 میں، یورپ سِکسٹس چہارم نے کولون کی یونیورسٹی کو اُن طباعت کاروں کی مذمت کرنے کی اجازت دی، جو وہ کچھ طبع کر رہے تھے جنہیں وہ زندیقیت کی کتابیں سمجھتے تھے۔ اس چیز نے اگلی صدی کے دوران کلیسا کی پالیسی کی پیش آگاہی کر دی۔ پوپ نے 1487 اور 1501 میں کلیسا سے اخراج اور ہمہ گیر احتساب کی اجازت دینے کے لیے فرامین جاری کئے، اور پوپ لیو دہم نے ایک ایسا فرمان جاری کیا جس نے کلیسا کی اجازت کے بغیر کسی کتاب کی اشاعت کی ممانعت کر دی۔ 14 کلیسا نے 1490 کی دہائی کی ہسپانوی مذہبی عدالت کے دوران متعدد ملحدانہ کتابوں کو روک دیا، اور اس نے 1559 میں دا انڈیکس لبورم پروہبیٹورم (Index Librorum Prohibitorum) ''ممنوعہ کتب کی فہرست'' جاری کر دی۔ اس نے پروٹسٹنٹ مجموعہ تحاریر کے فرانسیسی پبلشروں کو سزائے موت دلوائی۔ اسی طرح بادشاہوں نے بھی کچھ خاص قسم کی کتابوں کی ممانعت کی۔ ہنری ہشتم نے جب انگلستان میں تحریک اصلاحِ کلیسا شروع کرنے کی کوشش کی تو اُس نے 1530 کی دہائی میں ممنوعہ کتب کی ایک فہرست شائع کی اور 1538 میں انگلستان نے انگلش میں لکھی ہوئی کتب کی درآمد پر پابندی لگا دی۔ خصوصی مفادات، جیسا کہ انگلستان میں سٹیشنرز جنہیں بادشاہ نے پورے انگلستان میں طباعت کی اجازت داری عطا کی تھی، بھی طباعت کے

www.MashalBooks.org

بعض پہلوؤں کو روکنے کے قابل ہوگئے، اور بعض اوقات وہ تشدد سے ایسا کرتے تھے۔ (15) لیکن طباعت کار بہت آسانی سے زیادہ تر احتساب سے فرضی ناموں، مقام طباعت کا غلط اعلان کرکے یا ایسی جیسی کتابیں چھاپ کر جو سنسر شپ سے آسانی سے چھپائی جاسکتی تھیں، سنسر شپ کی پابندیوں سے احتراز کرسکتے تھے۔ آخر کار یورپ میں سنسر شپ کمزور ہوگئی اور طباعت کار سزا کے خوف کے بغیر کتابیں چھاپتے رہے۔



# سلطنتِ عثمانیہ میں طباعت کے ضابطے

2012 میں میں نے ماہرینِ معاشیات میٹین کاسگل (Metin Cosgel) اور تھامس مَیسیلی (Thomas Miceli) (16) کے ساتھ دو مقالہ جات شائع کئے، جنہوں نے اُس مسئلے سے بحث کی جو اس بات کے شروع میں پیش کیا گیا ہے: عثمانیوں نے چھاپہ خانہ کا علم 1480 کی دہائی سے رکھنے کے باوجود 250 سال کیوں اسے دبائے رکھا؟ اس معمے کے بارے میں ہمارے جواب کو سمجھنے کے لیے، کچھ تاریخی پس منظر ضروری ہے۔

عثمانیوں کو چھاپہ خانے کے بارے میں پہلی دفعہ بایزید دوم (عہد 1481-1512) کے عہد میں، علم ہوا۔ واقعات کے ایک بہت جانے پہنچانے لیکن ابھی تک متنازعہ، متن کے مطابق، بایزید دوم نے 1485 میں، عثمانی ترکی میں طباعت پر پابندی لگانے کا ایک حکم جاری کیا۔ (17) اُس کے بیٹے سلطان سلیم اول نے 1515 میں اس فرمان کی تجدید کی۔ اُس حکم میں یہ بیان کیا گیا کہ ''کسی شخص کا اپنے آپ کو طباعت کے علم سے آراستہ کرنا موت کی سزا کا مستوجب ہوسکتا ہے۔'' (18) اس فرمان کا اثر اس کی تدوین کے ایک صدی بعد واضح ہوا: سترھویں صدی میں ہنگری کے عثمانی وقائع نگار پیک کے باسی ابراہیم نے کھل کر اس بات پر حیرت کا اظہار کیا کہ عربی اور عثمانی ترکی زبانوں میں کتب کیوں دستیاب نہیں ہیں۔ (19)

متفقہ خیال کے مطابق طباعت پر پابندی کا اطلاق اُس مسلمان رعایا پر ہوتا تھا جو عربی رسم الخط میں طباعت کرتے تھے، جو کہ نہ صرف پورے مذہب اسلام کا سرکاری رسم الخط تھا، بلکہ عثمانی ترکی زبان کا بھی رسم الخط تھا۔ مذہبی اقلیتیں، چھاپہ خانے لگانے کے لیے اس وقت تک آزاد تھیں جب تک وہ غیر اسلامی موضوعات پر اور غیر عربی رسم الخط میں کتب چھاپیں۔ اس طرح، عثمانیوں نے سپین اور پُرتگال سے آئے ہوئے یہودی تارکین وطن کو 1493 میں استنبول میں ایک چھاپہ خانہ لگانے کی اجازت دی، اور اُنہوں نے جلد ہی عبرانی رسم الخط میں تورات اور دوسرے مذہبی

www.KitaboSunnat.com

اور غیر مذہبی متون کی اشاعت کی۔ آرمینیاؤں نے 1560 کی دہائی میں ایک چھاپہ خانہ لگایا، جو غیر ملک سے منگوائے گئے حروف کی شکلوں کے ساتھ آرمینیائی حروفِ تہجی میں کتب کی طباعت کرتے تھے جبکہ ایک یونانی قدامت پسند درویش 1627 میں پہلا یونانی چھاپہ خانہ استنبول میں لے آیا۔ 20 1610 میں، تیونسی عیسائیوں نے قزاحیہ کے شہر میں عہد نامۂ عتیق کے گیتوں کو عربی میں طبع کیا (اسیریائی ٹائپ کو استعمال کرتے ہوئے (21)

1727 تک ہی یہ ہوا کہ ایک عثمانی سلطان نے عربی رسم الخط میں چھپائی کے قابل ایک چھاپہ خانہ قائم کرنے کی واضح طور پر منظوری دی ابراہیم متفرقہ نامی ایک ہنگرین نومسلم نے اپنے شراکت دار سعید آفندی کے ساتھ کاروبار شروع کیا۔ اور اُنہیں ایک فرمان ملا جس میں اُنہیں عربی میں چھپائی کرنے کی اجازت دی گئی، تاوقتیکہ مذہبی اور تصانیف کی طباعت نہ ہو۔ اُن کے پہلے کام عملی نوعیت کے تھے۔ جس میں نقشے، گرامر کی کتابیں اور لغات شامل تھیں۔ (22) لیکن اُن کے چھاپہ خانہ نے صرف سترہ کتابیں تئیس جلدوں میں طبع کیں، اور یہ 1745 تک بند ہوگیا، جس کے بعد سلطنت میں اُنیسویں صدی تک طباعت بالفعل رُک گئی۔ لیکن ابراہیم متفرقہ اور سعید آفندی کو اجازت بخشنے والے فرمان میں استعمال کی گئی زبان سے کچھ ادراک حاصل کرنا ممکن ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ سلطان ایک بڑی پابندی کو اُٹھا رہا تھا۔ اس فرمان میں یہ بیان کیا گیا کہ نئی ٹیکنالوجی کی ''نقاب کشائی ایک دُلھن کی طرح کی جائے گی اور دوبارہ اسے نہیں چھپایا جائے گا۔ (23)

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابتدائی فرامین نے، اُن کے ابتدائی اطلاق اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں ایک چھاپہ خانہ کی واضح اجازت کے درمیان کی ڈھائی صدیوں کے عرصے میں، عربی رسم الخط میں طباعت کو روکنے میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کیا۔

عثمانیوں کی چھاپہ خانے اپنانے میں ناکامی، معاشی اور ٹیکنالوجیاتی تاریخ کا، خطا کئے جانے والے بڑے مواقع میں سے ایک موقع تھا۔ مغربی یورپ میں، چھاپہ خانے نے ایسے بہت سے معاشی اور تعلیمی مواقع مہیا کئے جن کا چھاپہ خانہ سے پہلے تصور بھی نہیں تھا۔ لہٰذا عثمانیوں نے اس ٹیکنالوجی پر پابندی کیوں لگائی؟ دو امکانات تو پابندی کے پیچھے قوت متحرکہ طور پر فوری طور پر۔ قابل نظر اندازی ہیں۔ پہلی، طبع شدہ تصانیف کی غیر موجودگی محض عربی رسم الخط کی ندوت کی



عکاسی کرتی تھی۔ اگرچہ یہ بات یقینی ہے کہ عربی رسم الخط لاطینی رسم الخط کی نسبت زیادہ چیلنج پیش کرتا ہے۔ لیکن یورپیوں نے تیزی سے کسی بھی قسم کی رُکاوٹوں پر قابو پالیا۔ 1530 تک، وینس کے طباعت کاروں نے، عثمانیوں کے چھاپہ خانہ کی اجازت دینے سے بہت پہلے، قرآن کو عربی میں طبع کرلیا تھا۔ اور اطالویوں اور پیرس والوں نے بھی عربی رسم الخط میں طباعت کی صلاحیت رکھنے والے متعدد چھاپہ خانہ قائم کرلئے تھے۔ پوپ جولیئس دوم (عہد 1513-1503) کے پاس 1514 میں عیسائی عبادات پر عربی میں طبع شدہ ایک کتاب موجود تھی، اور جینووا کے طباعت کاروں نے 1516 میں داؤدؑ کے گیتوں کا ایک عربی ایڈیشن طبع کرلیا تھا۔ دونوں ایڈیشین غالبًا عربی بولنے والے عیسائی طبقات کے لیے تھے۔ تین مشہور عربی میں اشاعت کرنے والے چھاپہ خانے پوری سولھویں اور سترھویں صدیوں کے دوران اٹلی میں قائم رہے: ایک مڈیچی چھاپہ خانہ تھا، جو عیسیٰؑ کی تعلیمات اور عربی میں گرامر کی کتابیں چھاپتا تھا۔ (24)

یہ تینوں کے تینوں اشاعت گھر ایسی تصانیف شائع کرتے تھے جو عثمانی صارفین کے لیے مطلوب ہوتی تھیں۔ بلاشبہ، اُنیسویں صدی تک، عربی میں طبع ہونے والی بہت سی کتابیں یا بائبل تھیں یا دوسرا عیسائی ادب تھا (25)۔ الغرض، یورپ میں چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کے بعد، کاروباری طباعت کاروں کو عربی رسم الخط میں طباعت سے منسلک کسی قسم کی ٹیکنالوجیاتی مشکلات پر قابو پانے میں زیادہ وقت نہ لگا۔

دوم، یہ چیز، بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ میں چھاپہ خانہ کی عدم موجودگی کا سبب، اس میں مطبوعہ مواد کی طلب میں کمی تھا۔ یہ بات ممکنہ طور پر صحیح ہے کہ کتابوں اور کتابچوں کی طلبِ سلطنتِ عثمانیہ میں مغربی یورپ کی نسبت کم تھی اور یہ عین ممکن ہے کہ کمزور طلب نے مستقبل کے پبلشروں کے چھاپہ خانہ قائم کرنے کے جذبہ محرکہ کو ماند کردیا ہو۔ اگرچہ کوئی قابلِ اعتماد تخمینے نہیں ہیں، لیکن مورخین عام طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ سلطنت عثمانیہ میں ابتدائی جدید دور میں خواندگی کی شرح بہت کم تھی: یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کی ابتدا تک عثمانی شروح خواندگی 3-2 فیصد کے لگ بھگ تھے، جبکہ شرحِ خواندگی یورپ کے بہت سے حصوں میں 1500 تک بھی اس سے دُگنی یا تگنی تھیں (26) اسی دوران میں، چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد والی صدی میں پرانے استنبول میں تربیت یافتہ اور غیر تربیت یافتہ دونوں کے حقیقی معاوضہ جات،

یورپ کے بڑے شہروں میں معاوضہ جات کی نسبت نصف یا اس سے معمولی سے زیادہ تھے 27 کیونکہ کتابیں ایک سامانِ تعیش تھیں۔ لہذا کم تر شرحِ خواندگی کے ساتھ ساتھ کم تر معاوضہ جات نے کتابوں کی طلب کو ضرور ماند کر دیا ہوگا۔

لیکن یہ بات بالکل نا قابلِ تسلیم ہے کہ عربی میں طبع شدہ کتابوں کی طلب، اتنی قابلِ نظر اندازی تھیں کہ وہ سلطان کی طرف سے عائدہ شدہ پابندیوں کی عدم موجودگی میں، طباعت غیر نفع مند ہو جاتی۔ یورپی تجربے نے یہ بات ظاہر کی کہ مذہبی متون کی طلب، خاص طور پر بائبل کی، قطع نظر شرحِ خواندگی یا اشاعتی زبان کے، بہت زیادہ تھی۔ مغربی یورپ میں، ناخواندہ لوگ بھی بائبل کو اپنے پاس رکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ یہی بات قرآن کے بارے میں، عثمانی آبادی کے ایک حصے کے بارے میں یقیناً ٹھیک تھی، یہاں تک کہ اُن لوگوں کے بارے میں بھی جو عربی پڑھنا یا بولنا نہیں جانتے تھے۔ علاوہ ازیں چھاپہ خانہ کی ایجاد سے بہت پہلے مسلمانوں کی لائبریریاں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اسلام کی پہلی چار صدیوں میں، مشرقِ وسطیٰ میں دُنیا کی بعض بڑی لائبریریاں موجود تھیں، آٹھویں صدی کے وسط میں اسلامی دُنیا میں سمرقند میں کاغذ کے متعارف ہونے کے بعد (مغرب میں اسی کے متعارف ہونے سے تقریباً پانچ صدیاں بیشتر) کاغذ کی ملیں پورے مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں تیزی سے پھیل گئیں، اور ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخوں کے ذریعے اشاعت ایک اہم صنعت بن گئی۔ نسخہ نویسوں کی تعداد کتب فروشوں کے ساتھ ساتھ دُگنی ہوگئی۔ اور کم از کم تیرھویں صدی تک، بغداد، دمشق قاہرہ، غرناطہ اور فیض میں بہت بڑی کتابوں کی دُکانیں موجود تھیں۔ 28 نتیجتہً، چھوٹے بڑے شہروں میں مسجد لائبریریاں وجود میں آگئیں اور نجی اور سرکاری لائبریریاں وسیع پیمانے پر پھیل گئیں۔ تیرھویں صدی میں بغدداد، دمشق، قاہرہ، شیراز، فیض، سمرقند، بخارا اور قرطبہ میں بڑی بڑی لائبریریاں موجود تھیں۔ (29) اگرچہ منگول حملوں نے ایسی بعض لائبریریوں کو تباہ کر دیا، اور یہ ممکن ہے کہ دوسری لائبریریاں مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کے جامد ہونے کے بعد استعمال میں نہ رہی ہوں لیکن یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ ایک ایسی ثقافت میں کسی مہم جو طباعت کار کے لیے طباعت غیر نفع بخش ہو۔ بلاشبہ ضیاء الدین سردار (صفحہ 15، 1993) یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''تقریباً آٹھ سو سال تک (چھاپہ خانہ کی ایجاد سے پہلے)، مسلم تہذیب حقیقی طور پر ایک کتاب کی تہذیب تھی: جس کی بنیاد ایک کتاب (قرآن) نے رکھی تھی



.....اس کا بنیادی مقصد.....اس کی سرحدوں کا دفاع کرنا یا اُن کی توسیع کرنا نہیں تھا۔ بلکہ کتابوں کی طباعت اور اُن کی تقسیم تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پندرھویں صدی کے اواخر میں، عثمانی اور مصری مملوک سلطنتوں میں، عباسی سلطنت کے عروج میں موجود، ماحول سے مختلف ذہنی ماحول تھا، لیکن اسلامی ثقافت میں کتابوں کی اہمیت یہ ظاہر کرتی ہے کہ، اس وقت جب عثمانیوں نے پہلے پہل گٹن برگ کی ایجاد کے بارے میں سُنا، کتابوں کی کوئی ناپُختہ طلب رہی ہوگی۔

زیادہ امکان اس بات کا بھی ہے کہ طبع شدہ کتب کی کم طلب، چھاپہ خانہ پر پابندیوں کے ساتھ مل گئی ہو، اور اس طرح اس نے مستقبل کے طباعت کے نفع نقصان کے حساب کو اس طرح خم دیا ہو کہ وہ عربی میں طباعت کرنے والے چھاپہ خانہ قائم کرنے سے دور ہٹ گیا ہو۔ اگر کتابوں کی طلب واقعتاً کم ہوتی، تو چھاپہ خانہ قائم کرنے کے فوائد اتنے کم ہوں گے، اگرچہ صفر سے بہت بعید ہوں گے۔ کہ وہ سلطان کے فرمان کی خلاف ورزی کرنے میں چھپے بڑے نقصانات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ ان عوامل نے اکٹھے ہو کر ''عربی رسم الخط میں صفر چھپائی کے توازن'' کو جنم دیا: طلب مثبت تھی، لیکن اتنی زیادہ نہ تھی کہ کوئی مستقبل کا طباعت کار طباعت کے بڑے اخراجات کو برداشت کر سکتا۔

یہ ادراک اس حقیقت کی وضاحت کرنے میں بھی مدد دے سکتا ہے کہ 1485 میں اصل حکم کی تدوین اور 1727 میں اس کی حتمی اجازت کے درمیان کے 242 سالوں میں پابندی کے اطلاق کی کوئی براہِ راست شہادت کیوں نہیں ملتی۔ ثانوی مجموعہِ تحاریر مجموعی طور پر، 1485 اور 1515 میں اصل فرمانوں کا ذکر کرتا ہے اور پھر دو صدیوں کی چھلانگ لگا کر ابراہیم متفرقہ کے چھاپہ خانے پر پہنچ جاتا ہے۔ اس مجموعۂ تحاریر نے گہرائی میں جا کر کوئی ایسی براہِ راست شہادت پیش نہیں کی ہے، کہ اس درمیانی عرصے میں کسی مسلمان نے عربی رسم الخط میں طباعت کرنے والے چھاپہ خانہ قائم کرنے کی درخواست دی ہو اور عثمانی حکومت نے اس سے انکار کیا ہو۔ لیکن بہر حال ایک شخص ٹھیک یہی توقع کر سکتا ہے اگر سلطان کا عربی رسم الخط میں کسی چھاپہ خانے کو قبول کرنے کا امکان نہ ہو، اور بہر حال طلب بھی کم ہو، تو اوّل تو کسی کاروباری شخص کے لئے چھاپہ خانہ کھولنے کا جذبہ محرکہ ہی کم ہوتا ہے۔ یہ مختلف قوتوں کے درمیان ایک توازن کا عمل ہے۔ بعض اووقات توازن کے اعمال کو سمجھنا، معاشی تاریخ میں، مشکل ہوتا ہے کیونکہ یہ عمل اصل میں بے عملی

ہوتا ہے: اگر عربی رسم الخط میں طباعت کرنے والے چھاپہ خانے کے قیام کے لیے کوئی محرک ہی نہ ہو، تو ہمیں چھاپہ خانے کی ممانعت کرنے والے زیادہ فرمان (اگر کوئی ہوں بھی) نہیں ملیں گے، کیونکہ کسی ایسے فرمان کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ وہ سب کچھ جس پر ہم تکیہ کر سکتے ہیں، وہ 1727 کی فرمان کے زبان ہے، جس نے آخر کار چھاپہ خانے کی اجازت دی، جس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ عثمانیوں کی پالیسی میں ایک بڑی تبدیلی تھی۔

عثمانیوں کی معیشت کی بدقسمتی کہ اس ''طباعت کی نفی'' کے اتفاقِ رائے کے اہم جز کے نتائج تھے۔ یہ تصور کرنے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی کہ چھاپہ خانے کے تعارف نے کس طرح ''ایک دائرۂ خیر'' کی سہولت کاری کی ہوتی...... جیسا کہ اس نے یورپ میں کی...... جس سے، چھاپہ خانے کی وجہ سے بڑھنے والی خواندگی کتب کی طلب مزید بڑھائی، جو جوابی رسد کا سبب بنتی، جو مزید خواندگی کو بڑھاتی اور علیٰ ہذا القیاس۔ جب تک کتابوں کی کوئی ابتدائی طلب ہوتی، یہ کم از کم کسی ایک فرم کے لیے اس صنعت میں داخل ہونے کے لیے اور ایک ''دائرہ خیر'' شروع کرنے کے لیے نفع بخش ہوتی۔ لیکن دائرۂ خیر صرف اُس وقت شروع ہوسکتا، اگر ایک فرد کے اندر ایک چھاپہ خانہ قائم کرنے کا جذبۂ محرکہ ہوتا۔ کمزور طلب اور طباعت کے خلاف بھاری پابندیوں کا مطلب یہ تھا کہ کسی ایک فرد میں ایسے عمل کو حرکت میں لانے کا جذبۂ محرکہ غیر موجود تھا۔

اس تاریخ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ عثمانی سلطان طباعت کے مجموعی طور پر خلاف نہیں تھا۔ بلکہ صرف عربی رسم الخط میں طباعت کے خلاف تھا۔ یہ اس بات کا ایک سُراغ ہے کہ طباعت پر پابندیوں کے اسباب کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ اس کی کنجی درج ذیل سوالات کے جواب میں ہے: عربی رسم الخط میں بڑے پیمانے پر طباعت کس کے لیے خطرہ تھی؟ کیا یہ شخص یا گروہ اتنا طاقتور تھا کہ سلطان کو طباعت کے پھیلاؤ سے روک سکتا، باوجود اس امر کے کہ سلطان اس نئی اور اہم ٹیکنالوجی کو روک کر ٹیکس کے محاصل اور معاشی ترقی سے محروم ہو رہا تھا؟



# عثمانیوں نے چھاپہ خانہ کو کیوں روکا؟

اس بات کو آشکار کرنے کے لیے کہ عثمانی سلطانوں نے ایک ایسی ٹیکنالوجی کی راہ کیوں روکی جس کے اتنے واضح فوائد تھے، میٹن کوسگل (Metin Cosgel)، تھامس میسیلی (Thomas Miceli) اور میں نے اس دور کی تاریخ کو کھنگالا۔ ہمارا بڑا ہدف یہ تھا کہ چھاپہ خانے سے کسے نقصان پہنچتا۔ اور آیا کہ اُن کے پاس اتنی طاقت تھی کہ وہ سلطان کو اس کا راستہ روکنے پر آمادہ کر سکتے۔ باب 2 میں پیش کردہ منطق یہ اشارہ کرتی ہے کہ تلاش کرنے کی اچھی جگہ وہ افراد یا گروہ ہیں جو سلطان کی حکمرانی کو توسیع دیتے تھے۔

اپنے مسلمان پیشروؤں کی طرح، عثمانی بھی اپنے اقتدار کو توسیع دینے کے لیے مذہبی جواز بخشی پر بہت زیادہ انحصار کرتے تھے۔ اگرچہ عثمانی پیغمبرؐ کے ساتھ خونی رشتے کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے...... بلاشبہ وہ تو عرب بھی نہیں تھے...... لہٰذا ''اسلام پر عمل کرنے'' کے ساتھ منسلک جواز بخشی کے فوائد اتنے زیادہ تھے، کہ اُن کے لیے ان کو نظرانداز کرنا ناممکن تھا۔ محمد دوم کے 1453 میں قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد یہ بات خاص طور پر ٹھیک تھی، جو کہ ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بازگشت پوری مسلم دُنیا میں سُنائی دی۔ حلیل انلکیک Halil Inalcik (1973، صفحہ 56) یہ دعویٰ کرتا ہے:

''قسطنطنیہ کی فتح کے ساتھ محمد دوم انتہائی باوقار مسلم حکمران بن گیا۔ عثمانی اسے پہلے چار خلفا سے لے کر اب تک عظیم ترین اسلامی حکمران خیال کرتے تھے اور اسلامی دُنیا جہاد کو طاقت اور اثر ورسوخ کا عظیم ترین ذریعہ سمجھتی تھی۔ فاتح محمد نے اپنے آپ کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جہاد کرنے والا سمجھا: ''یہ مصائب خدا کی خاطر ہیں۔ اسلام کی تلوار ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم ان مصائب کو برداشت کرنے کو اختیار نہ کرتے تو ہم غازی کہلانے کے قابل نہ ہوتے۔ ہم قیامت کے دن خُدا کے سامنے کھڑے ہونے سے شرمندہ ہوتے۔''

بعد میں، سلیم اوّل نے مصری مملوکوں کی سلطنت کو فتح کیا، جس کی حکومت مکہ اور مدینہ کے

مقدس شہروں پر تھی۔ اس نے عثمانی سلطان کے مرتبے کو مزید اُونچا کر کے اسلام کے محافظ کا درجہ دے دیا۔ ان واقعات نے مذہبی جواز بخشی اقتدار کی قدر و قیمت مزید بڑھا دی، جو مذہبی حاکمیت سلطان کو عطا کر سکتی تھی، جب تک کہ وہ اسلام پر عمل کرتا۔ نتیجتاً اگرچہ سلطان اپنی نجی زندگیوں میں اتنے پارسا نہ تھے۔ بہت سے الکوحل سے لطف اندوز ہوتے تھے، حالانکہ یہ اسلامی قانون کے مطابق ممنوع ہے...... لیکن اُنہوں نے اسلام کے مطابق عمل کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کھلے بندوں مذہبی اشارے کرنے میں کبھی کوئی عار نہ سمجھی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے عثمانی سلطانوں کے لیے ایسے افعال، جیسا کہ جمعہ کے روز مسجد میں جانا، رمضان کے روزخوروں کے کو سزا دینا، شراب خانے اور قحبہ خانے بند کرنا، مدارس اور مساجد بنانا، اور ہر سال مکہ اور مدینہ کو سونے کے تحائف بھیجنا، بہت عام تھے۔ (30) وہ خاص طور پر، عوامی حمایت حاصل کرنے کے لیے، غیر سُنیوں کے خلاف جنگ کے دوران اپنے مذہبی اوصاف کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے، حزبِ مخالف کے طاقتور ذرائع کو کمزور کرتے، وہ قدامت پسند مذہبی علما کی حمایت حاصل کرنے کی عادت کا شکار تھے۔ مثال کے طور پر، سولھویں صدی میں (ایرانی) شیعہ صفوی سلطنت کے خلاف جنگوں میں، سلطان نے مذہبی حاکمیت کو ساتھ شامل کر لیا، تاکہ وہ دوسرے مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مذہبی جواز مہیا کر سکیں، اور عثمانیوں کو قدامت پسند اسلامی عقیدے کے محافظین کے طور پر پیش کر سکیں۔ (31)

اس کتاب میں تجویز کردہ ڈھانچہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ، مذہبی حاکمیت سلطان کے مقابلے میں شاندار سودا بازی کی پوزیشن میں تھی کیونکہ عثمانی مذہبی علما سلطان کے جوازِ اقتدار کے بنیادی، سستے اور انتہائی موثر ذرائع تھے۔ لہٰذا اگر وہ چاہتے تو انہیں چھاپہ خانہ کو روکنے پر آمادہ کرنے کی قوت تھی۔ لیکن کیا مذہبی حاکمیت کے اندر چھاپہ خانہ کو بند کروانے کی کوئی خواہش موجود تھی؟ بہر حال یورپی تجربہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کلیسا، اس نئی ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے والے اوّلین لوگوں میں شامل تھا۔ اگر عثمانی مذہبی حاکمیت کے محرکات کلیسا سے مختلف تھے، تو وہ کیا تھے اور کیوں تھے؟

متعلقہ تاریخ کے سرسری مطالعے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ عثمانی مذہبی حاکمیت کے اندر، سلطان کو چھاپہ خانہ کے قیام سے روکنے کے لیے خاصا جذبۂ محرکہ موجود تھا...... کم از کم



ایسے چھاپہ خانوں کیلئے جو عربی رسم الخط میں طباعت کرتے تھے۔ چھاپہ خانے کا تعارف، مسلمان آبادی پر اس کے اثر ورسوخ کے ایک اہم ترین ذریعے کو کھو دینے کا سبب بنتا: یعنی مذہبی علم کی ترسیل پر اس کی اجارہ داری کو۔ چھاپہ خانہ کے متعارف ہونے سے پہلے، مسلم دُنیا میں مذہبی علم کی ترسیل زیادہ تر زبانی عمل سے ہوتی تھی، جس پر مذہبی حکام حاوی تھے۔ یہ بات خاص طور پر عثمانی سلطنت کے بارے میں صحیح تھی۔ جہاں اس کے بہت سے باشندے......اور بلکہ سلطان خود بھی ......مادری عربی بولنے والے نہیں تھے، اور لہٰذا اُنہیں قرآن اور دوسرے بڑے عربی کے متون کی تشریح کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔ اوّلین اسلامی صدیوں میں، کتاب چھاپنے کا عمل بہت محنت طلب تھا اور اس پر مسجدوں اور مدرسوں میں پڑھانے والی مذہبی حاکمیت کا کنٹرول تھا۔ مذہبی علما درج ذیل طریقے پر کتابیں تخلیق کرتے تھے۔ پہلے، ایک معروف مذہبی عالم ایک کتاب کسی کاتب کو املا کرواتا تھا، اپنے حافظے سے یا اپنی ہی تحریروں سے، کئی ہفتوں یا مہینوں میں۔ پھر، یہ عالم عام لوگوں میں اس کتاب کو پڑھوا کر سنتا تھا کہ کاتب نے کیا لکھا، یا وہ خود اس کو پڑھتا تھا، اور بار دگر پڑھنے کے دوران ترامیم کرتا تھا۔ پھر وہ ایک اجارہ (کتب کی آگے ترسیل کرنے کے لیے ایک لازمی قانونی تقاضا) کے ذریعے اسے مستند قرار دیتا تھا، جو اسے جائز بنا دیتا تھا۔ جب ایک مرتبہ ایک عالم ایک کتاب کو نقل کرتا تھا، تو اس کے پاس اسے مدرسہ کے نصاب میں داخل کرنے کا اختیار رہتا تھا، اور وہ دوسروں کو اس کو نقل کرنے کا موقع دیتا تھا۔ اکثر اوقات اُس کے شاگرد اسے یاد کر لیتے تھے؛ بہت سے علما اسلامی متون کو قافیہ ردیف میں لکھتے تھے تاکہ اس عمل کو آسان بنا سکیں، جواباً، علما کتب کو اُس عالم اور اُس کے پیشرووں کی طرف سے ترسیل شدہ سمجھتے تھے۔ اجازہ کی دستاویز اُن تمام ناموں کی فہرست دیتی تھی جنہوں نے ماضی میں اس کتاب کو آگے منتقل کیا، یہاں تک کہ اس کتاب کا اس کے اصل مصنف تک کھوج لگایا جاسکتا تھا۔ یہ چیز ترسیل اور سند کا ایک ایسا مسلمہ سلسلہ تخلیق کرتی تھی، جسے حاصل کرنے کی صلاحیت صرف اعلیٰ تربیت یافتہ مذہبی علما میں ہوتی تھی۔ (32) علما نے اس طریقے پر بے شمار کتب شائع کیں، جن کا مسوّدہ قدیم ترین تھا، جو اب تک موجود تھا، جو 874 میں شائع ہوا تھا۔ (33)

اسلام میں زبانی ترسیل کی اہمیت عثمانیوں سے بہت پہلے سے ہے۔ محمد ﷺ کے اصحاب نے حدیث کی ترسیل زبانی کی جو کہ قرآن کے بعد مذہب اسلام کا اہم ترین ذخیرہ ہے۔ صحابہ کے

www.MashalBooks.org

بعد علما کی ایک غیر منقطع زنجیر ہے جنہوں نے حدیث کی ترسیل کی۔ حدیث کے مجموعہ کے مجموعہ تحاریر کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، لیکن اسلامی روایت کا حصہ وہ احادیث ہیں جو معتبر ترین ہیں، ایک حدیث اعتبار اُس وقت حاصل کرتی ہے جب اُسے معتبر افراد منتقل کریں ..... وہ لوگ جو درستی، بااعتمادی، اخلاقِ حسنہ، اور سیاست سے آزادی کے لیے مشہور ہوں۔ (34) لہٰذا شخصی، زبانی ترسیل نے اسلام کے ابتدائی اصولوں کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

قبل از عثمانی دور کے بہت سے علما نے، ذاتی طور پر علم حاصل کرنے کے لیے پوری مسلم دُنیا کا سفر کیا۔ لکھاریوں شمالی افریقہ، سپین، اناطولیا اور مشرقِ وسطیٰ کے سفیروں کی اجازہ کے حصول کے لیے بہت مشہور مثالیں ہیں۔ مثال کے طور پر، ہسپانوی، صوفی ابن عربی (پیدائش 1165) نے، شخصی قابلِ اعتماد اسلامی علم کی ترسیل کی تلاش کے لیے آج کل کے سپین، (مُرسیہ، اشبیلیہ، المیریا، قرطبہ) تیونسیہ (تیونس)، مراکش (فیض) مصر (قاہرہ)، اسرائیل (یروشلم) سعودی عرب (مکہ) عراق (بغداد، موصل) ترکی (ملاٹیا، سیواس، اقصارے، قونیہ) اور شام (دمشق) کا سفر کیا۔ (35) اجازہ کی شخصی نوعیت کی اہمیت درج ذیل دسویں صدی کے اجازہ سے واضح ہے: ''میں اپنی کتاب اپنے ہاتھ کی تحریر کے ساتھ آپ کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ میں آپ کو نظم کی اجازت دیتا ہوں، اور آپ اسے میری طرف سے آگے پہنچا سکتے ہیں۔ اسے سنے جانے اور پڑھے جانے کے بعد کتاب کی شکل میں لایا گیا ہے۔'' (36)

کیونکہ چھاپہ خانہ سے ایک یا دو صدی پیشتر، تحریری متون کے پھیلاؤ نے مذہبی علما کے عوام پر اثر کو ختم کرنے کا خطرہ پیدا کر دیا، لہٰذا اُنہوں نے، علم کی عوام تک ایماندارنہ ترسیل اور ابلاغ کا مفہوم آہستہ آہستہ تبدیل کر دیا۔ علم کے صحیح عالم بننے کے لئے ایک شخص کو درج ذیل چیزیں جاننے کی ضرورت ہوتی تھی: قرآن (زبانی) عربی ادب کی ایک بہت بڑی مقدار، ان تصانیف کا محمد ﷺ کی زندگی سے تعلق (سُنہ) قدیم فقہا کی طرف سے کی گئی قرآن کی تفاسیر، ہزاروں احادیث کا زبانی یاد ہونا، اور اسلامی قانون کی سائنس کا بنیادی علم۔ (37) اس چیز نے مذہبی اصول کی تشریح کو کلیتہً مذہبی فقہا کے دائرہ اثر میں رہنے میں مدد دی ..... صرف وہ شخص جس نے پوری زندگی اسلامی اصول اور قانون کا مطالعہ کرنے میں صرف کی جبکہ نئی تشریح کرنے (اجتہاد) کے منفی دہلی اثرات کو تکمیل تک پہنچانا مشکل تھا۔ (38)



مذہبی حاکمیت، لائبریریوں میں پھیلائی گئی کتب کی معلومات کو روک کر اُنہیں کنٹرول کرنے کے قابل تھی۔ اگرچہ مذہبی حکام، نجی لائبریریوں میں مداخلت نہیں کرتے تھے، لیکن جس وقت کوئی انہیں عوامی استعمال کے لیے عطیہ کرنا تھا، سلطان صرف اُنہیں مناسب مذہبی کتب کی عوام میں تقسیم کی اجازت دیتا تھا، جو مذہبی حکام سے پاس ہو جاتی تھیں، ریاست باقی تمام کتب کو نجی جمع کرنے والوں کے ہاتھ فروخت کر دیتی تھی۔ (39)

چھاپہ خانہ نے مذہبی حاکمیت کی ذہنی اجارہ داری کے لیے خطرہ پیدا کیا۔ طباعت سے قبل کے رائج الوقت دستور میں، وہ واحد لوگ جن کی علم تک رسائی تھی، وہ تھے جنہوں نے بہت اہم قیمت ادا کی ہوتی تھی ..... پوری زندگی کی تربیت ..... مذہبی تصانیف کو پڑھنے اور یاد کرنے کی قیمت۔ غیر مذہبی کسی بھی کتاب کو مذہبی حکام کی چوکنی آنکھ سے گزر کر جانا ہوتا تھا۔ اجازہ داخلے کی مزید ایک رُکاوٹ تھی، جو ذہنی اجارہ داری کو بیرونی مداخلت سے تحفظ دیتی تھی۔ وہ افراد جنہوں نے اجارہ حاصل نہیں کیا ہوتا تھا، قانونی طور پر مطلوبہ متن پڑھانے کے مجاز نہیں ہونے تھے۔ چھاپہ خانہ نے بنیادی طور پر اس قوت متحرکہ کو تبدیل کر دیا ہوتا۔ چھاپہ خانہ نے اسلام کی علمی دُنیا میں داخلے کی رُکاوٹوں کو مزید کم کر دیا ہوتا، اگر چھاپہ خانہ موجود ہوتا، تو طبع شدہ مواد عوام کو تیزی سے اور سستے داموں دستیاب ہوتا۔

مذہبی حکام اقتدار کی جواز بخشی کا ایک قیمتی ذریعہ ٹھیک اس وجہ سے تھے، کیونکہ اُن کا اسلامی دانش پر کنٹرول تھا۔ یہ چیز اس کی وضاحت کرتی ہے کہ چھاپہ خانہ پر پابندی صرف اُنہی کتابوں کے لیے کیوں تھی، جو عربی رسم الخط میں تھیں جو کہ اسلام کی زبان کا رسم الخط تھا۔ مذہبی حاکمیت دوسری زبانوں کی تصنیفات سے بہت کم تعلق رکھتی تھی ..... یہاں تک کہ قرآن کے تراجم سے بھی ..... کیونکہ یہ تصانیف اسلامی دانش پر اُن کے بلاشرکتِ غیرے کنٹرول کے لیے خطرہ نہیں تھیں۔ اس قیمتی چیز پر اُن کی ملکیت نے ہی اُنہیں اعتبار اور معاشرے میں اہمیت دی تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے اُنہیں اشرافیہ بنایا تھا۔ پس اس چیز نے اُنہیں اور صرف اُنہیں اس قابل بنایا تھا کہ وہ سلطان کے اعمال کو اسلام کے ساتھ ہم آہنگ کر کے، جواز اقتدار کے اُس کے دعوے کی حمایت کریں، سلطنت کے باعلم لوگ صرف وہی تھے، جو با اعتبار طریقے سے ایسا اعلان کرنے کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ وہ خیالات کے بازار پر حاوی تھے، اور اُن کے پاس ان خیالات سے عوام کو آگاہ

کرنے کا ایک فورم موجود تھا۔ خطبۂ جمعہ۔ یہ قوانین اور پالیسیوں پر، زیادہ سود ابازی کا ایک حصہ تھا۔ سلطان اپنے اقتدار کو جواز بخشنے کے بدلے میں مذہبی حاکمیت کو تحفظ دیتا تھا۔ مذہبی حکام کی علمی اجارہ داری کو تباہ کرنے والی کوئی بھی چیز دونوں کے لیے نقصان دہ ہوتی: مذہبی حاکمیت اپنی ''اشرافیہ'' کی حیثیت اور اس سے وابستہ مفادات، کھو دیتی جبکہ سلطان سستی جواز بخشی کا بنیادی ذریعہ کھو دیتا۔

سادہ الفاظ میں، چھاپہ خانہ، حاصل شدہ مذہبی دانش اور اس کی ترسیل کے درمیان، مذہبی حاکمیت کے بطور واسطہ کردار کے لیے خطرہ بن جاتا۔ چھاپہ خانہ کے وسیع پیمانے پر اپنانے کے ساتھ ہی مسلمان براہِ راست کتابوں سے علم حاصل کرنا شروع کرنے کے قابل ہو جاتے، اور مذہبی حاکمیت کی طرف رجوع نہ کرتے۔ اگرچہ مذہبی حاکمیت کے دائرے سے باہر خواندگی کم تھی، لیکن یہ صفر نہ تھی جیسا کہ بعد میں یورپ کے واقعات نے حتمی طور پر یہ ثابت کیا، کہ طبع شدہ مواد کو خیالات کے پھیلاؤ کے لیے خواندہ آبادی کے بڑے حصے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ خیالات خواندہ لوگوں کے ہاتھوں بہت تیزی سے اور سستے انداز سے پھیل سکتے تھے اس طرح کہ وہ مطبوعہ مواد کو عوامی مقامات پر اُونچی آواز سے پڑھ کر سنا سکتے تھے۔ (دیکھئے باب 6)



# چھاپہ خانہ یورپ میں کیوں تیزی سے پھیلا؟

عثمانیوں کی طرف سے طباعت کو دبانا کئی سوالات کو جنم دیتا ہے:۔ مغربی یورپ کے حکمرانوں نے مجموعی طور پر چھاپہ خانہ کی اجازت کیوں دی؟ کیا یورپیوں کے توسیع حکمرانی کے انتظامات نے چھاپہ خانہ کو آگے بڑھانے میں اُسی طرح سے کوئی کردار ادا کیا، جس طرح عثمانیوں کے توسیعِ حکمرانی کے انتظامات نے اس کے پھیلاؤ کو روکنے میں کردار ادا کیا؟ اب تک یہ بات واضح ہو جانی چاہئیے کہ یورپی حکمران گٹن برگ کے دور تک اس توسیع حکمرانی کے اُس سے مختلف انتظامات میں مشغول تھے، جس طرح کے انتظامات میں اُن کے عثمانی مثیل مشغول تھے۔ مغربی یورپ میں کلیسا، حکمرانی کی جواز بخشی کا اُس سے کہیں کمزور ذریعہ تھا، جس طرح کا جواز بخشی کا ذریعہ سلطنتِ عثمانیہ میں مذہبی حاکمیت تھی۔ اگرچہ پورے یورپ میں ایک تنوع تھا لیکن، کلیسائی رہنماؤں نے، تیرھویں صدی کے آغاز میں حکمرانی کا جواز عطا کرنے کی صلاحیت کھونا شروع کر دی تھی، اور اُن کی حکمرانی کی جواز بخشی کی صلاحیت چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں مزید کمزور ہو گئی۔

بہت سے عوامل نے مغربی یورپ میں طباعت کی حوصلہ افزائی کی لیکن سلطنت عثمانیہ میں نہیں، یہ تمام عوامل یا تو توسیع حکمرانی کے انتظامات میں اختلافات کا نتیجہ تھے۔ یا انہیں توسیعی انتظامات کے اختلافات سے ہوا ملی تھی۔ مثال کے طور پر، عثمانیہ مذہبی حاکمیت، اور کلیسا کے درمیان امتیازی پہلوؤں میں سے ایک کو لیجئے: عثمانی مذہبی علما کے برعکس، کلیسا کے ہاں پندرھویں صدی میں تعلیمی اور علمی اداروں پر اجارہ داری کا فقدان تھا، صورتحال ہمیشہ ایسی نہیں تھی۔ تیرھویں صدی کے اواخر سے پہلے کلیسا کے لوگ زیادہ یورپی مسودات تخلیق کرتے تھے۔ بلاشبہ، اس دور میں، اس بات کا بنیادی تعین کار کہ کون سے خطے نے کتنی کتابیں تخلیق کیں، خانقاہوں کی تعداد اور اُن کا حجم تھا (40) یہ بات دسویں صدی سے بارھویں صدی تک کے عرصے میں خاص طور پر صحیح

تھی، اس کے بعد کہ جب کلونیائی اصلاحات قرون وسطیٰ میں مغربی کلیسا مین خانقاہت کے اندر ہونے والی تبدیلیوں کا ایک سلسلہ کے نتیجہ میں، مغربی یورپ میں خانقاہوں کا ایک طوفان آ گیا۔

تیرھویں صدی کے اواخر سے شروع ہوکر، دو آپس میں گندھے ہوئے واقعات نے کتب کی تخلیق کے مرکز کو خانقاہوں سے دور پہنچانے میں مدد دی: شہروں کے پھیلاؤ اور سیکولر یونیورسٹیوں کے ظہور نے۔ نئی شہری اشرافیہ مطبوعہ کتب کی طلب کا ایک اہم ذریعہ تھی۔ تاجروں کے ہدایت نامے، حساب کی کتابیں، اور قیمتوں کی فہرستیں وہ اولین کتب تھیں جو یورپی چھاپہ خانوں کی طرف سے شائع کی گئیں۔ طلب کے اس ذریعے نے مطبوعہ کتب کی تخلیق کو کلیسا کے کنٹرول سے باہر لے جانے کی حوصلہ افزائی کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، کلیسا کے بطور جواز بخشی اقتدار کے کارندے کے کمزور شدہ کردار کا مطلب یہ تھا کہ سیکولر حکمران اپنے اقتدار کا جواز چاہتے تھے، جو کہ کلیسا کی طرف سے مہیا کردہ مذہبی جواز سے باہر لیکن اُس کا امدادی ہو، انہوں نے اسے اُن ڈاکٹروں کے اندر پایا جو انتہائی باوقار یورنیورسٹیوں میں تعینات تھے۔ ڈاکٹروں نے، یونیورسٹی کے لیے حکمران کی مالی مدد کے عوض، ارسطو کی بنیادوں پر نا کہ عیسائیت کی بنیادوں پر، ریاست کے نظریات وضع کئے۔ جب تیرھویں صدی کے اواخر سے پہلے کلیسا کا یونیورسٹیوں پر غلبہ تھا، تو ایسے مقالہ جات کی حوصلہ شکنی کی گئی اور بعض اوقات اُن پر پابندی لگادی گئی۔ (41) لیکن جب یونیورسٹیوں کے سیکولر حصے (جیسا کہ دینیات سے باہر ہر چیز) تیرھویں صدی کے اواخر میں شروع ہوکر تیزی سے پھیلنے لگے، اور یہاں تک کہ اُن یونیورسٹیوں کا کنٹرول بھی، جو اس سے پہلے کلیسا کے پاس تھا، سیکولر حکمرانوں نے کلیسا سے چھین لیا۔ (42) باقی ماندہ سارے دورِ وسطیٰ میں یونیورسٹیوں کے لیے سیاسی حمایت جاری رہی۔ مثال کے طور پر سو سالہ جنگ کے دوران، انگلستان اور فرانس دونوں نے حب الوطنی کے جذبات کو آگے بڑھانے کے لیے یونیورسٹیاں قائم کیں۔ اسی دوران میں، فلورنس نے، ایک طاعون کے بعد دوبارہ آبادکاری کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی، اور دوسرے بہت سے شہروں نے، ایک نیا ذریعہ آمدنی قائم کرنے کے لیے یونیورسٹیوں کو اپنی طرف کھینچا۔ ان تحریکات کے ساتھ منسلک غیر مذہبی کتب کے عامی مجموعہ جات میں بھی ترقی ہوئی۔ (44)

عمومی طور پر مذہبی جواز بخشی اقتدار کی کمزوراہمیت کا اور خاص طور پر یونیورسٹیوں کے عروج



کا غیر شعوری نتیجہ یہ تھا کہ یونیورسٹیوں نے کتب کی تخلیق کا ایک علیحدہ دائرہ قائم کرلیا۔ 45۔ ایلجو بورنگ (Eltjo Buringh) اور جان لوئٹن وفان زینڈن (John Luiten van Zanden) (2009) کی طرف سے اکٹھی کی گئی شہادت یہ ظاہر کرتی ہے، کہ جبکہ دورِ وسطیٰ کے اوائل میں مسودہ جات کی تخلیق کے پیچھے قوتِ محرکہ خانقاہیں تھیں، دورِ وسطیٰ کے نصف آخر میں، مسودات کی تخلیق کا مرکز آہستہ آہستہ شہروں اور یونیورسٹیوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس چیز نے ایک ایسا ماحول پیدا کردیا کہ جس میں ایسی کتب کی وسیع پیمانے پر طلب تھی، جن پر کلیسا کی اجارہ داری نہیں تھی۔

نتیجتہً کلیسا، اگر چاہتا بھی تو وہ چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کو نہ روک سکتا۔ اور یہ بات بھی واضح نہیں ہے کہ آیا کلیسا طباعت کو روکنے کی خواہش رکھتا تھا۔ یہ چھاپہ خانہ کے ابتدائی استعمال کنندگان میں سے تھا، جسے اس نے پاپائی احکامات، معافی نامے اور مذہبی متون کو چھاپنے کے لیے استعمال کیا، لیکن یہ بادی النظر میں اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ کلیسا طباعت کی حمایت کرتا اگر وہ اس کے پھیلاؤ کی مخالفت کی پوزیشن میں ہوتا۔ اس سے صرف یہ مترشح ہوتا ہے کہ کلیسا نے اُن وسیع تر معاشی ادارہ جاتی حقائق کے سلسلے میں جس کا اس کا سامنا تھا، مناسب ردِعمل دیا۔ یقیناً فرض کیا کہ چھاپہ خانہ کے اندر موجودہ سماجی نظم کو تہہ وبالا کرنے کی صلاحیت ہوتی، تو کلیسا نے ایک ایسی دُنیا کو ترجیح دی ہوتی جس میں چھاپہ خانہ کا وجود نہ ہوتا۔ درحقیقت اگلا باب یہ دکھاتا ہے کہ ایسے خوف بلا جواز نہ تھے..... چھاپہ خانہ نے تحریکِ اصلاحِ کلیسا میں اہم کردار ادا کیا، جو کلیسا کی مذہبی اجارہ داری کے لیے ایک ہزار سال سے زیادہ کے عرصے میں سب سے بڑا خطرہ تھی۔ لیکن سادہ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کو روکنے کی کسی پوزیشن میں نہ تھا۔ بلاشبہ تحریکِ اصلاح کلیسا کے دوران کلیسا کے اقدامات واضح ہیں: اس نے بہت سی ''ملحدانہ'' تصانیف پر قدغنیں لگانے کی کوشش کی..... اکثر اوقات ایک ہجوم کی شکل میں کتابوں کو جلانے کی..... لیکن اس نے طباعت پر ایک مکمل پابندی کی تجویز کبھی پیش نہ کی، غالباً اس وجہ سے کہ ایسی کوشش بیکار ہوتی۔

لہٰذا، سلطنتِ عثمانیہ اور مغربی یورپ میں چھاپہ خانے کے بارے میں مختلف ردِعمل محض، عیسائی اور مسلمان مذہبی حکام کی ترجیحات میں اختلافات کا نتیجہ نہ تھے۔ اگرچہ زبانی ترسیل

www.KitaboSunnat.com

اسلامی روایت میں دورِ وسطیٰ کی عیسائیت کی نسبت بہت زیادہ اہم تھی، لیکن دونوں مذاہب میں چھاپہ خانے کی اجات دینے کے سلسلے میں ایک بہت زیادہ منفی پہلو تھا۔ خیالات کی تیز ترسیل دونوں کیلئے خطرہ تھی، کیونکہ خیالات تیزی سے اُن کے کنٹرول سے باہر ہو سکتے تھے۔ لہٰذا عثمانی اور مغربی یورپی مذہبی حکام کے درمیان بنیادی اختلاف اُن کی ترجیحات کا نہیں تھا، بلکہ حکمرانوں پر اُن کے اثر کا تھا۔ عثمانی مذہبی حاکمیت کا توسیعِ اقتدار میں اتنا اہم کردار تھا کہ وہ سلطان کو عربی رسم الخط میں طباعت روکنے پر قائل کر سکتی تھی۔ لیکن پندرھویں صدی کے اواخر تک کلیسا کسی طرح بھی مغربی یورپی حکمرانوں کے ساتھ ایسا کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور کیونکہ کلیسا چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کو روکنے میں بے بس تھا، لہٰذا اس نے تیزی سے دوبارہ طبع ہونے والی تصانیف تک رسائی ہونے کے فوائد بھی اُٹھائے ہوں گے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی یورپ کے حکمران، اگر چاہتے بھی تو طباعت کے پھیلاؤ روکنے میں ناکام ہوتے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے برعکس، مغربی یورپ بہت زیادہ ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا، جس میں بے شمار حکمران نسبتاً چھوٹے چھوٹے علاقوں پر حکومت کر رہے تھے اس کا مطلب ہے کہ اگر ایک حکمران طباعت کو روکتا تو، طباعت کار آسانی سے ہمسایہ ریاست میں چلے جاتے اور وہاں جا کر طباعت کر لیتے اور کیونکہ مطبوعہ تصانیف اکثر اوقات چھوٹی ہوتی تھیں اور آسانی سے چھپائی جا سکتی تھیں، لہٰذا مطبوعہ تصانیف کو ممنوعہ علاقوں میں آسانی سے چھپا کر لے جایا جا سکتا تھا۔ دراصل ایسا سولھویں صدی میں فرانس میں واقعی ہوا، جہاں بادشاہ نے بہت سے پروٹسنٹ مقالہ جات پر پابندی لگا دی تھی۔ طباعت کاروں نے پروٹسنٹ ہمدردیاں رکھنے والے نزدیکی علاقوں نیدرلینڈز اور مقدس رومی سلطنت کے مغربی علاقے میں۔ طباعت کر کے ان پابندیوں کو ناکام بنا دیتے تھے۔ اور نتیجتہً پروٹسٹنٹ مجموعہ تحاریر فرانسیسی پروٹسٹنٹوں کو دستیاب ہو جاتا تھا۔

یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی کیفیت نے مغربی یورپ میں طباعت کے پھیلاؤ میں کچھ کردار ادا کیا۔ یقیناً کلیسا کے لیے، متعدد، غیر مرکوز، برسرِ پیکار ریاستوں کی نسبت کسی ایک مرکوز ریاست کے ساتھ گفت وشنید کرنا زیادہ آسان ہوتا۔ لیکن اکیلے اس کو یورپ میں طباعت کے پھیلاؤ کی واحد وجہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے یقیناً اقتدار کی کمزور جواز بخشی کے کردار کے ساتھ مل کر کام کیا ہوگا۔ اس کی سچائی کی وجہ جاننے کے لیے، ایک ایسی دُنیا کا تصور



کریں، جہاں پندرھویں صدی کے دوسرے نصف میں ویسا ہر یورپی ریاست میں توسیع اقتدار کا اہم کارندہ تھا۔ ایسے حالات میں کلیسا طباعت کے پھیلاؤ کو روکنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ اگر کلیسا چھاپہ خانے کی ممانعت کے لیے کوئی فرمان جاری کرتا تو حکمران کس طرح کا ردِّعمل اختیار کرتے۔ یقیناً، ایک جرأت مند حکمران چھاپہ خانے کی اجازت دے سکتا تھا اور اس طرح طباعت کاروں کو، اسی سے وابستہ ٹیکس کے محاصل کو، اور دوسری خوبیوں کو جو چھاپہ خانے سے حاصل ہوتیں، دعوت دے سکتا تھا لیکن وہ اپنے ایک بنیادی توسیعی کارندے کو کھونے کا موقع بھی حاصل کر رہا ہوتا۔ ایک ایسی صورتِ حال میں جہاں بہت سی مخالف ریاستیں کمزوری کے کسی ہلکے سے اشارے کا انتظار کر رہی تھیں تا کہ وہ حملہ کر سکیں..... جیسا کہ حقیقی طور پر تھا، سلطنتِ روما کے سقوط سے پہلے تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں تھا۔ تو یہ ممکن ہے کہ یہ پارہ پارہ ریاستوں کا مجموعہ بھی چھاپہ خانے کو اپنانے پر کم ہی تیار ہوتا، کیونکہ یہ چیز اُن کے مخالفین کے مقابلے میں، اُن کی حکمرانی کی توسیع کو کمزور کر دیتی۔ لہٰذا، اگر چہ اس چیز کا امکان ہے کہ پارگی نے متوازن طور پر، طباعت پھیلاؤ کی سہولت کاری میں ایک مثبت کردار ادا کیا ہو، لیکن اس نے ایسا، صرف ایسے مغربی یورپ کے تناظر میں کیا، جو مذہبی توسیعِ اقتدار پر انحصار کم کر چکا تھا۔

www.MashalBooks.org

# ناقابلِ پیش بینی نتائج

تاریخ خطا کئے گئے مواقع سے بھرپور ہے۔ بہت کم خطا کئے گئے مواقع کا کوئی مستقل طویل المدت نتیجہ ہوتا ہے؛ طویل المدتی رُجحانات، حکمرانوں یا دوسرے اہم فیصلہ سازوں کی طرف سے کئے گئے انفرادی مزاج کے حامل انتخابات پر غالب آنے کی کوشش کرتے ہیں۔(46) لیکن بعض اوقات خطا شدہ مواقع ایسے راستے پر مُنحصر طریق ہائے عمل کا آغاز کرتے ہیں، جو تاریخ کو ایک بہت مختلف سمت میں دھکیل دیتے ہیں، اُس سمت سے جس سمت میں تاریخ چلتی اگر کوئی شخص اس موقع کو روک لیتا۔ کیا چھاپہ خانہ کو اپنانے میں عثمانیوں کی ناکامی اسی طرح کا ایک خطا شدہ موقع تھا؟ عثمانیوں کے اڑھائی صدیوں کی طباعت پر پابندیوں کے کیا نتائج تھے؟

سود لینے پر پابندیوں کی طرح، عثمانیوں کی چھاپہ خانہ پر پابندیاں بھی، اُن میکانیوں کو نمایاں کرنے کے لیے ایک مفید ذریعے کا کام دیتی ہیں، جو اس کتاب میں پیش کئے گئے ڈھانچے میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ پندرھویں صدی میں حکمرانوں اور اُن کے توسیع حکمرانی کے کارندوں کے درمیان تعلق مغربی یورپ اور سلطنتِ عثمانیہ میں مختلف تھا، اور نتیجے کے طور پر، حکمرانوں نے چھاپہ خانہ کے بارے میں مختلف پالیسیاں بنائیں اور سود لینے پر پابندی کی مانند، عثمانیوں کے چھاپہ خانہ پر پابندیاں کے بھی اہم طویل مدتی غیر ارادی نتائج تھے۔ یہ باب ان نتائج سے بحث نہیں کرتا۔ اور یہاں پیش کیا گیا استدلال اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ چھاپہ خانہ ہی مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے معاشی مقدّروں کے درمیان طویل مدتی اختلاف کا براہِ راست ذمہ دار تھا۔ یقیناً خواندگی میں بہتری اور قیمتوں اور تبادلہ کی شرحوں کی معلومات تک بہتر رسائی کے، مغربی یورپ میں طویل مدتی معاشی نتائج پر مثبت اثرات تھے۔ لیکن یہ براہِ راست نتائج، اُن ناقابلِ پیش بینی راستے پر مُنحصر'' نتائج کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں، جو مغربی یورپ میں چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کے بعد اُبھرے۔ ان نتائج میں اہم ترین نتیجہ یہ تھا کہ چھاپہ خانے نے اختلاف



رائے کو تیزی سے پھیلنے کی اجازت دی، جس چیز نے اس چیز کا بہت زیادہ امکان پیدا کر دیا کہ موجودہ سیاسی نظام کسی نہ کسی وقت تباہ ہو جائے گا۔ اگلا باب یہ بیان کرتا ہے کہ یہ ٹھیک وہ چیز ہے جو پورے مغربی یورپ میں طباعت کی حصار بندی کی چند دہائیوں کے اندر واقع ہوگئی۔ خاص طور پر، اگلا باب اس بات کی تفصیل پیش کرتا ہے کہ چھاپہ خانہ کس طرح پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاحِ کلیسا کو پھیلانے اور کامیاب کرنے میں بنیادی کردار کا حامل تھا۔ تحریکِ اصلاحِ کلیسا ایک ایسا واقعہ تھا، جس نے مغربی یورپ کے بڑے حصوں میں توسیع حکمرانی کے انتظامات کو مکمل طور پر اُلٹ دیا۔ ایسی تیز اور بنیادی تبدیلی مشرقِ وسطیٰ میں کبھی واقع نہ ہوئی، کسی چھوٹے حصے میں بھی نہیں، اور ایسا چھاپہ خانے جیسی معلوماتی ٹیکنالوجی کی غیر موجودگی کی وجہ سے ہوا، جس نے اختلاف رائے کو تیزی سے موجودہ اشرافیہ کے ہاتھوں سے باہر پھیلنے کی اجازت دی۔ حتمی خلاصہ، جس کی تفصیل باب 7 اور 8 میں پیش کی گئی ہے، یہ ہے کہ سولھویں صدی کے اختتام تک، وہ طریقہ جس میں اقتدار کو توسیع دی جاتی تھی مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ میں (خاص طور پر پروٹسٹنٹ یورپ میں) بہت زیادہ مختلف تھا، اور اس کے نتیجے میں بننے والے قوانین اور پالیسیوں نے، موخر الذکر میں کاروبار کو بہت بڑی حد تک ترقی دی، یہ وجہ ہے کہ معاشی ترقی آخر کار مغربی یورپ کے بعض حصوں میں واقع ہوئی لیکن مشرقِ وسطیٰ میں نہیں۔ چھاپہ خانے نے، دونوں خطوں کے درمیان طویل مدتی اختلاف میں ایک کردار ادا کیا، لیکن واقعات کے ''راستے پر مُنحصر'' سلسلے کے ذریعے، جو کہ اختلاف کی ابتدائی وجوہات سے بہت ہٹا ہوا تھا۔ اگلا باب، چھاپہ خانے کے پھیلاؤ اور بعد میں ہونے والے پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ کے مابین تعلق، کی تائید کرنے کے لیے تجربی شہادت کو استعمال کرتے ہوئے، اس راستے کو تلاش کرنے کی طرف پہلا قدم اُٹھاتا ہے۔

www.MashalBooks.org

# (6)

# طباعت اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا

سابقہ باب کا آغاز، جوہانس گٹن برگ (Johannes Gutenberg) کی وسیع پیمانے پر تسلیم کی گئی اہمیت کا ذکر کرنے سے ہوا، جسے پچھلی ہزاری کی متعدد اخباری اشاعتوں نے ہزاری کے اہم ترین شخص کا درجہ دیا۔ ان تمام فہرستوں میں گٹن برگ سے قریب ہی ایک شخص تھا، جو گٹن برگ کی وفا کے 15 سال بعد ایک ایسے شہر میں پیدا ہوا جو گٹن برگ کے منیز سے 250 میل کے فاصلے پر تھا۔ اس شخص، مارٹن لوتھر نے، 1517 میں واقعات کے ایک سلسلے کو تحرک دیا جسے پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح کلیسا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ تحریکِ اصلاحِ کلیسا کلیسائے روم کی مذہبی اجاری داری کے لیے، چوتھی صدی میں اس کے بطور سلطنتِ روما کے مسلمہ کلیسا کے قیام سے لے کر اب تک ملنے والا سب سے تباہ کُن جھٹکا تھا۔ صرف ایک دہائی کے اندر اندر، ایسے نئے مذہبی گروہ پیدا ہو گئے، جو ہمیشہ کے لیے کلیسا سے علیحدہ ہو گئے، اور بالآخر پروٹسٹنٹ درج ذیل، بَپٹسٹ، لوتھران، کیلوینسٹ، پریس بی ٹیرین، میتھوڈسٹ، اینگلیکن اور بہت سے دوسرے گروہوں کو اپنی صفوں میں شمار کرنے لگے۔

لوتھر اور اُس کی تحریکِ اصلاح کلیسا عالمی تاریخ کیلئے کیوں اتنی اہم تھی؟ یہ بیان کرنا کہ تحریکِ اصلاح کلیسا پچھلی ہزاری کا اہم ترین واقعہ تھا ایک چیز ہے، اور یقیناً ایسا تھا۔ یہ دعویٰ کرنا بالکل ایک دوسری بات ہے کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا مذہب کی دُنیا سے آگے نکل گئی۔ لیکن اس کتاب نے اس حد تک بیان کیا ہے کہ مذہب..... خاص طور پر وہ کردار جو مذہب، سیاسی حکمرانی کو توسیع دینے میں ادا کرتا ہے..... خطے کی معاشی کارکردگی کے لیے دوررس اثرات کا حامل ہوسکتا



ہے..... لہٰذا یہ پوچھنا فطری ہے کہ آیا تحریک اصلاح کا مغربی یورپی معیشتوں کی ترقی پر کوئی اثر تھا۔

اس طرف اشارہ کرنے والے علمی کام کی ایک لمبی قطار ہے کہ پروٹسٹنز کا واقعی یورپی معاشی ترقی پر ایک مثبت اثر تھا۔ یہ تعلق جوڑنے والا مشہور ترین مقالہ میکس ویبر (Max Weber) ([2002] 1905) کا انتہائی اعلیٰ بعنوان ''پروٹسنٹ اخلاق اور سرمایہ داری کی ''روح'' (The Protestant Ethic and the Sprit of Capitalism) ہے۔ اس کے متن میں، ویبر نے یہ استدلال کیا کہ کیلوینسٹ قضائے اِلٰہی کے نظریے نے کچھ پروٹسٹنوں کو، یہ ثابت کرنے کے لیے کہ، وہ خُدا کی منتخب کردہ مخلوق تھے، جو موت کے بعد جنت کیلیے منتخب کئے گئے تھے، سخت محنت پر آمادہ کر دیا۔ ویبر کے مطابق اس اصول سے پیدا ہونے والی اخلاقیات نے پروٹسٹنٹوں کو اپنی ''اندرونی آواز'' پر کامیابی کیلئے متحرک کیا۔ وہ سخت محنت کے ذریعے نجات حاصل کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ کام کی اخلاقیات سرمایہ داری کی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ تھی۔ پروٹسٹنٹوں نے اور سخت محنت کی کیونکہ خدا کی طرف سے اُنہیں ایسا کرنے کی آواز آئی تھی اور اس کے نتیجے میں پروٹسٹنٹ معیشتیں ترقی کرتی گئیں۔

جب سے ویبر نے یہ مفروضہ پیش کیا ہے۔ پوری صدی کے دوران یہ انتہائی نقد و جرح کی زد میں رہا ہے۔ انتہائی نمایاں ناقدین میں سے ایک اس سادہ حقیقت کا حوالہ دیتا ہے کہ سرمایہ داری تو تحریکِ اصلاحِ کلیسا سے پہلے موجود تھی۔ تاجروں نے دورِ وسطیٰ کے اواخر میں، تاجرانہ سرگرمیوں کے لیے کیتھولک اطالوی شہری ریاستیں تعمیر کیں، اور ''سرمایہ دارانہ اخلاقیات کا رنگ اُن کی سماجی اور معاشی زندگی کے تقریباً پہلو پر چھایا ہوا تھا۔ بلاشبہ سب سے طاقتور شہری ریاست، وینس، لوتھر کی زندگی میں ہی مغربی یورپ میں ایک اہم ترین اور دولتمند ترین ریاست تھی۔ سادہ الفاظ میں، یہ دعویٰ کرنا کہ پروٹسٹنٹوں کی کوئی منفرد کام کی اخلاقیات تھی، دور کی کوڑی لانا ہے۔1

اگرچہ ویبر پروٹسٹزم اور معاشی ترقی کے درمیان سببی تعلق کے بارے میں تقریباً یقیناً غلط تھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تعلق جس کی تشریح کرنے کی کوشش اُس نے کی، بالکل غیر موجود تھا۔ ویبر، پروٹسٹز اور معاشی ترقی کے درمیان تعلق کے بارے میں، اپنے نظریے پر جزوی طور پر اُن حالات کی وجہ سے پہنچا، جو اُنیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں اس

www.MashalBooks.org

کے اردگرد پروشیا میں تھے۔ متعدد پروشیا کے شہر بنیادی طور پر کیتھولک تھے، اور دوسرے بنیادی طور پر پروٹسٹنٹ تھے۔ ویبر کے دور میں یہ دیکھا جا سکتا تھا کہ پروٹسٹنٹ شہر کیتھولک شہروں کی نسبت امیر تر تھے۔ سسچا بیکر (Sacha Backer) اور لُڈگر ووبمین (Ludger Widmann) (2009) نے اس امکان کی تصدیق کی ہے کہ یہ پروٹسٹنزم کے بارے میں کسی چیز کی وجہ سے تھا ......اور پروٹسٹنزم سے منسلک کوئی چیز نہیں تھی ......ایک محتاط شناخت شدہ مطالعے ہیں۔ 1871 کی پروشیا کی مردم شماری کو استعمال کرتے ہوئے، بیکر اور ووبمین نے یہ دیکھا کہ پروٹسٹنٹوں کی کیتھولک کی نسبت خاصی بہتر آمدنیاں تھیں۔

پروٹسٹنزم اور معاشی خوشحالی کے درمیان مثبت باہمی تعلق، پروشیا کی سرحدوں سے کافی آگے جاتا ہے۔ شکل 6.1 پر غور کریں، جو ستره یورپی شہروں میں، سولھویں صدی سے لے کر اُنیسویں صدی تک ہنرمند کارکنوں کی ''بہبود کے تناسبات'' کو ظاہر کرتی ہے۔(3) ایک ''بہبود کا تناسب''، کسی شخص کی حقیقیت معاوضے کی اُن اخراجات کی نسبت سے اوسط ہوتی ہے، جو گزارے کی اشیا کی ایک ٹوکری خریدنے پر ہوتے ہیں...... ''بہبود کا تناسب'' ایک سے مراد ہوتی ہے کہ کارکن محض گزارے کی سطح پر ہیں، جبکہ 2 کا تناسب یہ ظاہر کرتا ہے کہ کارکُن، گزارے کی ضروری اشیاء کی سطح دُگنا خرید سکتے ہیں۔ یہ عدد چھ پرٹسٹنٹ شہروں پر تقسیم کیا گیا ہے، جس کے لیے ایلن (Allen) (2001) اعداد وشمار دیتا ہے۔ (ایمسٹرڈیم، لندن، سٹراس برگ، آسبرگ، لاٹیپرگ اور ہیمبرگ)، اور گیارہ ایسے شہروں کیلئے جو کیتھولک ہی رہے (اینٹورپ، فلورنس/میلان، نیپلز، ویلنشیا، میڈرڈ، پرس، میونخ، وی آنا، گڈانسک، کراکو، اور وارسا) اور ''بہبود کے تناسبات'' کی قدر و قیمت کا اندازہ شہر کی آبادی کے حوالے سے لگایا جاتا ہے۔(4) رُجحان واضح ہے: سترھویں صدی سے شروع ہوکر، پروٹسٹنٹ شہروں میں ہنرمند کارکنوں نے، اپنے کیتھولک مثیلوں سے بہتر انداز سے زندگی گزارنا شروع کیا۔ یہ رُجحان صنعتی انقلاب سے پہلے شروع ہوتا ہے اور صنعت کاری کے بعد تک جاری رہتا ہے۔ اگرچہ یہ نمونہ بذات خود کچھ ثابت نہیں کرتا، لیکن یہ اس طرف اشارہ ضرور کرتا ہے کہ، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک علاقوں کے درمیان فرق کے بارے میں ویبر کے مشاہدے کی کچھ نہ کچھ بنیاد ضرور تھی۔

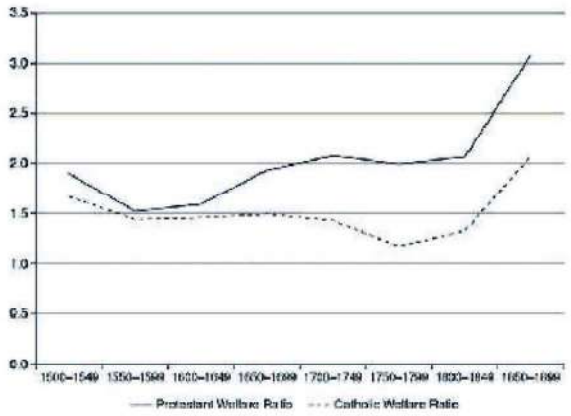






**شکل 6.1:** 1500 تا 1899، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک شہروں میں ہنرمند کارکنوں کی بہبود کا تناسب۔

ذریعہ: بہبود کے تناسبات ......ایلن (2001): آبادی...... بیروچ اے آل (Bairoch etal)(1988); کسی شہر کو پروٹسٹنٹ خیال کیا جاتا تھا، اگر اس کی آبادی 1600 تک بڑی حد تک مذہب تبدیل کر چکی ہوتی۔

یہ باہمی تعلق آج کے دن تک واضح ہے۔ اشکال 6.2 تا 6.4، نقطوں کو ملا کر خط بنانے کے ذریعے 182 ملکوں کے پروٹسٹنٹوں، کیتھولکوں، اور مسلمانوں کے سامنے حقیقی فی کس مجموعی ملکی پیداوار کو ظاہر کرتی ہیں، جن کیلئے 2010 میں اعداد وشمار موجود تھے۔ ان اشکال کی تمام کمزوریوں کے باوجود، یہ ویبر کے دیئے ہوئے تعلق کو واضح کرتی ہیں۔ ایک پروٹسٹنٹوں پر مشتمل ملک، ایک پروٹسٹنٹوں کی صف آبادی والے ملک کی نسبت، اوسطاً (2010 میں امریکی ڈالر کی قیمت کے مطابق) 13,406 ڈالر فی کس زیادہ امیر ہوتا ہے۔ کیتھولسزم کے حق میں ایک مثبت اثر ہے لیکن یہ کمزور تر ہے: ۔صرف کیتھولکوں پر مشتمل ایک ملک، صفر کیتھولک رکھنے والے ملک کی نسبت فی کس کے حساب سے 3,900 ڈالرز زیادہ امیر ہوتا ہے۔ اسلام کے حق میں یہ اثر منفی ہے، یہاں تک خلیج فارس کے تیل سے مالا مال ممالک کو شامل کرنے کے بعد بھی: مسلمانوں پر مشتمل ایک ملک، صفر مسلمانوں کے حامل ملک کی نسبت 7,509 ڈالر غریب تر ہے۔

www.MashalBooks.org

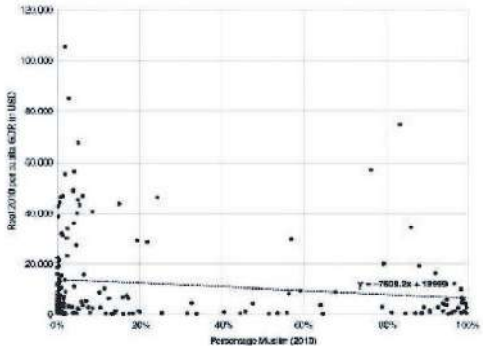

**شکل 6.2:** پروٹسٹنٹ بمقابلہ حقیقی فی کس مجموعی ملکی پیداوار، کا فیصد 2010

**ذریعہ: مجموعی ملکی پیداوار .....آئی ایم ایف (2012) ;مذہب.....جانسن اینڈ گرم (Johnson and Grim) (2008)**

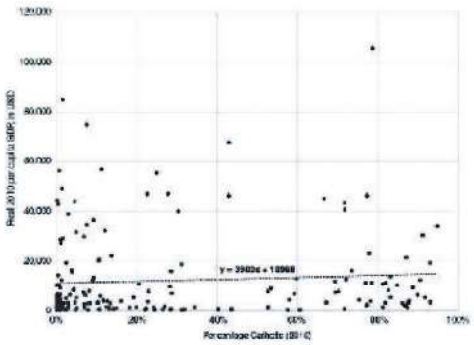

**شکل 6.3:** کیتھولک بمقابلہ حقیقی فی کس مجموعی ملکی پیداوار کا فیصد 2010

**ذریعہ:** مجموعی ملکی پیداوار ..... آئی ایم ایف (2012);مذہب ..... جانسن اینڈ گرم (2008) (Johnson and Grim)



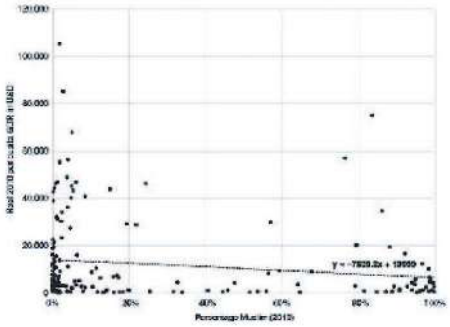

Percentage Muslim vs. Real Per Capita GDP, 2010

یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ باہمی تعلق کا وجود ہے.....اور یہ تعلق کم از کم سترھویں صدی سے موجود رہا ہے..... پروٹسٹنزم اور دولت کے درمیان..... یہ اس بارے میں کچھ نہیں بتاتے کہ آیا یہ تعلق سببی ہے یا نہیں۔ کیا یہ ایک اتفاق ہوسکتا ہے کہ وہ خطے جو تحریکِ اصلاح کلیسا کے وقت سے دُنیا کی معیشت پر چھائے ہوئے تھے..... پہلے جمہوریہ ڈچ، پھر انگلستان اور پھر ریاست ہائے متحدہ.....تمام غالب طور پر پروٹسٹنٹ تھے؟ یقیناً یہ ایک امکان ہے، لیکن یہ باب یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا، اور یقیناً پروٹسٹنزم اور معاشی خوشحالی کے درمیان ایک سببی تعلق ہے: یہ تعلق کیا تھا، یہ کیسے پھیلا، اور اس نے غالب سیاسی۔معیشت توازن کو جو سقوطِ روم کے وقت سے لے کر مغرب یورپ پر حاوی تھا، کس طرح تہہ و بالا کیا۔

اس تاریخ کو زیرِ بحث لانے سے پہلے، اس کا تھوڑا سا پسِ منظر ضروری ہے۔ 1450 اور 1550 کے درمیان کی صدی، دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے کہ یورپ کی بعد روما کی تاریخ میں اہم ترین صدی ہے..... یہاں تک کہ 1750 تا 1850 کے دوران صنعت کاری کے آغاز سے بھی زیادہ..... بہت سے ادارہ جاتی اور ٹیکنالوجیات، خصوصیات، جنہوں نے مغربی یورپ کو حتمی طور پر معاشی کامیابی کی طرف دھکیلا، اسی صدی میں تکمیل پذیر ہوئیں۔ اس صدی کے اہم واقعات کی ایک نامکمل فہرست درج ذیل واقعات کو اس میں شامل کرتی ہے: نئی دُنیا کی ''دریافت'' کو پرنیکس کا انقلاب، قسطنطنیہ کی عثمانیوں کی طرف سے فتح اور وی آنا کے محاصرے تحریکِ احیائے علوم، پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا، اور بلاشبہ، چھاپہ خانہ کی ایجاد اور پھیلاؤ۔ یہ

واقعات قرونِ وسطیٰ کے خاتمے اور ایک نئے دور، جو مغربی یورپ کی چودھراہٹ پر اختتام پذیر ہوا، کی علامت بنے۔ بلاشبہ، بہت سے معیشت دانوں اور مورخین نے، ان میں سے کسی ایک واقعے کو ''مغرب کے عروج'' کی پیامبری کے لیے نشان زد کیا ہے۔ (5) مسئلہ ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کا ہے۔ کون سے واقعات دوسرے تاریخی واقعات کا نتیجہ تھے۔ اور زیادہ اہم بات کہ کونسے واقعات، معاشی تاریخ کے اس اہم دور کے حقیقی ''بنیادی تحرک کار تھے؟''

پچھلے باب نے ان میں سے ایک واقعہ پر توجہ مرکوز کی ..... چھاپہ خانے کی مغربی یورپ میں توسیع اور مشرقِ وسطیٰ میں اس کی عدم موجودگی پر چھاپہ خانے پھیلاؤ کے کچھ اثرات غیر جیران کُن ہیں: مغربی یورپ میں شرحِ خواندگی بھرپور طریقے سے اُبھری، چھاپہ خانے کے حامل شہر پھلنے لگے، اور کتب بہت سستی ہوگئیں۔ غالباً زیادہ اہم، طباعت کے بالواسطہ ''راستے پر متحضر'' اثرات تھے۔ چھاپہ خانے نے معلومات اور ابلاغ کے ایک انقلاب کی سہولت کاری کی، جو کتابوں سے بہت آگے نکل گیا، اس نے نئے خیالات کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ تیزی سے پھیلنے کی گنجائش پیدا کی۔ اس کا مطلب تھا کہ اقتدار مخالف نظریات اتنی تیزی سے پھیل سکتے تھے کہ صاحبان اقتدار کے اُن کو کچلنے سے پہلے وہ اپنی جگہ بنا چکے ہوتے تھے۔ یہ اکیسویں صدی کے انٹرنیٹ اور سماجی ذرائع ابلاغ (سوشل میڈیا)، جو دلائل کے لحاظ سے چھاپہ خانے سے لے کر اب تک اہم ترین معلوماتی اور ابلاغی ٹیکنالوجیاں ہیں، کے پھیلاؤ کے مماثل ہیں۔ فیس بک اور ٹویٹر جیسی ویب سائٹس لوگوں کے لیے نئے تصورات کو تیزی سے منظّم کرتے اور تقریباً آناً فاناً پھیلانے کی گنجائش پیدا کرتی ہیں۔ اس وجہ سے، وہ آمرانہ حکومتیں جو انقلاب کے حملے کی زد میں ہیں (جیسا کہ شمالی کوریا، ایران اور چین) ان ویب سائٹوں کو دبانے کے لیے جو کچھ کرسکتی ہیں، کرتی ہیں۔ اُن کا خوف قابلِ فہم ہے: سماجی ذرائع ابلاغ کی ویب سائٹوں نے، عرب بہار کے دوران آمرانہ حکومتوں کا تختہ اُلٹنے کی سہولت کاری کی۔

اُس وقت کے لگ بھگ، جب گٹن برگ نے متحرک ٹائپ والا چھاپہ خانہ ایجاد کیا، کیتھولک کلیسا، اُن آمرانہ حکومتوں کی طرح، خاص طور پر بغاوت کے خطرے کی زد میں تھا۔ تقریباً دو صدیوں تک، یہ روز افزوں ایسے دُنیاوی امور میں اُلجھا ہوا تھا، جو روح کو نجات دلوانے کے اس کے اصلی مشن سے بہت زیادہ ہٹے ہوئے تھے۔ ایسے معمولات جیسا کہ سائمونی (کلیسائی براءت



خرید و فروخت) حالیہ ایجاد شُدہ روحانی تطہیر میں اپنے پیاروں کے دُکھوں کو کم کرنے کے لیے دُعاؤں کا بیچنا، اور معافی ناموں کا بیچنا (''جہنم سے آزاد نکل آؤ'' کارڈ، جو ٹھیک قیمت پر قابلِ خرید تھے) تمام کے تمام قرونِ وسطیٰ کے اواخر کے کلیسا میں عام تھے۔ اس چیز نے کلیسا اور عام لوگ دونوں میں چرچ کے بارے میں ناراضگی پیدا کردی۔ ایسے حالات میں، ارباب اختیار کے خلاف بغاوت ممکن تھی۔ بشرطیکہ یہ کلیسا اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے کچلے جانے سے پہلے پھیل جاتی۔ چھاپہ خانے نے ایسی بغاوت کو ممکن بنادیا، اور اس کا نتیجہ تحریکِ اصلاح کلیسا تھی۔ (6)

یہ باب چھاپہ خانہ اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان تعلق کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ یہ تعلق واقعات کے ''راستے پر متحضر'' سلسلے کی ایک کلاسیکی مثال ہے۔ جو ہانس گٹن برگ کا کلیسا کو تباہ کرنے یا ایک ایسی ٹیکنالوجی تخلیق کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، جو ممکنہ طور پر موجودہ سیاسی توازن کو تباہ کردے۔ وہ ایک سرمایہ دار تھا، جس نے متحرک ٹائپ والی طباعت کو قابلِ عمل بنانے کے لیے اُس کے بنیادی اجزا، ایک اندازے سے دریافت کرلئے، اور اس علم کو کتابیں چھاپنے کے لیے استعمال کیا۔ لیکن جس چیز نے چھاپہ خانے کو قابلِ استدلال طور پر ہزاری کی اہم ترین ایجاد بنادیا، وہ غیر ارادی اور غیر قابلِ پیش بینی نتائج ہیں، جو چھاپہ خانے کے مغربی یورپی سیاسی ارتقا پر تھے۔ جس طرح یہ بابِ ضبطِ تحریر میں لاتا ہے، چھاپہ خانہ نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو اتنی تیزی سے پھیلنے دیا کہ اتنی مضبوط ہوگئی کہ کلیسا کیلئے اس کو بالکل دبانا ممکن نہ رہا۔ خیالات کا اس قدر تیزی سے پھیلاؤ طباعت سے قبل کی دُنیا میں ناقابلِ تصور تھا۔ بلاشبہ چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ سے پہلے کلیسا کی اصلاح کی بہت سی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، جہاں تحریک اصلاحِ کلیسا مضبوط ہوگئی، تو اصلاح کاروں نے عمومی طور پر کیتھولک کلیسا کو اقتدار سے اُکھاڑ پھینکا۔ اُنہوں نے کلیسا کے لوگوں کو شہر سے باہر نکال دیا اور کلیسا کے مقبوضات کو ضبط کرلیا۔ یہ ان علاقوں میں کلیسا کی آخری موت کی گھنٹی تھی..... اور اس کے سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے کی بھی۔ انگلستان میں، ہنری ہشتم نے کلیسا کی زمینوں کو ضبط کرلیا، مذہبی یا دوسرے معاملات میں پوپ کو کی جانے والی تمام اپیلوں کو روک دیا، اُن تمام اختیارات کا دعویٰ، بادشاہ کے حق میں کردیا، جو کبھی پوپ کے ہاتھ میں تھے، اور تمام راہبوں کی رہائش گاہوں کے صدور کو ایوانِ بالا سے نکال دیا۔ جمہور یہ ڈچ میں، اصلاح کاروں نے اہلِ کلیسا کو عملی طور پر اُن کی تمام سیاسی طاقت سے

محروم کر دیا، سویڈن میں، بادشاہ نے خانقاہوں کو عطیہ کی گئی بہت ساری زمینوں کو ضبط کر لیا اور اصلاح شدہ کلیسا پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ شمالی جرمنی کے آزاد تجارتی شہروں میں اصلاح کاروں نے شہری کونسلوں سے تمام اہلِ کلیسا کو نکال دیا اور کلیسا کی زمین کو ضبط کر لیا اور علیٰ ہذا القیاس۔

یہ پروٹسٹنٹ اقوام کی معاشی قسمتوں پر تحریکِ اصلاحِ کلیسا کا اہم ترین اثر تھا۔ جہاں جہاں کلیسا نے توسیع اقتدار میں کردار ادا کرنا بند کیا، وہاں، معاشی اشرافیہ نے، جو کہ پارلیمان میں منظّم ہو چکی تھی، اکثر اوقات اُن کی جگہ لینے کے لیے در آئی۔ اُن کے مفادات، اُن قوانین اور پالیسیوں کے ساتھ زیادہ قریبی ہم آہنگی رکھتے تھے جو بہتر معاشی مفادات کی سہولت کاری کرتے تھے۔ اور وہ قوانین اور پالیسیاں جن کو بنانے میں وہ مدد کرتے تھے، اس کی عکاسی کرتی تھیں۔ یہ ہے وہ وجہ کہ ویبر نے پروٹسٹنٹزم اور معاشی خوشحالی کے درمیان ایک تعلق کا مشاہدہ کیا...... وہ اپنی سببی دلیل میں غلط تھا۔ لیکن بہر حال اس میں کوئی معقولیت ہے کہ یہ دونوں اکثر اوقات آپس میں جڑے ہوئے ہوتے تھے۔

طباعت کے پھیلاؤ اور پروٹسٹنٹ اصلاحِ کلیسا کے معاشی نتائج ایک اور اہم سوال اُٹھاتے ہیں: چھاپہ خانے کی عدم موجودگی کا مشرقِ وسطیٰ کے معاشی اور ادارہ جاتی خط حرکت کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ اگر پروٹسٹنٹ اصلاحِ کلیسا کی کامیابی کیلئے طباعت کا پھیلاؤ اس قدر اہم تھا، تو کیا یہ ممکن ہے کہ طباعت کو قبول کرنے میں تاخیر نے اسی طرح کی تبدیلی اسلامی دُنیا میں آنے سے روک دی ہو؟ یہ باب اس سوال کا جواب ''ہاں'' میں دیتا ہے۔ یہ چیز اُن بنیادی اسباب میں سے ہے کہ طباعت کا پھیلاؤ کیوں اہم تھا۔ جہاں جہاں یہ پھیلا وہاں، ممکنہ طور پر مذہبی حکام ختم ہو گئے؛ جہاں یہ نہیں پھیلا، وہاں جوں کی توں صورتحال کے قائم رہنے کا امکان زیادہ تھا۔

لہٰذا، اس کتاب میں قائم کیا گیا ڈھانچہ یہ تجویز کرتا ہے کہ یہ چیز کہ آیا کس خطے نے چھاپہ خانے کو اپنایا یا نہیں، سیاسی اور مذہبی حکام کے درمیان جواز بخشی اقتدار کی مضبوطی کی وجہ اور اُس کا نتیجہ دونوں تھی، دوسرے لفظوں میں، معلوماتی ٹیکنالوجی کی عدم موجودگی نے جواز بخشی اقتدار کے تعلق کو مضبوط کیا، جبکہ مضبوط جواز بخشی کا تعلق ہی وہ چیز تھی، جس نے طباعت کو دبانے کی حمایت کی۔



# پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا کا پھیلاؤ

31 اکتوبر 1517 کو، مارٹن لوتھر (Martin Luther) نے اپنے پچانوے مقالہ جات وِٹن برگ کے آل سینٹس چرچ کے دروازے پر کیل ٹھونک کر ٹانگ دیئے، اور غیر شعوری طور پر ایک چنگاری لگا دی، جو پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح کلیسا بن گئی۔ (7) لوتھر اُس چیز کے بارے میں فکر مند تھا، جنہیں وہ الٰہیاتی غلطیاں تصور کرتا تھا، جیسا کہ آیا نجات صرف عقیدے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اُس نے کلیسا کے اختیارات کی بھی مذمت کی، جیسا کہ معافی ناموں کے استعمال، تبرّکات کے مسلک، کلیسا کے لوگوں کی مراعات، کلیسا کے لوگوں کے داشتائیں رکھنے اور سایمٹونی...... (کلیسائی حقوق واختیارات) کی۔ اگرچہ لوتھر کی شکایات کا ابتدائی طور پر مرکزِ توجہ کلیسا کی اندر سے اصلاح تھا، لیکن پورے شمالی یورپ میں عامی اور کلیسائی مفادات نے اُس کی شکایات کی گونج پیدا کر دی۔

تحریکِ اصلاحِ کلیسا پہلے پہل اُس حصے میں پھیلی، جو مقدس رومی سلطنت کا پارہ پارہ حصہ تھا۔ نورمبرگ جیسے شہروں نے تحریک کو قبول کر لیا، اس طرح کہ لوتھر کے طاقتور دوستوں نے اصلاح سے ہمدردی رکھنے والے مبلغین کو تعینات کر دیا۔ اس کی ایک ہم عصر تحریک سوئٹزرلینڈ کے وفاق میں بھی اُبھری، جہاں ہلڈرخ زونگلی (1531-1484) نے بھی ایسے ہی اصولوں کو قبول کر لیا اور زیورخ کے اجتماعات میں مقامی زبان میں تبلیغ کرنے لگا۔ 1520 کی دہائی میں لوتھر۔ زونگلی دوہرا پیغام جنوبی جرمنی کے بہت سے آزاد شہروں جیسا کہ سٹراس برگ اور کانسٹینس میں پھیل گیا۔8

تحریکِ اصلاحِ کلیسا، عموماً کسی شہر میں تعلیم یافتہ، خواندہ پادریوں اور علما کے ایک ایسے چھوٹے جتھے کی کوششوں سے جگہ بناتی تھی جو لوتھر یا زونگلی کے پیغام کو پھیلانا اپنے اوپر فرض کر لیتے تھے۔ ان اصلاح کاروں میں سے زیادہ تر کے پاس مسلمہ کلیسا کے اندر مناصب تھے، اور

www.MashalBooks.org

وہ منبر سے عوام کو براہِ راست خطاب کر سکتے تھے۔ وہ پُر جوش اور جارحانہ انداز سے عبادات کی نوعیت اور کلیسا کے احزان اور پوپ کے معمولات کے بارے میں مجمعے سے سوالات کرتے تھے۔ یہ مبلغین 1520 کی دہائی میں خاص طور پر سیکسونی اور وسطی جرمنی میں کامیاب تھے۔ جہاں اُنہوں نے تحریک کو ایلٹن برگ، ایزتاخ اور روکاؤ جیسے قصبوں میں پھیلایا 1520 کی دہائی کے اواخر اور 1530 کی دہائی میں، اصلاح کار مبلغین نے سٹراس برگ اور لیوبک جیسے بڑے شہروں کو تبدیلی مذہب کیلئے آمادہ کیا، جبکہ متعدد بالٹک شہروں نے بھی اُن کی پیروی کی۔ بہت سے بڑے جنوبی جرمنی کے شہروں جیسا کہ آسبرگ نے اسی طرح 1530 کی دہائی میں مذہب تبدیل کر لیا۔(9)

تحریک کا پیغام بڑے بڑے اشتہارات اور کتابچوں کے ذریعے بھی شہر بہ شہر پھیلا، جن میں سے بہت سے سرکردہ اصلاح کاروں کی طرف سے، خاص طور پر لوتھر کی طرف سے لکھے جاتے تھے۔ اگرچہ اس دور میں زیادہ تر لوگ ان پڑھ تھے، لیکن زبانی ابلاغ وہ بنیادی طریقہ تھا جس کے ذریعے مطبوعہ مواد پھیلتا تھا، اور اصلاح کار کتابچوں کو اس طرح لکھتے تھے کہ خواندہ ہمدرد اُنہیں عوامی اجتماع کے مقامات پر اونچی آواز سے پڑھ سکتے تھے۔ مثلاً پاپا کی طرف سے مذمت کے فرمان کے جواب میں لوتھر کا کتابچہ ''اُن تمام لوگوں کو مخاطب کر کے لکھا گیا تھا'' جو اس کتابچے کو پڑھ یا سُن سکیں۔''(10)

اُن بہت سے شہروں میں جو تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کر لیتے تھے، جیسا کہ سٹراس برگ اور اَلم میں، شہری کونسلیں اصلاحی تصورات سے ہمدردی رکھنے والے مبلغین کو بُلا کر تحریک کو جمانے کی ذمہ داری سنبھال لیتی تھیں۔ یہ وہ بنیادی وجہ ہے کہ مورّخ اے جی ڈکنز (A. G. Dickens) (1974) نے یہ مقدمہ پیش کیا کہ تحریک ایک ''شہری واقعہ'' ہے۔ یہ بیان کرنے کی ایک شہادت موجود ہے کہ اس مفروضے میں کچھ سچائی ہے۔ مقدس رومی سلطنت کے پینسٹھ شاہی شہروں میں سے پچاس نے یا مستقل طور پر یا وقتی طور پر تحریک کو قبول کر لیا۔ شہریوں کی ایک دوسرے سے باہمی قربت، دولت اور ادبی شعور کی اعلیٰ سطوح، اور اُن کی نسبتاً سیاسی تادیب اور آزادی، بمقابلہ شہزادوں کی بند آمرانہ حکومتوں نے، وہ تمام اسباب تھے کہ جن کی بنا پر تحریک مقدس رومی سلطنت کے بہت سے آزاد شہروں میں اُبھری۔ شمالی ہنسیائی شہروں میں، یہ بڑی حد



تک متوسط طبقہ تھا۔ جو امیر تھا، لیکن شہروں کے اندر اُس کے پاس کوئی سیاسی طاقت نہیں تھی۔ جنہوں نے تحریک اصلاح کلیسا کی، بطور مسلمہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کے ایک ذریعے کے پذیرائی کی حوصلہ افزائی کی۔ ان کونسلوں کے ارکان میں سے کچھ نے معاشی فوائد کی خواہش کی، جیسا کہ کلیسا کی جائیداد کی ضبطی، جبکہ دوسروں نے بلاشبہ تبدیلی کا دباؤ محسوس کیا، جو مبلغین اور عوام کی طرف سے پیدا ہو رہا تھا۔ جب ایک مرتبہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا کسی شہر کی طرف سے قبول کر لی جاتی تھی۔ تو عموماً اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا، کہ پادریوں اور کلیسا کے افسران کی مراعات اور مراتب ختم کر دیئے جاتے تھے، جس کے بعد کلیسا کی مادی دولت کی ضبطی یا تباہی واقع ہوتی تھی۔

نوابی علاقوں میں، شاہی سزا کے خوف نے تحریکِ اصلاح کلیسا کے تعارف کو، اپنے ابتدائی پھیلاؤ کے بعد کم از کم ایک دہائی تک روکے رکھا۔ آخر کار سیکسونی میں۔ بران شوائیگ لیون برگ، این ہالٹ، اور مینسفیلڈ کے ایوانوں نے 1520 کی دہائی کے آخر میں تحریک کو اختیار کر لیا۔ یہ تحریک کی ابتدائی تاریخ کا ایک اہم واقعہ تھا کیونکہ اس نے اس تحریک کو غیر کلیسائی حکام کی طرف سے حمایت دلوائی۔ اُن کی حمایت نے اصلاح کاروں کو سلطنت کے حکمرانی کے موجود حکومتی ڈھانچے کی مخالفت کرنے میں مدد دی۔ جس میں کلیسا نے ایک اہم کردار ادا کیا۔ 1530 میں بہت سے پروٹسٹنٹ شہروں اور نوابوں نے آسبرگ کے اصولوں کے بیان پر دستخط کر دیئے، باوجود رئیس تاگ (Reichstag) (جرمنی کی مجلس مقنّنہ) کی طرف سے مذمت کے، جس میں بائیس شقیں لوتھر کے پیغام کو بیان کر رہی تھیں۔ 1530-1531 میں پروٹسٹنٹ حلقہ ہائے انتخاب نے ایک اتحاد تشکیل دیا جسے شمال کالڈک لیگ (Schmalkaldic League) کے نام سے یاد کیا گیا۔ 1535 تک، بہت سے پروٹسٹنٹ اہم خود مختار شہروں نے لیگ میں شمولیت اختیار کر لی، جس نے کیتھولک حملے کے خلاف دفاع مہیا کیا۔ ڈنمارک نے جلدی سے لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس نے 1520 کی دہائی میں بادشاہ فریڈرک اوّل (1523-1533) اور کرسچین سوم (1533-1559) کے شاہی فرمانوں کے تحت تحریک کو قبول کر لیا تھا۔ اس لیگ کی طرف سے مہیا کردہ دفاع نے ایک دہائی کے اندر ایک امن معاہدے کی گنجائش پیدا کر دی۔ آخر کار شہنشاہ نے شمال کالڈک جنگ (1547) میں لیگ کو کھول دیا۔ تاہم اس چیز نے پروٹسٹنٹوں اور بادشاہ کے درمیان کشاکش کو ختم نہ کیا۔ یہ 1555 تک نہ ہوا کہ آسبرگ کی ریخستاگ نے خود مختار نوابوں اور

www.MashalBooks.org

مقدس رومی سلطنت کے حکمرانوں کو اپنی رعایا کے مذہب کا فیصلہ کرنے کی اجازت دے کر بہت سے تنازعات کو خاموش کرا دیا۔

تحریکِ اصلاح کلیسا کا عہد، سلطنت عثمانیہ کے عروج کا بھی زمانہ تھا۔ یہ حقیقت کہ ہیپسبرگ، مقدس رومی سلطنت کے شہنشاہ چارس پنجم نے، پروٹسٹنٹ اتحادوں کو تیزی سے نہ کُچلا.....اگرچہ وہ شخص تھا جو بطور مقدس رومی شہنشاہ اور شاہِ ہسپانیہ کلیسا سے توسیع اقتدار حاصل کرنے والا واحد حکمران تھا، اور یورپ میں اس وقت کوئی دوسرا بادشاہ یہ توسیع حاصل نہیں کرتا تھا .....تو اس کی وجہ جزوی طور پر یہ تھی کہ وسطی یورپ میں عثمانی حملے شروع ہو گئے تھے۔ عثمانیوں نے اس وقت تک جنوب مشرقی یورپ کے بہت سے حصے کو فتح کر لیا تھا (جس میں ہنگری، بلغاریہ، رومانیہ، یونان، بوسنیا اور سربیا شامل تھے) اور وسطی یورپ کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ اُنہوں نے یہ مہم اتنی دور تک جتنی کہ وی آنا کے دروازے تھے، بڑھا دی۔ جو کہ ہسپبرگ کے وسیع یورپی مقبوضات کے مشرقی حصے کا دارالحکومت تھا۔ مورت لاٹیکن (Murat Iyigun) (2008-2015) یہ واضح کرتا ہے لہٰذا کیتھولک قوتوں کے ہاتھ میں، اصلاح کاروں کی بدعت کی نسبت زیادہ موثر خطرہ تھا۔ عثمانی خطرے نے اُن وسائل کا رُخ موڑ دیا جو تحریک اصلاح کلیسا کے خطرے کو ٹال سکتے تھے، اور جب عثمانی خطرہ شدید ترین تھا۔ پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کے درمیان کشاکش شاذ تھی۔ لہٰذا عثمانی خطرہ تحریکِ اصلاح کلیسا کی حتمی کامیابی کیلئے اہم تھا، کیونکہ اس نے اصلاح کاروں کو وسیع تر عوام اور مقامی حکمرانوں کے ساتھ کشش حاصل کرنے کی اجازت دی۔ اس سے پہلے کہ کلیسا اور اس کے اتحادی اسے دبا سکتے۔

چھاپہ خانہ بھی تحریک اصلاحِ کلیسا کی کامیابی کیلئے بالکل اسی وجہ سے اہم تھا: اس نے تحریک کیلئے اس قدر مضبوط ہو جانے کی گنجائش نہیں پیدا کی کہ یہ ناقابل واپسی نقطے سے آگے گزر جائے۔ اور بلاشبہ، جس چیز کی تشریح کی ضرورت ہے وہ مقدس سلطنت روما میں تحریکِ اصلاحِ کلیسا کا ابتدائی پھیلاؤ ہے۔ وہ کونسے میکانئے تھے جنہوں نے تحریک کے پھیلنے کی گنجائش پیدا کی، برخلاف کلیسا کی طاقت کے خلاف سابقہ تحریکوں کے، جن کا انجام عام طور پر پُرتشدد طریقے سے دبائے جانے پر ہوا؟



# چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کا تحریک اصلاحِ کلیسا کے ساتھ تعلق جوڑنا

''[چھاپہ خانہ ہے] خدا کا بلند ترین حتمی رحمت کا عطیہ، جس کے ذریعے وہ اپنی انجیل کو آگے پہنچاتا ہے۔''

مارٹن لوتھر (سپیٹز Spitz 1985 میں دیا گیا حوالہ) کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ پچھلی ہزاری کے مغربی دُنیا کے دو اہم ترین واقعات..... چھاپہ خانہ پھیلاؤ اور پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا.....مقدس سلطنت رُوما میں ایک دوسرے سے 250 میل کے فاصلے پر اُبھرے؟ کیا یہ محض ایک اتفاق ہے کہ تحریک اصلاح کلیسا، چھاپہ خانہ کے پورے یورپ میں مضبوط ہو جانے کے بعد شروع ہوئی؟ غالباً نہیں۔ مارک یوایڈورڈز (Mark U. Edwards) (1994، صفحہ 1) لوتھر اور چھاپہ خانہ پر اپنی کتاب کا آغاز اس بات کا ذکر کرنے سے کرتا ہے، ''تحریکِ اصلاحِ کلیسا نے پہلی بڑی شعور خویش کی کوشش حال ہی میں ایجاد شدہ چھاپہ خانہ کو، عوامی تحریک کو تشکیل دینے اور اُسے راستے پر ڈالنے سے کی۔'' بلاشبہ، کیا یہ ممکنہ طور پر ایک اتفاق ہو سکتا ہے کہ لُوشین فیبور (Lucien Febvre) اور ہنری ژاں مارٹن (Henry Jean Martin) (1958 صفحہ 288)، کے الفاظ میں اصلاح کاروں نے ''پہلی پروپیگنڈے کی مہم جو چھاپہ خانہ کے ذریعے سے چلائی گئی'' کو استعمال کیا؟

چھاپہ خانہ اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے درمیان جوڑا گیا کلاسیکی تعلق پیداوار کو بڑھانے کی پہلی حکمت عملی ہے، جو اس کردار پر توجہ مرکوز کرتی ہے، جو معلوماتی ٹیکنالوجی نے لوتھر کے خیالات کو پھیلانے میں ادا کیا۔ بہت سے عوامل ہیں جو پیداوار کو بڑھانے کی حکمت عملی کے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ چھاپہ خانہ نے خواندہ مبلغین کیلئے جو تحریک کو شہروں اور دیہاتوں میں لے کر آئے، کتابوں کو پھیلانے کی گنجائش پیدا کی۔ نقل وحمل کے بہت زیادہ اخراجات اور حقوقِ اشاعت کے فقدان کا مطلب یہ تھا کہ طباعت کار اکثر اوقات مطبوعہ مواد کو

دوردراز مقامات پر نہیں بھیجتے تھے۔ اس کی بجائے، یہ مواد زیادہ تر دوبارہ طباعت کے ذریعے پھیلتا تھا۔ لہٰذا وہ لوگ جو چھاپہ خانوں والے شہروں میں یا چھاپہ خانوں کے قریب رہتے تھے، اُن کی رسائی سستے کتابچوں تک بہت زیادہ ہوتی تھی، اور سیاح مبلغین بھی ان علاقوں میں ممکنہ طور پر زیادہ موثر ہوتے تھے۔(11)

یہ بھی ممکن ہے کہ چھاپہ خانے نے تحریکِ اصلاح کلیسا کی طلب کو متاثر کیا ہو۔ الزبتھ آئسنِ سٹائین (Elizabeth Eienstein) (1979) یہ استدلال کرتی ہے کہ طباعت کے کلچر نے شہروں کو تبدیل کر دیا، بعض صورتوں میں متمول لوگوں اور متوسط طبقوں کی زیادہ سماجی اہمیت حاصل کرنے کی خواہشات کو پیدا کر دیا۔ جوابی طور پر اس نے طباعتی شہروں کو تحریک کی پذیرائی پر زیادہ آمادہ کیا ہوگا، کیونکہ اُبھرتے ہوئے، متمول طبقے میں، اُس پُرانے نظام کو جس پر کلیسا اور زمیندار طبقے کے مفادات کا غلبہ تھا، اُکھاڑ پھینکنے کا جذبہ محرکہ تھا۔ آئزن سٹائین (1979، صفحہ 132) بھی یہ اشارہ کرتی ہے کہ تحریکِ اصلاح کلیسا کی طلب چھاپہ خانہ کے ہاتھوں، ایک بہت باریک طریقے سے بڑھائی گئی ہوگی:

''جب معاشرتی سالمیت کم ہوگئی، تو زیادہ دور کے واقعات میں نباہتی شرکت بھی بڑھ گئی: اور جبکہ مقامی تعلقات بھی کمزور ہوگئے، تو زیادہ بڑی اجتماعی اکائیاں بھی تشکیل دی جارہی تھیں۔ مطبوعہ مواد نے اُن مقاصد کے ساتھ، خاموش وابستگی کی حوصلہ افزائی، جن کے پرچارک کسی ایک بستی میں نہیں پائے جاسکتے تھے، اور جو دُور سے ہی ایک غیر مرئی عوام کو خطاب کرتے تھے۔''

تاہم، اس بات کا امکان نہیں ہے کہ چھاپہ خانہ نے تحریک اصلاح کلیسا کی سہولت کاری، کُلی طور پر، اصلاح کی طلب کو متاثر کرکے کی ہو۔ تحریک اصلاحِ کلیسا کے قبل کے الحادیہ ظاہر کرتے ہیں کہ، تحریک سے پہلے بھی اصلاح کی بہت کثرت سے طلب تھی..... بلاشبہ چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ سے پہلے۔ کچھ قبل تحریک کے کلیسا کے زعما نے پوپ سے طاقت چھیننے اور چرچ کے پادریوں کے جاہ وجلال کو کم کرنے کی کوشش کیں اور اس کی بجائے طاقت کلیسا کی کونسلوں کو منتقل کرنے پر زور دیا۔ ژاں گرسن (Jean Gerson) (1362-1429) اس ''اندر سے اصلاح'' کا سرکردہ حامی تھا، اور وہ لوتھر کی تحریروں پر ایک اہم اثر رکھنے والا شخص تھا۔ گرسن نے اُس وقت



لکھا جب کلیسا کے اندر فرقہ بندی تھی، جبکہ دو مخالف پوپ اَیوگنن اور روم میں اپنی اپنی نشست گاہوں سے، 1378 سے لے کر 1418 تک اپنے اپنے دعوے کر رہے تھے۔ اس دھڑے بندی نے کلیسائی مجلسی تحریک کو ابھرنے میں مدد دی۔ جس نے یہ دعویٰ کیا کہ پوپ کو کلیسا کے اندر اعلیٰ اختیار نہیں ہے؛ اس کی بجائے ایکیومینکل کونسل (Ecumenical Council) (چوٹی کے کلیسائی زُعما اور ماہرین دینیات کی مجلس) کلیسا کے اندر اقتدار کی مالک تھی۔ کلیسا کے زُعما نے ایسی اصلاحات کی ناکام کوشش کی، لیانز کی کونسلوں میں، (1274) ویان، (1312-1311)، کانٹیسن (1418 -1414)، یاویا۔ سینا (24-1423) اور باسل (1439-1431) میں (12)۔ درحقیقت باسل میں پاپائیت مخالف ایجنڈے کی حمایت سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کے اُن آزاد شہروں سے شروع ہوئی، جو اسی سال بعد تحریک اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ میں بہت اہم تھے۔ یہاں تک کہ تحریکِ اصلاح کلیسا کے موقع پر بھی کلیسا کی اندر سے اصلاح کرنے پر خاصا دباؤ تھا، لیکن پانچویں لیٹران کونسل (1517-1512) میں کی جانے والی کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ تحریکِ اصلاح کلیسا سے قبل کی صدیوں میں دوسری بدعات کی کثرت تھی۔ پندرھویں صدی کے انگلستان میں، لولارڈ تحریک نے جان وِکلف (John Wyclif) (وفات 1384) کے خیالات کو پھیلایا۔ گرسن کی طرح وِکلف نے بھی اَیوگنن اور روم کے درمیان بڑی دھڑے بندی کے دوران لکھا۔ وکلف غیر کلیسائی حکمرانوں کے پاپائیت پر حقوق کا حامی تھا..... وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ غیر کلیسائی حکمرانوں کو غیر مستحق پادریوں کی جائیداد کو لینے کا حق تھا..... اُسے غریب تر بستی کے پادریوں پر اہم اثر ورسوخ دیتے ہوئے۔ وِکلف اس حد تک چلا گیا کہ اُس نے استحالۂ عشائی (رومن کیتھولک عقیدہ کہ عشائے ربانی کی روٹی اور شراب اپنی شکل برقرار رکھتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کے جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔ مترجم) کے اصول پر حملہ کر دیا، جو کہ پروٹسٹنٹوں کیلئے اصولی حملے کا ایک بنیادی نکتہ بن گیا۔ کلیسا نے اُس بولارڈ تحریک کو جس میں وکلف نے روح پھونکی، اس کی وفات کے بعد نصف صدی میں بے دردی سے کچل دیا۔ یہ اُن کے بیشرو والدویوں (Waldensians) (عیسائیوں کا ایک فرقہ جو پاکدامنی پر بہت زور دیتا ہے) نے بھی بارھویں اور تیرھویں صدی میں اسی انجام کا سامنا کیا تھا۔ والدوئی، جنہوں نے غربت کا حلف لیا ہوا تھا۔ نے کلیسا کی دولت کی کھلی نمائش اور کلیسائی پادریوں کی دُنیاوی زندگیوں کو مسترد کر دیا۔ اُنہوں

نے فرانس، سپین اور اٹلی میں کچھ اثر ورسوخ حاصل کیا، لیکن کلیسا اور اس کے اتحادیوں نے، جہاں کہیں بھی وہ اُبھرے، اُنہیں کچل دیا، 1192 میں فرانس میں اُنہیں ہتھکڑیاں لگانے کا حکم دیا گیا؛ 1194 میں اُنہیں ایرے گون سے جلاوطن کر دیا گیا اور وہاں کی آبادی کو اُنہیں پناہ یا خوراک دینے سے منع کر دیا گیا؛ اور جیرونا کی کونسل 1197 میں اُن کے خلاف جلا کر موت کے گھاٹ اُتارنے کا حکم وضع کیا گیا۔(13)

غالباً، کلیسا کو سب سے بڑا چیلنج، پراگ کے مبلغ جان ہس (Jan Hus) (عیسوی 1372-1415) کی طرف سے یا جس نے پندھرویں صدی کے آغاز میں اُس کے خلاف کلیسا تحریک کی قیادت کی جس کا نام اُسی کے نام پر تھا۔ ہَس نے گناہ گار کلیسائی ارکان کو اُن کے مناصب اور دولت رکھنے کے حقوق کو چیلنج کیا، اُس اخلاقیات کی مذمت کی جو اُس نے بدعنوان پادریوں اور پوپ میں دیکھی، اور وِکلف کی ملحدانہ تحریروں کو چیک زبان میں ترجمہ کیا۔ اس وجہ سے کلیسا نے ہَس کو 1410 میں کلیسا سے خارج کر دیا، اگرچہ اُس نے کلیسا کی برائیوں کے خلاف، جیسا کہ کسی بھی شخص کو جو نیپلز کے بادشاہ کے خلاف صلیبی جنگ کیلئے فنڈ مہیا کرے معافی ناموں کا پیش کرنا، بولنا جاری رکھا۔ نے یہ موقف آخر کار، 1415 میں چرچ کی طرف سے اُسے چتا میں جلانے پر منتج ہوئے۔ (14) ہس کی تحریک، جو اگلی صدی میں بھی جاری رہی، نے، پورے بوہیمیا میں مخالف کلیسا قائم کر دیئے: جو رومی افسر شاہی کے انکار پر مبنی تھے۔ رومی کلیسا ہَس کی تحریک کو محدود کرنے میں کامیاب ہو گیا.....اس حد تک جاتے ہوئے کہ اُس نے بوہمیا میں ایک جہاد بھیج دیا.....اور ہس کا اثر بوہیمیا سے آگے کبھی نہ جا سکا.....ہس کے پیروکار بوہیمیا سے باہر کبھی زیادہ کشش حاصل نہ کر سکے، کیونکہ کلیسا جلد ہی کسی بھی ایسے شخص کے خلاف سزا نافذ کرنے میں کامیاب ہو گیا، جو ہس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا۔

یہ بات بڑی حیران کُن ہے کہ کلیسا نے بڑی آسانی سے اصلاح کی تمام کوششوں کو کچل ڈالا جو چھاپہ خانہ کی ایجاد اور پھیلاؤ سے پہلے اُٹھیں۔ اے۔ جی ڈِکنز (A. G Dickens) (صفحہ 51 ,1968) واضح طور پر ان تحاریک اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان یہ موازنہ کرتا ہے: ''وِکلف اور والدولوں کی بدعات کے برخلاف، لوتھر کی بدعت پہلے دن سے ہی چھپی ہوئی کتاب کی پیداوار تھی۔'' لیکن چھاپہ خانہ کے ادا شدہ کردار کو جو اُس نے تحریکِ اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ



میں ادا کیا، دوسرے مقاصد سے علیحدہ کرنا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، کیا چھاپہ خانہ کے کردار کو، فرض کیا، معافی ناموں کی فروخت میں اضافے سے، علیحدہ کرنا ممکن ہے؟ .....سبی دعویٰ کرنے کیلئے، طباعت کے پھیلاؤ کا تعلق تحریکِ اصلاح کلیسا سے جوڑنے کے لیے، زیادہ گہرائی میں کھودنا ضروری ہے۔ میں نے اپنے 2014 کے مضمون میں بالکل یہی کیا، جس میں میں نے چھاپہ خانوں، تحریکِ اصلاحِ کلیسا کی حیثیت اور معاشی خصوصیات پر شہری سطح کے اعداد وشمار جمع کئے اور اُن کا تجزیہ کیا۔ آئندہ حصہ اس تجزیے کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتا ہے۔

www.MashalBooks.org

# تحریکِ اصلاحِ کلیسا پر چھاپہ خانے کے اثر کو جانچنا

روبن (Rubin) (2014b) میں منعقدہ تجزیے کا مرکزی نکتہ مقدس سلطنت روما تک محدود ہے، جو طباعت اور تحریکِ اصلاح کلیسا دونوں کی جنم بھومی ہے (15) مقدس سلطنت روما پر توجہ مرکوز کرنا مفید ہے، کیونکہ یہ وہ جگہ ہے جہاں تحریکِ اصلاح کلیسا پہلے پہل پھیلی؛ کیونکہ اصلاح کی اس سے پہلے، اتنی زیادہ کوشش کبھی شروع نہ ہوسکیں۔ جب ایک مرتبہ تحریکِ اصلاح کلیسا پوری سلطنتِ روما میں پھیل گئی، تو اس نے ہر جگہ پر اپنی ہی ایک زندگی اختیار کرلی۔ ہنری ہشتم تحریکِ اصلاحِ کلیسا کو اپنے حکمرانی کے اور مالیاتی مقاصد کی مناسبت کی وجہ سے انگلستان لے آیا (دیکھئے باب 7) ہنری ہشتم کی طرح، سویڈش بادشاہ گستاف اوّل (Gustav 1) (عہد 1523-1560) نے بھی سویڈش تحریک اصلاحِ کلیسا کے دوران، کلیسا کی زمین ضبط کرلی۔ فرانس میں 1550 کی دہائی میں کیلوینسٹ کلیسا مغرب اور جنوب میں تیزی سے پھیل گئے۔ فرانسیسی بادشاہ نے پُرتشدد طریقے سے ان پروٹسٹنٹوں کو دبادیا، جنہیں ہوجنائس کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، جب تک کہ اُنہوں نے 1570 کی دہائی سے لے کر 1590 کی دہائی تک امن معاہدوں کے ایک سلسلے پر اتفاق نہ کرلیا۔ ایسی ہی تحاریک زیریں ممالک میں بھی واقع ہوئیں، جہاں اور بیخ کے ولیم نے نئے مذہب کو اپنے ہاں شامل کرلیا، جزوی طور پر ایک ہسپانوی حکومت کے خلاف ڈچ بغاوت کی حمایت کرنے والے پروپیگنڈے کے طور پر (دیکھئے باب 7)۔ ان میں سے ہر ایک صورت میں تحریکِ اصلاح کلیسا ایسے اسباب کی بنا پر پھیلی، جن کا اس کے ظہور کے اسباب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن ٹھیک یہی نکتہ ہے: تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے ابتدائی پھیلاؤ کے بغیر، ہنری ہشتم، گستاف اوّل،



ولیم آف اور بیخ اور اُن کے پروٹسٹنٹ مثیلوں کو ایسا موقع نہ ملتا۔

شماریاتی تجزیے کی خاطر، مقدس سلطنتِ روما کا مطالبہ اس وجہ سے باسہولت ہے کیونکہ وہاں سلطنت کے اندر مذہبی اختیار میں خاصا تنوع تھا۔ مذہب میں کسی تنوع کے بغیر، یہ جانچنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں کیا محرک عوامل تھے؛ ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ ایک شہر کو، تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے پر کس چیز نے قائل کیا، اگر اُن سب کے سب نے ہی ایسا کیا ہو (یا کسی ایک نے بھی نہ کیا ہو)؟ اسی طرح مقدس سلطنتِ روما میں تنوع ایک آدمی کیلئے اس بات کی گنجائش پیدا کرتا ہے کہ وہ اُن مختلف عوامل کی اہمیت کا اندازہ لگا سکے کہ جو کسی شہر کے تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کا سبب بنے۔ جدول 6.1 ابتدائی شہادت مہیا کرتی ہے؛ یہ سلطنتِ روما کے ایسے شہروں کی ایک فہرست مہیا کرتی ہے، جن کی آبادی کم ازکم 20,000 تھی ساتھ ہی ساتھ 1600 میں اُن کے مذہبی رُجحانات کیا تھے، اور آیا کہ 1500 تک اُس شہر میں چھاپہ خانہ تھا۔ اس جدول سے فوری طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ مقدس سلطنت روما میں اکثر بڑے شہروں میں چھاپہ خانے تھے۔ یہ بات حیران کُن نہیں ہے۔ طباعت 1450 میں اپنی ایجاد کے بعد، مینز کے شہر سے باہر پھیلی، اور طباعت کار عمومی طور پر آبادی کے بڑے مراکز کی طرف نقل مکانی کرنے لگے جہاں مطبوعہ مواد کی طلب سب سے زیادہ تھی۔ یہ وہ بنیادی وجہ ہے کہ اے. جی ڈِکنز (A.G. Dickens) (1974) کا اکثر حوالہ دیا جانے والا دعویٰ کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا ایک ''شہری مظہر'' تھا، ایک فرضی تعلق ہوسکتا ہے۔ اگر تحریک اصلاح کلیسا کی قبولیت میں چھاپہ خانہ ایک واقعی اہم سببی عامل ہوتا، تو اس تحریک کو قبول کرنے والے شہروں کو ممکنہ طور پر بڑے شہر ہونا چاہئے تھا، کیونکہ بڑے شہر ہی ممکنہ طور پر چھاپہ خانے کے حامل تھے۔

www.MashalBooks.org

**جدول 6.1:** مقدس سلطنتِ رُوما میں بڑے شہر (آبادی 20,000 سے زیادہ)

| (20,000) سے زیادہ آبادی والے) وہ شہر جن میں 1500 تک چھاپہ خانے تھے | | (20,000 سے زیادہ آبادی والے) وہ شہر جن میں 1500 تک چھاپہ خانے نہیں تھے |
|---|---|---|
| شہر | 1500 میں آبادی | 1600 تک پروٹسٹنٹ / کیتھولک |
| پراگ | 70,000 | کیتھولک |
| گینٹ | 55,000 | کیتھولک |
| کولون | 45,000 | کیتھولک |
| نورمبرگ | 38,000 | پروٹسٹنٹ |
| برجز | 35,000 | کیتھولک |
| برسز | 33,000 | کیتھولک |
| آس برگ | 30,000 | پروٹسٹنٹ |
| اینٹورپ | 30,000 | کیتھولک |
| بریس لاؤ | 25,000 | پروٹسٹنٹ |
| لیوبیک | 25,00 | پروٹسٹنٹ |
| ٹورانی | 35,000 | کیتھولک |
| لِلّی | 26,000 | کیتھولک |
| مَیچلین | 25,000 | کیتھولک |
| ریجنسبرگ | 22,000 | پروٹسٹنٹ |
| سٹراس برگ | 22,000 | پروٹسٹنٹ |
| وی آنا | 20,000 | کیتھولک |

**نوٹ:** آبادی کے اعداد و شمار از بیروچ اے آل (Bairoch et.al (1988)



چھاپہ خانہ اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان تعلق کو سمجھنے کے لیے آبادی کے علاوہ بھی کسی چیز کو مدِّنظر رکھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر، شکل 6.5 پر ایک طائرانہ نگاہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ کسی شہر کے تحریکِ اصلاحِ کلیسا کو قبول کرنے کے امکان میں وٹن برگ کے ساتھ قربت ایک کردار ادا کرتی تھی۔ (16) یہ بھی ممکن ہے کہ اُن شہروں نے جن میں یونیورسٹیاں تھیں تحریکِ اصلاح کلیسا کو رد کیا ہو..... بہت سی یونیورسٹیاں کلیسا کے قلعے تھے.....لیکن اُنہوں نے چھاپہ خانے کو اپنی تدریسی نوعیت کی وجہ سے جلد قبول کرلیا ہو۔ ہیوجُونگ کم (Hyojoung Kim) اور سٹیفن فاف (Steven Pfaff) (2012) یہ استدلال کرتے ہیں کہ بلاشبہ یونیورسٹی کے طلبہ وہ اہم کڑیاں تھے، جو یونیورسٹیوں سے تحریکِ اصلاح کلیسا کے وسیع تر پھیلاؤ تک تحریک کے حامی اور مخالف نظریات کو آپس میں ملاتے تھے۔ اُن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ شہر جن میں وٹن برگ اور باسل (زونگلی کے علمی مرکز) کی یونیورسٹیوں کے متعدد طلبا قیام کرتے تھے، تحریک کو قبول کرنے پر زیادہ مائل تھے، جبکہ وہ شہر جہاں کولون اور لووین (کیتھولک قلعے) کے طلبا قیام کرتے تھے۔ تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے پر کم مائل تھے 17 جدول 6.2 بھی اسی امکان کی طرف اشارہ کرتی ہے؛ یہ مقدس رومی سلطنت میں ایسے گیارہ شہروں کی فہرست پیش کرتی ہے، جن میں 1450 میں گٹن برگ کے متحرک ٹائپ والے چھاپہ خانے ایجاد کرنے تک یونیورسٹیاں موجود تھیں۔ تمام چھ کے چھ یونیورسٹی کے حامل شہر جن میں پہلے سے ہی اسقف یا اُسقفِ اعظم رہتے تھے، کیتھولک ہی رہے۔ اسی دوران میں اُن پانچ کو یونیورسٹی کے حامل شہروں میں چار نے، جہاں اُسقف یا اُسقف اعظم نہیں تھے پروٹسٹنزم اختیار کرلیا۔ یہ چیز، تحریکِ اصلاح کلیسا کے اختیار کرنے پر یونیورسٹیوں کے دوہرے اثر کی نشاندہی کرتی ہے: وہ جو کتھولک کے مراکز میں تھیں، وہ تحریک کو دور رکھنے میں کامیاب ہوگئی ہوں گی، اور وہ جو کیتھولک کے مراکز میں نہیں تھیں اُنہوں نے ممکنہ طور پر تحریک کو مثبت انداز سے لیا ہوگا۔ بلاشبہ یہ ایسے نتیجے کیلئے بمشکل ہی کوئی ٹھوس شہادت ہے ..... یہ صرف گیارہ شہروں سے حاصل ہونے والی شہادت ہے.....لیکن اس بات کی ضرورت کی نشاندہی ضرور کرتی ہے کہ طباعت کے پھیلاؤ اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان سببی تعلق جوڑنے سے پہلے متعدد عوامل کو مدِنظر رکھنا چاہیے۔

www.MashalBooks.org

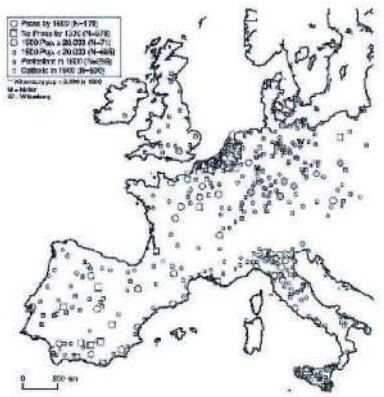

**شکل 6.5:** طباعت اور پروٹسٹزم مغربی اور وسطی یورپ میں

ذرائعہ:- نقشِ ثانی لیا گیا از جیرڈ روبن، ''طباعت اور پروٹسٹنٹ: تحریکِ اصلاح کلیسا میں طباعت کے کردار کی ایک تجربی آزمائش''

An Empirical Test of the Role of Printing in the Reformation, "The Review of Economics and Statistics, 96:2 (May, 2014) P.P.270-86.c by the President and Fellows of Harvard College and the Massachusetts Institute of Technology.

**جدول 6.2:** 1450 تک مقدس سلطنتِ روما میں یونیورسٹیوں کے حامل شہر

| شہر | 1500 میں آبادی | اُسقف کی عملداری | (1600 تک) پروٹسٹنٹ کیتھولک |
|---|---|---|---|
| پراگ | 70,000 | ہاں | کیتھولک |
| کولون | 45,000 | ہاں | کیتھولک |
| وی آنا | 20,000 | ہاں | کیتھولک |
| ارفرٹ | 19,000 | نہیں | پروٹسٹنٹ |
| لیوون | 17,000 | نہیں | کیتھولک |
| لائیزگ | 10,000 | نہیں | پروٹسٹنٹ |
| روسٹاک | 10,000 | نہیں | پروٹسٹنٹ |
| ہائیڈل برگ | 8,000 | ہاں | پروٹسٹنٹ |
| ٹرائر | 8,000 | ہاں | کیتھولک |
| وورزبرگ | 7,000 | ہاں | کیتھولک |
| ڈول | 5,000 | ہاں | کیتھولک |



**نوٹ:** آبادی کے اعداد و شمار از بیروچ اے آل:(1988)

خوش قسمتی سے سماجی سائنسدانوں کے پاس ایک طریقہ ہے جسے مخلوط معکوسی تجزیہ (ایک مضبوط تکنیک جو دو یا دو سے زیادہ متغیرات کی نامعلوم قدر کی پیش بینی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔) کہتے ہیں، جو آدمی کو ان مسائل سے نمٹنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ اس بات کی بہترین موزوں پیش بینی مہیا کرتا ہے کہ ایک متغیر کس طرح دوسرے متغیر کو متاثر کرتا ہے جبکہ دوسرے تمام متغیرات کو مستقل رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں نتائج ہمیں بتا سکتے ہیں: فرض کیا ایک شہر کی آبادی لا ہے، اس میں یونیورسٹی ہے، ایک اُسقف کا گھر ہے، اور دوسری بہت سی چیزیں ہیں، تو اوسط امکان کیا ہے کہ اس شہر نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کیا ہوگا، اگر اس میں ایک چھاپہ خانہ بھی تھا؟ اور اس چیز کا اوسط امکان کیا ہے کہ اس نے تحریک کو قبول کیا ہوگا اگر اس میں چھاپہ خانہ نہیں تھا؟

اگر مشاہدہ میں نہ آنے والے پہلو بھی کسی شہر کے چھاپہ خانہ اور تحریکِ اصلاح کلیسا دونوں کو اختیار کرنے کے امکان کو متاثر کرتے ہوں، جب بھی ان سوالات کا جواب دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر طباعت کے پھیلاؤ سے پہلے، خاص طور پر چھوٹے شہروں میں، خواندگی کی شرح نامعلوم ہیں، لیکن چھاپہ خانہ سے قبل کی خواندگی چھاپہ خانے کو اور تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کو متاثر کر سکتی تھی۔ زیادہ تر خواندہ قصبوں کا چھاپہ خانوں کو قبول کرنے کا امکان زیادہ تھا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کے ہاں تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کی خواہش بھی زیادہ ہو، ممکنہ طور پر انسان دوست فلسفے میں زیادہ دلچسپی کی وجہ سے یا کلیسا کی بدعنوانی کی زیادہ آگاہی کی وجہ سے۔ متبادل صورت میں، زیادہ خواندہ قصبات کیتھولک مورچے ہوں گے، کیونکہ وہاں بہت سے کلیسائی ارکان خواندہ ہوں گے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے قصبات کا تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کا امکان کم تھا۔ دونوں طرح سے، ایک معاشی شماریاتی تکنیک، جسے Two stage lest squares regression analysis ایک شماریاتی تکنیک جسے ساختیاتی مساواتوں کے تجزیے میں استعمال کیا جاتا ہے کے نام سے جانا جاتا ہے، کے ذریعے، چھاپہ خانہ سے قبل کی خواندگی کی کسی ٹھوس شہادت کے بغیر، طباعت کے پھیلاؤ اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان تعلق کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن ہے۔ یہ تکنیک دو اثرات کی علیحدگی کو ممکن بناتی ہے۔ اُن پہلوؤں کا تخمینہ لگا کر، جو اس بات پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ آیا شہر میں چھاپہ خانہ موجود تھا، پھر اسی معلومات کو، شہر کے تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کے امکان پر چھاپہ خانہ کے اثر کا تخمینہ لگانے کے لیے استعمال کر کے (19)۔

The 25Lsregression analysis (ایک شماریاتی تکنیک) جسے چھاپہ خانے اور تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان تعلق کو آزمانے کے لیے استعمال کیا جائے بہت مضبوط نتائج مہیا کرتا ہے۔ یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ 1500 سے پہلے، محض چھاپہ خانے کی موجودگی سے اس بات کا امکان بڑھ جاتا تھا، کہ ایک شہر 1530 میں 52.1 فیصد درجوں سے پروٹسٹنٹ بن جائے گا، اور 1600 میں 29.0 فیصد درجوں تک پروٹسٹنٹ بن جائے گا، باقی سب کچھ برابر ہوتے ہوئے۔ یہ نتائج ''95 فیصد اعتماد کی دہلیز'' سے بہت آگے ہیں، جو کہ معمول کے مطابق کسی نتیجے کے شماریاتی طور پر اہم ہونے کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہے، جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ اور تحریکِ اصلاح کے درمیان ایک مضبوط تعلق ہے۔ جدول 6.3 بعض دوسرے معکوس عددی سر کی فہرست پیش کرتی ہے، جو 95 فیصد اعتماد کے ساتھ شماریاتی طور پر اہم ہیں۔ (یہ صرف شماریاتی طور پر اہم عددی سروں کی فہرست دیتی ہے ان عددی سروں کی تعبیر ایسے کی جاسکتی ہے: اگر کسی شہر کی خصوصیات سب سے بائیں طرف والے کالم میں تھی، (یعنی اس میں چھاپہ خانہ تھا، یہ ایک آزاد شاہی شہر تھا، اس میں یونیورسٹی تھی، یا یہ بشپ کی عملداری تھی)، تو اس



کا چھاپہ خانہ یا تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کا امکان متاثر ہوتا تھا، باقی تمام چیزوں کے برابر ہوتے ہوئے، اس کے جوابی عدد سے۔ اسی طرح، آدمی منیز یا وٹن برگ تک ہوائی جہاز کے طے کردہ فاصلے کو یا اس کی آبادی کو جوابی کالم میں دیئے ہوئے عدد سے ضرب دے سکتا ہے، یہ دیکھنے کیلئے کہ ان متغیرات نے چھاپہ خانہ یا تحریک اصلاحِ کلیسا کی قبولیت کو کس طرح متاثر کیا۔ توقع کے مطابق، وٹن برگ سے زیادہ دوری تحریکِ اصلاح کلیسا کی پذیرائی کے امکان کو کم کر دیتی ہے۔ یونیورسٹی والے شہروں کی نسبت بہت زیادہ تھا، (36.5 فیصد کے درجے سے، اگرچہ اُن کا تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرنے کے امکان کا کم یا زیادہ ہونا واضح نہیں تھا) اور اسقف (21.4 فیصد درجوں تک) بغیر اُسقف کی عملداری کی نسبت، جبکہ تحریک اصلاحِ کلیسا کو قبول کرنے کا اُن کا امکان کم تھا (11.9 فیصد درجوں تک)۔

**جدول 6.3:** 25SLS معکوسی عددی سر۔ شہر کی خصوصیات کا تحریکِ اصلاحِ کلیسا پر اثر

| | **کیا ایک شہر نے 1500 تک چھاپہ خانہ کو اپنایا** | **کیا ایک شہر نے 1600 تک تحریکِ اصلاح کلیسا کو اپنایا** |
|---|---|---|
| **1500 تک چھاپہ خانہ** | | **29.0%** |
| منیز تک کا log فاصلہ | 19.2% | - |
| وٹن برگ تک کا log فاصلہ | 8.8% | -34.3% |
| 1500 میں log آبادی | 12.7% | -4.3% |
| آزاد شاہی شہر | - | 3.8% |
| یونیورسٹی کا حامل شہر | 36.5% | - |
| اُسقف کی عملداری | 21.4% | -11.9% |

اگرچہ اس بات کی نشاندہی کیلئے کہ آیا تحریکِ اصلاح کلیسا کی طرح کا کوئی واقعہ، چھاپہ خانے کے بغیر رونما ہوسکتا تھا، کوئی خلافِ حقائق تاریخ موجود نہیں ہے، لیکن یہ نتائج اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے واقع ہونے کے لیے، وہ جب اور جہاں بھی

www.MashalBooks.org

واقع ہوئی، چھاپہ خانہ ضروری تھا۔ ایک دفعہ پھر کلیسا کی اصلاح کی سابقہ کوششوں پر غور کریں۔ کلیسا نے قدرے آسانی سے اور وحشیانہ طریقے سے ہنس کی تحریک، لولارڈز کی تحریک، والدویوں کی تحریک اور دوسری تحریکوں کو دبا دیا۔ ان تحریکوں کا وجود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بے احتیاتی کے بیچ صدیں سے موجود تھے۔ لوتھر کی تحریک اور اُس کے پیشروؤں کی تحریکوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ لوتھر کے پاس چھاپہ خانہ تھا۔

کلیسا کے جواز بخشی اقتدار کے اختیار پر تحریک اصلاحِ کلیسا کا نقصان دہ اثر ایک سوال اُٹھاتا ہے: پروٹسٹنٹ ریاستوں میں سیاسی حکمرانی کو توسیع دینے کے لئے چرچ کی جگہ کس نے سنبھالی؟ حکمرانوں نے توسیع اقتدار کیلئے کسی اور طرف دیکھا ہوگا۔ اُنہوں نے کس کی طرف رُخ کیا اور اس کا قوانین اور پالیسویں پر کیا اثر ہوا؟



## معاشی اشرافیہ کی طرف سے توسیع اقتدار: ایک پروٹسٹنٹ مظہر؟

تحریک اصلاح کلیسا کے بعد، مذہب جواز بخشی اقتدار کے زوال نے توسیع اقتدار کے مختلف کارندوں کے، حکمرانی میں اکثر ورسوخ کو بڑھانے کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ کلیسا کی جگہ لینے کیلئے بہترین پوزیشن میں وہ معاشی اشرافیہ تھی جو پارلیمانوں میں تھی ..... تاجران، شہری کاروباری مفادات، اور زمیندار اشرافیہ۔ پروٹسٹنٹ حکمران، اپنے کیتھولک مثیلوں کی نسبت، تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد ان اشرافیاؤں کی طرف زیادہ متوجہ ہونے لگے۔

معاشی اشرافیہ نے، مذہبی توسیع اقتدار کے اہم ترین اور مہنگے ترین متبادلات مہیا کئے اشرافیہ کی حمایت جنگ کے زمانے میں خاص طور پر اہم تھی، جب بادشاہوں کو رقم اور وفاداری دونوں کی ضرورت تھی۔ بلاشبہ روز افزوں مجموعہ تحاریک اس بات کی طرف رہنمائی کرتا ہے، کہ سترھویں صدی میں شروع ہوکر، روز افزوں بڑی اور خوب منظّم ریاستوں کے مقابلے میں دفاع کی ضرورت نے حکمرانوں اور معاشی اشرافیہ کے درمیان ایک مشترکہ مفاد پیدا کر دیا۔ تاکہ یہ دونوں مل کر عوام کو زیادہ بڑے پیمانے پر اشیا مہیا کر سکیں، خاص طور پر دفاع، جو کے بدلے میں محاصل تک زیادہ رسائی کا تقاضا کرتا تھا۔(20)

جبکہ غیر ملکی حملے سے بچاؤ نے، بڑے پیمانے کے مالی اداروں کی بڑھوتری کیلئے قوتِ محرکہ کا کام دیا ہوگا، معاشی اشرافیہ دوسری چیزوں کے حصول کی بھی خواہشمند تھی، جو اُن کے معاشی مرتبے میں بہتری پیدا کریں۔ بعض صورتوں میں اس کا مطلب بحری تحفظ میں سرمایہ کاری تھا، جو تجارت کو بڑھاتا اور بیرونی فوجوں کے حملوں سے حفاظت کرتا، یا غریبوں کی امداد میں سرمایہ کاری، جو آوارہ گردی کو کم کرتی اور دوسری سماجی بُرائیوں کو بھی۔ اگر اشرافیہ خاص طاقتور ہوتی۔ یا اگر حکمران اتنے کمزور ہوتے، تو وہ سب سے بڑے انعام کا تقاضا کر سکتے تھے۔ محفوظ حقوقِ ملکیت اور ان حقوق پر من مرضی کے غضب سے چھٹکارا بھی۔ جب ایک کمزور حکمران ان حقوق

www.MashalBooks.org

سے انکار کرتا، تو بعض اوقات اشرافیہ اتنی طاقتور ہو جاتی تھی کہ وہ بغاوت کر دیتی یہ چیز قرونِ وسطیٰ اور ابتدائے جدیدیت کے یورپ میں بہت مرتبہ واقع ہوئی..... اوائل تیرھویں صدی کا انگریز نوابوں (Barons) کی بغاوت (جو میگنا کارٹا پر منتج ہوتی، سپین کا کومیونروؤں کی بغاوت (یہ ایک ہسپانوی بغاوت تھی، جو کیسٹائل کے شہریوں نے چارلس پنجم اور اُس کی انتظامیہ کے خلاف 21-1520 میں برپا کی۔ (بغاوت کے عروج پر باغیوں نے کیٹائل کے مرکز کا کنٹرول سنبھال لیا۔ مترجم) 1570 کی دہائی ڈچ بغاوت اور انگلستان 1640 کی دہائی کی خانہ جنگی، اس کی چند مثالیں ہیں۔

جان لوئٹن وین زینڈن (Jan Luiten Van Zanden) ایلجو بورنگھ (Eltjo Buringh)، اور مارٹن بوسکر (Maarten Bosker) (2012) یہ استدلال کرتے ہیں، کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپی حکمرانوں کی غیر محفوظ صورتِ حال ٹھیک ٹھیک وہ وجہ ہے جس سے پارلیمانیں وجود میں آئیں، جب بھی وہ آئیں۔ بارھویں سے لے کر چودھویں صدی تک، جب شہروں میں معاشی اشرافیہ کی دولت اور طاقت اتنی بڑھ گئی کہ وہ اشراف اور کلیسا کا مقابلہ کرنے لگے، تو شہر کے زعما، اشراف اور پادریوں نے، بادشاہ کے ساتھ اجتماعی طور پر سودا بازی کرنے کیلئے پارلیمان تشکیل دیں۔ ٹیکس کے محصولات کے بدلے میں بادشاہوں نے اپنے آپ کو ضبط میں رکھنے پر اتفاق کر لیا۔ یعنی اُنہوں نے اتفاق کر لیا کہ وہ من مانی کر کے حقوقِ ملکیت کو غصب نہیں کریں گے اور ٹیکس کے محصولات کا مطالبہ جنگ کے دنوں کے دوران یا مالی بحران کے دوران کریں گے۔ پہلی پارلیمانیں سپین میں، بارھویں صدی کے اواخر میں، سپین کے کچھ حصوں کو مسلم اُمویوں کے ہاتھوں سے دوبارہ فتح کر لینے کے بعد وجود میں آئیں۔ بادشاہ الفانسو نہم (عہد 1188-1220) نے پہلی پارلیمان (کورئیز) لیون میں بُلائی۔ اُس نے اہم شہریوں ..... اشراف، اُسقفوں، اور منتخب شہریوں کی ایک مجلس بلائی..... اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کیلئے، جس کی جائزیت کم تھی، کیونکہ شہری نئے نئے فتح ہوئے تھے اور آپس کے ساتھ کسی قسم کی وفاداری نہیں رکھتے تھے۔ کلیسا کے زُعما، اشراف، اور شہری زُعما پر مشتمل پارلیمان انگلستان، فرانس اور پُرتگال میں تیرھویں صدی میں اور بعد میں باقی ماندہ یورپ میں تیزی سے پھیل گئیں۔ ان پارلیمانوں نے محدود حقوق کے بدلے میں ٹیکس کے محصولات ایک مستقل دھارے کی شکل میں وصول



کرنے، بشمول نئے ٹیکسوں پر حق استرداد حاصل کرنے میں حکمرانوں کی مدد کی۔ 1800 تک مغربی یورپ کے تقریباً تمام حصوں میں ''بادشاہ اور کونسل'' کا ہی حکمرانی کا ایک غالب سانچا تھا۔ (22) روجر کانگلٹن (Roger Congleton) (2011 صفحہ 192) تحریر کرتا ہے کہ ''خرد افروزی کے علما کی طرف سے تجزیہ کیے گئے حکومتی متبادلات کی قلت، یہ ظاہر کرتی ہے کہ، یورپ میں دورِ وسطیٰ کے اواضر اور جدید دور کے اوائل میں حکمرانی کا دائرہ کتنا تنگ تھا۔ نہ تو ہابز، لاک، مانٹیسکیو، روسو، کانٹ، ناہی وان ہمبولٹ، نمائندہ یا پارلیمان کے زیرِ اثر نظام کا کلی جائزہ لینے کیلئے وقت نکالا، زیادہ تر اس وجہ سے کہ اُنہوں نے کبھی ایسے نظام کو چلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔''

جہاں بادشاہ کمزور مذہبی جواز بخشی اقتدار کے حامل تھے، یا اُن کا فوج پر اختیار محدود تھا، وہاں اُنہیں معاشی اشرافیہ کے ساتھ بہت کچھ احسان کے بدلے میں ترک کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر، الفانسو نے، اپنی کمزور جواز والی حکومت کو مستحکم کرنے کیلئے کورٹیز کو دی جانے والی پُکار میں، اُس نے ڈھیر سارے وعدے پیش کر دیئے: اُس نے غیر جانبدارانہ انصاف کی پیشکش کی، اپنی من مرضی کے مطابق عمل کرنے سے باز رہنے کی پیشکش کی اور افراد اور جائیداد کے تحفظ کی ضمانت دی۔ 23 حکمران اکثر اقتدار میں آنے کے فوری بعد پارلیمانوں کے اجلاس بُلاتے تھے، تاکہ وہ اپنے اقتدار کو جواز بخش سکیں اور مستحکم کر سکیں، وین زینڈن اے آل (Van Zanden et al (2012) حساب لگاتے ہیں، مثلاً کہ 1307 اور 1508 کے درمیان انگلستان کی پارلیمان کے اجلاس، بادشاہ کے عہد کے چند سالوں میں اوسطاً اُس سے کہیں زیادہ ہوئے، جتنے اُس کے عہد کے آخری دور میں ہوئے۔

پارلیمان کے ذریعے توسیع اقتدار واضح طور پر مذہبی جواز بخشی کا نعم البدل تھا۔ جہاں ایک زیادہ مہنگا یا کم موثر ہوتا، تو دوسرے کو استعمال کرنا زیادہ فائدہ مند ہوتا۔ جب ایک مرتبہ کوئی حکمران تحریک اصلاح کلیسا کو قبول کر لیتا، تو پھر وہ اپنے اقتدار کو توسیع دینے کے لیے پارلیمان کی طرف رجوع کرنے کیلئے زیادہ مضبوط جذبۂ محرکہ تھا، بہ نسبت کیتھولک حکمرانوں کے اور مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں سے یقیناً زیادہ، جن کے ہاں مقابلہ کرنے کیلئے یورپی پارلیمان جیسے کوئی ادارے ہی نہ تھے۔ مذہبی جواز بخشی کمزور ہونے کے ساتھ، پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو اشرافیہ کو اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب دینے کیلئے، اُنہیں زیادہ

حقوق ومراعات دینا پڑتی تھیں۔

ایک دیئے ہوئے مقام اور وقت پر پارلیمان کی اہمیت اس بات سے منسلک ہے کہ اُس کے اجلاس کتنے کثرت سے بُلائے جاتے ہیں۔ رواج کے مطابق، حکمران کی طرف سے اس کا اجلاس صرف اس وقت، منعقد ہوتا تھا، جب بادشاہ اسے بلاتا تھا، جو اسے اپنی مرضی سے برخاست بھی کرسکتا تھا۔ اسی دوران میں، پارلیمان کے ارکان کے پاس بادشاہ کے مقابلے میں اجتماعی طاقت صرف اس وقت ہوتی تھی، جب وہ اجلاس میں ہوں، لہٰذا بادشاہ صرف اُس وقت پارلیمان کا اجلاس بلاتے تھے جب وہ اپنی مالی ضروریات پوری نہ کرسکتے تھے۔ لہٰذا پارلیمانی اجلاسوں کی تعداد میں اضافہ عموماً، دومختلف، باہمی طور پر ہم آہنگ واقعات کا نتیجہ ہوتا تھا: اضافہ شدہ شاہی اخراجات، یا کم محصولات۔ بادشاہ کیلئے ایک مثالی دُنیا وہ ہوتی تھی، جس میں وہ اپنے شاہی اخراجات کو محاصل کے اُس دھارے سے پورا کرسکے، جسے پارلیمان میں سے ہوکر نہ آنا پڑے، کیونکہ پارلیمان سے فنڈ حاصل کرنے کا مطلب، اس کے بدلے میں کچھ حقوق سے دستبردار ہونا ہوتا تھا۔

تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد پارلیمانوں کا استعمال پروٹسٹنٹ علاقوں میں کیتھولک علاقوں کی نسبت زیادہ ہوتا تھا۔ شکل 6.6 اس نکتے کی تصدیق کرتی ہے، یہ کہ اُن اجلاسوں کی اوسط تعداد اُن علاقوں میں کیا تھی جنہوں نے 1600 کے بعد پروٹسٹنزم کو قبول کرلیا تھا، اور اُن علاقوں میں کیا تھی، جنہوں نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔ پروٹسٹنٹ خطوں میں شامل ہیں، انگلستان، سکاٹ لینڈ، دانیدرلینڈز، مقدس رومی سلطنت کے مختلف حصے اور سیکنڈے نیوین ممالک، کیتھولک خطوں میں شامل ہیں، سپین، پُرتگال، آئرلینڈ، اطالوی ریاستیں، فرانس، بلجیم، پولینڈ، بوہیریا، (25) اور آسٹریا۔ تحریکِ اصلاح کلیسا سے پہلے (بارھویں صدی سے پندرھویں صدی تک) پارلیمانوں کا اجلاس اُن علاقوں میں زیادہ مرتبہ بلایا جاتا تھا جو کیتھولک رہ گئے تھے۔ معاشی طور پر ترقی یافتہ سپین اور اطالوی علاقوں نے، اس عرصے میں سب سے زیادہ پارلیمانی اجلاس بلائے۔ سولھویں صدی میں تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے آغاز کے بعد ہی ہوا کہ پروٹسٹنٹ حکمرانوں نے پارلیمانی اجلاس زیادہ تعداد میں بلائے۔ 26 اگرچہ یہ رُجحان جزوی طور پر اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ سولھویں صدی میں حکمران تحریک اصلاح کلیسا سے نمٹنے کے لیے



پارلیمان کے اجلاس بُلاتے تھے۔ لیکن بعد کی صدیوں میں بھی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ خطوں کے درمیان فرق اور بھی زیادہ تھا۔ انگلستان کی اور ڈچ پارلیمانوں کے علاوہ.....جن پر باب 7 میں تفصیلی بحث کی گئی ہے.....سویڈش رِک ڈاگ (Rick Dag) کا پہلا اجلاس 1527 میں منعقد ہوا، تحریکِ اصلاح کلیسا کو قائم کرنے کیلئے اور 1527 کے بعد یہ ہر تین سال بعد منعقد ہوتا تھا جو کہ باقی ماندہ براعظم کے مقابلے میں بہت بلند شرح ہے۔ سُوسِ پارلیمان کے اجلاس بھی پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں کثرت سے ہوتے تھے اور اس کی شرح یورپ میں سب سے بلند تھی۔ (27)

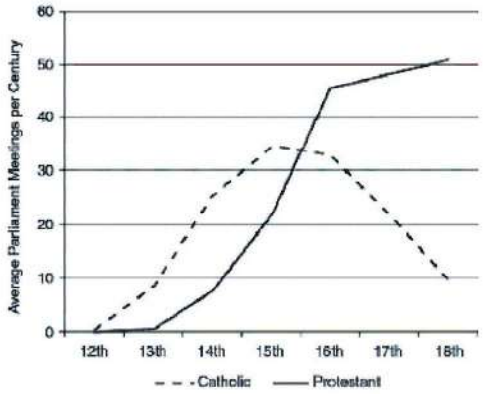


**شکل 6.6**: پروٹسٹنٹ اور کیتھولک علاقوں میں، فی صدی اوسط پارلیمانی اجلاس

**ذرائع**: اعداد وشمار راز وین زینڈن، بُورنگ اور بوسکر (2010)

شکل 6.6 صرف ایک محرکات شہادت مہیا کرتا ہے۔ تحریک اصلاح کلیسا کے بعد پروٹسٹنٹ پارلیمانوں کے حکمرانی کی توسیع دینے کی طرف ایک واضح تبدیلی آئی۔ یہ چیز کیتھولک ممالک میں واقع نہ ہوئی؛ اگر کچھ ہوا بھی تو یہ کہ سترھویں اور اُٹھارویں صدیوں میں پارلیمان کم اہم ہوگئیں۔ یہ چیز فرانس میں سب سے زیادہ واضح تھی، جہاں کیتھولک بودین بادشاہوں لوئی تیرہ، (عہد 1610-1643)، لوئی چودہ (عہد 1643-1715) اور لوئی پندرہ (عہد 1715-1774) کے ہاں اُن کی پارلیمانوں کے دائرہ سے باہر محصولات کے ذرائع تھے

جیسا کہ تاج (کسانوں پر لگایا جائے والا زمینی ٹیکس) اور بصورت دیگر انتہائی جائز تھے۔ اس کے نتیجے میں وہ اسٹیشن جنرل (فرانس کی ریاستوں کی جنرل اسمبلی) کا اجلاس بلانے سے 175 سال (1614-1789) تک اجتناب کرنے کے قابل ہو گئے۔

لیکن کیا اس ادارہ جاتی تبدیلی کے کوئی معاشی نتائج تھے؟ اگر نہیں تو پھر پروٹسٹنٹ ممالک میں پارلیمانوں کا ظہور، ایک دلچسپ تاریخی حاشیے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کتاب کا باقی ماندہ حصہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ پارلیمانوں کی طرف اس تبدیلی کا اُن پالیسیوں پر بنیادی اثر تھا، جو پروٹسٹنٹ حکمرانوں نے اپنائیں یہ پالیسیاں معاشی ترقی سے اُن پالیسیوں کی نسبت زیادہ ہم آہنگ تھیں، جو اس سے پہلے بنائی گئیں یا جو کیتھولک یا مسلمان خطوں میں بنائی گئیں۔

توسیع اقتدار کے اُن انتظامات کا جو سلطنتِ عثمانیہ میں جاری رہے اُن انتظامات سے تقابل جو پروٹسٹنٹ ممالک میں اپنائے گئے، مذہبی جواز بخشی اقتدار سے پروٹسٹنٹ تبدیلی کے اثر کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ اسی تقابل میں ہی اس کتاب کے وسیع تر دلائل تشکیل پانا شروع کرتے ہیں۔ مغربی یورپ میں تحریکِ اصلاح کلیسا بڑی حد تک چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ کی وجہ سے ممکن ہوئی جس کی غیر موجودگی نے سلطنتِ عثمانیہ میں اس قسم کے کسی واقعے کے امکان کو کم کر دیا۔ مغربی یورپ میں چھپائی کا پھیلاؤ ہونا اور سلطنتِ عثمانیہ میں نہ ہونا، بذات خود، مغربی یورپ میں مذہبی جواز بخشی اقتدار کی تھوڑی بہت کمزور موئثر پن کا نتیجہ تھی۔ یہ ممکن ہے کہ اُن اختلافات کا مزید پیچھے کی طرف کھوج لگاتے ہوئے اسلام اور عیسائیت کی تشکیل تک پہنچایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں، ابتدائی اسلام اور عیسائیت میں جواز بخشی اقتدار کے انتظامات کے حتمی معاشی نتائج پر طویل مدتی ''راستے پر منحصر'' اثرات تھے۔ دلیل کی ہر کڑی علیحدہ سے ایک مفہوم رکھتی ہے، لیکن پہلی کڑی اور آخری کڑی میں تعلق بہت کم واضح ہے۔



## خلاصہ: مختلف ادارہ جاتی راستوں کی توضیح

مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ، خاص طور پر پروٹسٹنٹ یورپ اتنی مختلف ادارہ جاتی تواریخ میں سے کیوں گزرے؟ جزوی طور پر اس کے جواب کا تعلق یورپ میں چھاپہ خانہ کے وجود سے ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ اہم یہ بات تھی کہ طباعت کے پھیلاؤ۔ یا عدم پھیلاؤ...... نے کس طرح سیاسی اور مذہبی حکام کے درمیان تعلقات کو تقویت بخشی یا اُن کو ختم کیا۔

مغربی یورپ میں چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ سے پہلے، ہس کی اور لولارڈ تحریکات اُٹھیں لیکن زیادہ دور تک نہ پھیلیں۔ یہ چھاپہ خانہ کے وسیع پیمانے پر پھیلاؤ کے بعد ہی تھا، کہ لوتھر کی طرف سے شروع کی گئی مہم کامیاب ہو سکی۔ سلطنتِ عثمانیہ میں چھاپہ خانہ کی عدم موجودگی کا مطلب تھا کہ اگرچہ ایسے اقتدار مخالف اختیارات وجود تو رکھتے تھے۔ لیکن اُن کے پھیلنے کا امکان نہیں تھا۔ (28) اس کا مطلب ہے کہ عثمانی ادارے خود کو تقویت دینے والے تھے۔ (دیکھئے شکل 6.7)۔ مذہبی حکام کی طرف سے عطا کیا جانے والے نسبتاً کم مہنگے جواز اقتدار کے بلند درجے نے عربی رسم الخط میں طباعت کے پھیلاؤ کی حوصلہ شکنی کی اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چھاپہ خانہ کی عدم موجودگی ہی وہ چیز تھی، جس نے مذہبی جواز بخشی اقتدار کے متبادلات کو نہیں اُبھرنے دیا اور صورتِ حال سادہ طور پر یہ نہیں تھی کہ عثمانی مذہبی حاکمیت کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں تھی...... صوفیانہ اور درویش عثمانیہ مخالف نظام سلطنتِ عثمانیہ کے عروج کے وقت بھی کثرت سے موجود تھے۔ خاص طور پر صوبوں کے قبائل میں۔ عثمانیوں نے ان تحاریک میں سے مشہور ترین تحریک کو کچل دیا، قزلباش تحریک کو، سولھویں صدی کے وسط میں ......اتفاق سے، ٹھیک تحریک اصلاحِ کلیسا کے وقت کے لگ بھگ (29) جیسا کہ تحریک اصلاحِ کلیسا سے قبل کے یورپ کے حکمرانوں کے ساتھ معاملہ تھا۔ عثمان بھی کسی مذہبی بغاوت کو پھیلنے سے، اس کے کنٹرول سے باہر ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کر سکتے تھے۔ اگرچہ یہ جاننا مشکل ہے کہ آیا یہ صوفیانہ تحریکیں زیادہ کامیاب

www.MashalBooks.org

ہوتیں، اگر ان کی رسائی چھاپہ خانہ تک ہوتی، لیکن یورپی تجربہ اس کے امکان کی طرف اشارہ کرتا ہے بہرحال، جان ہیں، جان وِکلف، اور ژاں گرسن، اور دوسرے تحریک سے پہلے کے اصلاح کاروں کے ہاں چھاپہ خانہ کی کمی تھی.....اور اُنہیں ایسے ہی انجام کا سامنا کرنا پڑا۔

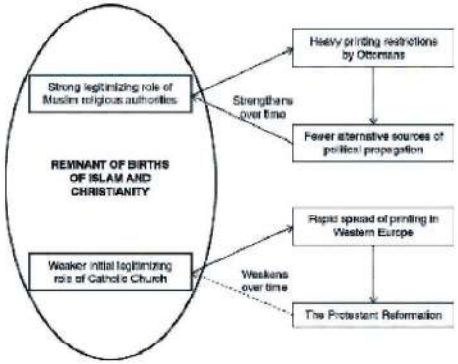


**شکل 6.7:** خودکوتقویت بخشنے والے ادارے اور ایک ''اسلامی تحریکِ اصلاحِ کلیسا'' کی عدم موجودگی۔



# سلطنتِ عثمانیہ میں (انجامِ کار) طباعت کا اُبھار

ہمارے 2012 کے مضامین میں (30) مِٹن کوسگل (Metin Cosgel) تھامس میبلی (Thomas Miceli) اور میں نے ایک آخری معمے پر بحث کی: اگر عثمانی سلطان کیلئے جواز بخشی اس قدر اہم تھی تو، عثمانیوں نے آخر کار عربی رسم الخط میں طباعت پر پابندی کو کیوں نرم کیا؟ یقیناً، عثمانیوں کو عربی رسم الخط میں چھاپہ خانہ کی اجازت دینے میں 242 سال لگے، لیکن صرف وقت ہی توضیح نہیں ہے۔ اگر پہلی مرتبہ سلطان کو پابندی وضع کرنے پر، مذہبی جواز بخشی اقتدار کے کھو جانے کے خوف نے آمادہ کیا ہوتا، تو پھر چھاپہ خانے کی ابتدائی پابندی اور آخر کار قبولیت کے درمیان کے عرصے میں کوئی نہ کوئی چیز ضرور تبدیل ہوئی ہوگی .....مطبوعہ مواد کی طلب میں زیادتی ہوئی ہوگی۔ اُس طریقے میں تبدیلی ہوئی ہوگی۔ جس میں عثمانی اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے تھے۔ یا دونوں چیزیں اکٹھی ہوئی ہوں گی۔

یہ ممکن ہے کہ پندرھویں اور اٹھارویں صدیوں کے دوران مطبوعہ مواد کی طلب بڑھ گئی ہو۔ تاہم، اٹھارویں صدی کے آغاز میں سلطنتِ عثمانیہ میں خواندگی کی شرح 2 سے تین فیصدی تھی اور حقیقی معاوضہ جات اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، پندرھویں صدی کے نصف آخر کے معاوضہ جات کی نسبت کم تر تھے۔ (31) تاہم یہ بات ناممکن ہے کہ اٹھارویں صدی میں طلب کے حالات اس قدر مختلف تھے کہ وہ، بادشاہ کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں کی موجودگی میں طباعت کی صنعت کی تشکیل کو تحرّک دیتے۔ وہ دائرۃ الخیر جس نے مغرب یورپ میں خواندگی کو آگے بڑھایا.....طباعت نے کتابوں کی قیمت کم کی۔ جس نے کتابوں تک رسائی بڑھائی۔ جس نے خواندگی کو بڑھایا۔ جس نے کتابوں کی طلب کو بڑھایا، جس نے اس کے ردِّعمل کو تیز کیا اور علیٰ ہذا القیاس.....اُنیسویں صدی سے پہلے سلطنت عثمانیہ میں کبھی واقع نہ ہوا۔

کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اُنیسویں صدی میں مطبوعہ مواد کیلئے کوئی طلب نہ تھی بلکہ صرف

یہ ہے کہ یہ ماضی کی صدیوں کی طلب کی نسبت کوئی بہت زیادہ نہیں تھی۔ درحقیقت، اٹھارویں صدی میں طباعت کی صنعت نے اتنی اچھی کارکردگی دکھائی۔ جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ سلطان کی طرف سے پابندیوں کی عدم موجودگی میں، سلطنتِ عثمانیہ میں بڑے پیمانے پر طباعت کی مارکیٹ کا قیام ممکن تھا۔ عثمانیوں نے آخرکار 1802 میں اسلامی موضوعات پر طباعت پر سے پابندی اُٹھالی، اور طباعت کاروں نے سنگی چھاپہ خانہ کو، جرمنی میں اس کی ایجاد کے فوری بعد اپنالیا۔ 1831 میں، پبلشر تکویم ہانی امیر (Takvimhane-i-Amire) نے سلطنت عثمانیہ کا پہلا سرکاری اخبار طبع کیا۔ آنے والی دہائی میں چھ نئے چھاپے خانے نمودار ہوئے، جنہوں نے 278 کتابیں شائع کیں۔ پبلشروں نے 1840 کی دہائی میں تیرہ نئے چھاپہ خانوں کا آغاز کیا، جنہوں نے کل 394 کتابیں شائع کیں۔ (32) یہ صنعت اُنیسویں صدی کے وسط تک خوب منظّم ہوگئی، اور ریاست نے فعال طور پر اسکول کی کتب، سرکاری اخبار، اور انتظامی مطبوعات کی حمایت کی۔

ایسے چھاپہ خانوں کا پھیلاؤ، جو عربی رسم الخط میں طباعت کی صلاحیت رکھتے تھے، دو متوازی پیشرفتوں کے ساتھ مربوط تھا۔ ان میں سے پہلی، سترھویں صدی میں مذہبی حاکمیت کی اندرونی تنظیم میں تبدیلی تھی۔ پوری صدی کے عرصے یں، روز افزوں یہ صورتِ حال بنتی گئی کہ، مذہبی عالم کے استحاق اور تجربے کی بجائے، اُس کے تعلقات اور دولت یہ تعین کرنے لگے کہ آیا وہ مذہبی سلسلۂ مراتب کے اندر ترقی حاصل کرے گا۔ اس چیز نے نمایاں خاندانوں کیلئے یہ گنجائش پیدا کردی کہ کئی کئی نسلوں تک اعلیٰ ترین مراتب پر حاوی رہتے۔ ادارہ جاتی رعایت ہی اصول بن گیا تھا: سترھویں صدی میں بیالیس مفتیان اعظم میں سے بارہ، صرف پانچ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں یہ تناسب بڑھ گیا، اس طرح کہ 1708 اور 1839 کے درمیان تعینات ہونے والے اٹھاون مفتیانِ اعظم میں سے نصف کا تعلق گیارہ خاندانوں سے تھا۔ (33) یہ چیز مفتی سلسلۂ مراتب اور نچلے درجے کے درمیان ترغیبات کے ایک ٹیڑھ پر منتج ہوئی۔ موخرالذکر، جو کہ مذہبی حاکمیت اور لوگوں کے درمیان ایک بنیادی واسطہ تھے۔ کیلئے حکمران کی کھلے بندوں حمایت کرنے کیلئے کوئی ترغیب نہ تھی، کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کا مراتب میں بلند ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس سلسلہ مراتب کے کم درجے والے ارکان میں بڑھتی ہوئی



ناراضگی نے مذہبی اشرافیہ کی سلطان کو اقتدار کی جواز بخشی کی صلاحیت کو مجموعی طور پر نقصان پہنچایا۔ اس چیز نے سلطان کے فیصلہ کرنے کے حساب کتاب کو اس بارے میں کہ وہ اپنی حکمرانی کی توسیع بہترین طریقے سے کس طرح کرے، تبدیل کردیا۔ مذہبی جواز بخشی اقتدار کے موثرین کے کمزور ہونے کے ساتھ، توسیع اقتدار کے دوسرے کارندے، توسیعِ اقتدار کے نسبتاً زیادہ پُرکشش ذرائع بن گئے۔

مذہبی حاکمیت کی کمزوری نے متبادل کارندوں کے، حکمرانی میں اپنے کردار کو بڑھانے کی گنجائش پیدا کردی۔ سولھویں صدی سے قبل..... جو کہ سلطنتِ عثمانیہ کے پھیلاؤ کا ایک دور تھا..... سب سے واضح متبادل عسکری اشرافیہ تھی۔ سلطان ٹیمار سسٹم کے تحت، نومفتوح اراضی میں سپاہیوں کو ٹیکس جمع کرنے کے علاقے دے کر فوج کو کنترول کرسکتا تھا۔ ٹیمار سسٹم ایک ایسا سسٹم تھا، جس میں فوجی اشرافیہ ٹیکس جمع کرنے اور سلطان کی حمایت کرنے کے عوض دولت اور طاقت حاصل کرتی تھی۔ لیکن جب ایک مرتبہ سلطنتِ عثمانیہ نے سولھویں صدی کے اواخر میں ٹھیکے دینا شروع کئے تو فوجی اشرافیہ اب کوئی اچھا متبادل نہ رہا، کیونکہ اب اُن کی وفاداری حاصل کرنا روز بروز مہنگا ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بجائے، مذہبی حاکمیت کی جگہ لینے کیلئے بہترین پوزیشن میں جو گروپ تھا، وہ مشاہیر (اعیان) کا تھا..... وہ مقامی اشرافیہ، جو نمایاں قبائلی زعما تھے، جو زمین اور وسائل کے مالک تھے، کسی معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے، یا سماجی معاشی اور سیاسی طاقت کے دوسرے وسائل رکھتے تھے۔ اکثر اوقات وہ ہی چری (تُرکی۔ بمعنی نئی فوج) (فوجی اشرافیہ) کے چشم و چراغ ہوتے تھے جو صوبوں میں تعینات ہوتے تھے، اور اُن کا مرتبہ اور دولت اُن کی وراثت کی وجہ سے ہوتا تھا، اور ساتھ ساتھ اُن کی نظم و ضبط قائم کرنے کی صلاحیت سے (34) سترھویں صدی سے قبل عثمانی، ٹیمار سسٹم کے ذریعے صوبائی فوج کو کنٹرول کرکے، مشاہیر کی طاقت کو محدود کرسکتے تھے۔ جب مشاہیر کو کنٹرول کرنے کا یہ انتخاب قابلِ عمل نہ رہا، تو عثمانیوں نے اس کی بجائے ان مشاہیر سے براہِ راست سودا بازی شروع کردی، کہ وہ ریاست کے مقامی آبادی کے ساتھ تعلق کو کنٹرول کریں، ٹیکس اکٹھا کریں، فوجی دستوں کو متحرک کریں، مقامی مفادات کی نمائندگی کریں، عوامی نظم وضبط قائم کریں، اور دیوانی تنازعات کو حل کریں (35) باب 8 اعیان کے ذریعے توسیع اقتدار کی طرف اس تبدیلی کے معاشی نتائج پر مزید بحث کرتا ہے۔

سلطان کے چھاپہ خانہ کی اجازت دینے کے فیصلے کے حوالے سے، مذہبی حاکمیت کی قیمت پر اعیان کے عروج کا مطلب یہ تھا کہ عربی رسم الخط میں طباعت کی اجازت دینے کے اخراجات اور منافع جات میں ایک بنیادی تبدیلی آئی تھی۔ (36) اگرچہ اعیان لازمی طور پر چھاپہ خانے کے فیض پایوں میں سے نہیں تھے، لیکن بہرحال اس نے اُنہیں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا۔ اعیان کی سلطان کے اقتدار کو توسیع دینے کی صلاحیت عوام کو بہبود اور نمائندگی مہیا کرنے کی صلاحیت پر منحصر تھی، نہ کہ علم کی ترسیل پر اُن کی اجاری داری پر، لہٰذا مذہبی حاکمیت کی توسیع اقتدار سے اعیان کی توسیع اقتدار کی طرف تبدیلی کا مطلب تھا کہ بڑے پیمانے پر طباعت سلطان کیلئے خطرہ نہیں رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں، اگرچہ چھاپہ خانے کی اجازت دینے کے فوائد پندھرویں اور اٹھارویں صدیوں کے درمیان زیادہ تبدیل نہ ہوئے، لیکن پابندیوں کو ہٹانے کے نقصانات.....یعنی مذہبی جواز بخشی کے نقصان.....خاصی حد تک کم ہو گئے۔ سلطان کے اقدامات یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ، عربی رسم الخط میں چھپائی کرنے والے چھاپہ خانوں کی اجازت دینے کے فوائد، اُس کے نقصانات سے بڑھ گئے، اور عثمانیوں نے نتیجتہً چھاپہ خانے پر پابندیاں اُٹھالیں۔

یہ تاریخ، عثمانی ادارہ جاتی خلافِ حقائق تاریخ پر ایک مختصر سے تجزیئے پیدا کرتی ہے۔ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں عثمانی مذہبی اشرافیہ اور باقیماندہ مذہبی انتظام کے درمیان اختلافات، تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے وقت کلیسا کے اندر تفرقے سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس بات کیلئے دلائل کی ضرورت ہے کہ آیا چھاپہ خانے عثمانی مذہبی سلسلہ مراتب کے اوپر کے درجات کے خلاف تحاریک کی سہولت کاری کر سکتے تھے۔ اگرچہ ہم حقائق کے خلاف صورتِ حال کو کبھی نہیں جان سکتے۔ کہ اگر عثمانیوں نے کبھی چھاپہ خانہ پر پابندی نہ لگائی ہوتی تو کیا واقع ہوتا..... تاہم پھر بھی یہ تجزیہ چشم کُشا ہے کہ اُنیسویں صدی کے وسط میں عثمانیہ چھاپہ خانے کی صنعت کی انتظامیہ کے ساتھ کیا واقع ہوا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عین ایک ایسی چیز تھی، جس کی مذہبی حکام کے خلاف بڑھتی ہوئی مخالفت کو اُکسانے کیلئے ضرورت تھی، ایک ایسے انداز سے جو پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا کے مشابہہ تھی؟

درحقیقت، اُنیسویں صدی میں اسلامی دُنیا میں چھاپہ خانے کے پھیلاؤ کے جلد ہی بعد،



جدّت پسند مفکرین نے ''اسلام کی اصلاح'' کیلئے پہلی حقیقی پُکار پیش کی۔ ''اسلام کی اصلاحات'' نے مذہب کے بنیادی اصولوں کو اپنا ہدف نہ بنایا، بلکہ اس کی بجائے مذہبی پیشوائیت کے مذہب پر کنٹرول کی اصلاح کو اپنا ہدف بنایا۔ بہت سی صورتوں میں، اصلاح کی تحریکیں تحریک اصلاح کلیسا سے مشابہت رکھتی تھیں۔ درحقیقت سلطنتِ عثمانیہ، ایران، مصر، روس اور اُس سے آگے سے سُنی اور شیعہ مسلمان مفکرین نے واضح طور پر لوتھر کی طرف بطور ایک آزادکنندہ طاقت کے رجوع کیا۔ مثال کے طور پر، ایک معروف ہندوستانی مصلح اور شاعر محمد اقبال (1877-1938) نے اس طرف اشارہ کیا کہ ''آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جو یورپ میں پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا سے مشابہہ ہے، اور وہ سبق جو لوتھر کی تحریک کے اُبھارا اور اُس کا نتیجہ ہمیں سکھاتا ہے، ہمارے ہاتھوں سے ضائع نہیں جانا چاہیے۔'' (37)

ایک ''اسلامی تحریکِ اصلاحِ مذہب'' اُنیسویں صدی کے اواخر میں کیوں واقع ہوئی، بجائے چند صدیاں پہلے کے؟ آنے والے مصلحین کی بہت سی شکایات کا اطلاق عثمانی مذہبی اشرافیہ پر ہوتا تھا جو کم از کم دو صدیوں سے جاری تھیں، ان واقعات کے وقت کی کوئی ایک سادہ توجیہہ نہیں ہے، اور مختلف، باہمی طور پر ہم آہنگ اسباب ایسے تھے کہ اواخر اُنیسویں صدی نے ''اسلام کی تحریکِ اصلاحِ مذہب'' کی طرف بڑے پیمانے پر ایک دھکے کا مشاہدہ کیا۔ ایک چیز یہ ہے کہ اُنیسویں اور ابتدائی بیسویں صدیوں میں سیکولر تعلیم کے پھیلاؤ نے، مذہبی اشرافیہ سے باہر، افراد کی ایک بڑی بنیاد مہیا کی، جن کے پاس وہ انسانی سرمایہ موجود تھا جو سیاسی اقتدار کی جائزیت کو چیلنج کر سکتا تھا۔ پوری سلطنتِ عثمانیہ کے بہت سے حصے میں سلیم سوم (عہد 1789-1807) کے تحت تعلیمی اصلاحات شروع ہوئیں اور پوری اُنیسویں صدی کے دوران جاری رہیں۔ (38) اس دور سے پہلے تعلیم کلی طور پر صرف مذہبی اور سیاسی اشرافیہ کو مہیا تھی۔ آبادی کے ایک بڑے حصے میں تعلیم کے پھیلاؤ نے تعلیم پر مذہبی حکام کی اجارہ داری کو توڑ دیا، خاص طور پر استنبول اور قاہرہ جیسے بڑے شہروں میں۔ پہلے عثمانی، عسکری اور نوکر شاہی کے اسکول اُنیسویں صدی کے آغاز میں کھل گئے، اور سیکنڈری اسکول اور غیر ملکی زبانوں کے اسکول اس کے چند دہائیوں بعد شروع ہوئے۔ (39) فیلسیٹاس آپوس (Felicitas Opw) (2004 صفحہ 30) کے الفاظ میں ''ایک ایسے فکری ماحول [کو جنم دیا] جس نے روایتی مذہبی

قانون اور ان کے پیش کنندگان کو بڑی حد تک ترقی کے راستے میں رُکاوٹوں سے جدیدیت کے مخالف تصور کیا، فردافروزی کے خیالات، دلیل، اور عقلی سائنسوں کو بہت اونچا مقام دیا گیا، جبکہ روایتی سند کے ساتھ لگاؤ کو جو دلیل کی آزمائش کا مقابلہ نہ کر سکے، ایک متروک چیز کے طور پر مسترد کر دیا گیا۔ یہ صورت حال تحریکِ اصلاح کلیسا کے وقت مغربی یورپ کی صورت حال سے بہت زیادہ مختلف نہ تھی، جہاں زیادہ تر علما یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے، اور انسان دوستی کے خیالات ایک نئے فکری ماحول میں نفوذ کئے ہوئے تھے۔

ایک دوسری توجیہہ یہ ہے کہ اسلامی دُنیا اُنیسویں صدی کے اختتام تک معاشی طور پر واضح طور پر پیچھے رہ گئی تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے اندر، غیر ملکیوں اور غیر مسلموں نے متعدد مارکیٹوں پر اجارہ داری قائم کر لی تھی، اور اُن تجارتی شرائط نے، جو سلطنتِ عثمانیہ کی طرف سے غیر ملکی تاجروں کو دیں مسلم تجارت کو مزید نقصان پہنچایا۔ (40) اس کی وجہ سے، اسلامی دُنیا کا نسبتاً زوال، اصلاح کی پکاروں میں ایک عام موضوع تھا۔ مثال کے طور پر مشہور ایرانی مصلح سید جمال الدین افغانی (1839-1897) نے لوتھر کی اصلاح کی طرز پر اصلاح کی دعوت دی، تاکہ اسلامی معاشرے ''کسی نہ کسی دن اپنے رشتوں کو توڑنے اور مغربی معاشرے کی طرز پر پُرعزم طریقے سے تہذیب کے راستے پر قدم اُٹھانے میں کامیاب ہوسکیں'' (41) دوسرے مصلحین نے اسلامی دُنیا کے مقابلۃً زوال کو اوائل اسلام کی بنیادوں کی طرف واپسی کی وجہ کے طور پر دیکھا، اُسی طریقے پر جو اکیسویں صدی کے طالبان کی طرح کے بعض گروپوں کی طرف سے دی جانے والی مانگوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ (42)

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، مطبوعہ مواد کے پھیلاؤ نے اُنیسویں صدی کی اسلامی اصلاح کی تحریکوں میں مدد دی۔ 1860 کی دہائی تک اسلامی دُنیا میں طبع ہونے والی زیادہ تر کتب سیکولر تھیں، اور وہ جو مذہبی تھیں، زیادہ تر کلاسیکی متون کے نقشِ ثانی تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مذہبی معلومات اور خیالات کے بہاؤ پر مذہبی حاکمیت کی ہی اجارہ داری رہی، جن کیلئے اس اجارہ داری کو قائم رکھنے کے لیے ایک جذبۂ محرکہ تھا، تاکہ وہ اپنے اثر کے بنیادی ذریعے پر گرفت قائم رکھ سکیں۔ یہ صورت حال اُنیسویں صدی کے وسط میں تبدیل ہوگئی۔ عثمانی حکومت نے 1865 میں پہلا مستقل چھاپہ خانہ قائم کیا، اور مصر میں اخباری مارکیٹ نے اسماعیل کے عہد میں



بہت تیز ترقی کی (عہد 1863-1879)۔ (43) اس کا مذہبی علما کے ہاتھ سے مذہبی خیال کو نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لینے کا اہم اثر تھا، اسلامی دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ، مذہبی اشرافیہ فکری اور مذہبی خیال کی کلیۃً پیدا کار، تشریح کار اور ترسیل کار نہیں تھی۔ چھاپہ خانے نے قانونی، سیاسی، اور مذہبی علم کو ہر پڑھے لکھے شخص کی طرف سے تشریح کیلئے کھول دیا۔ اس نکتے کو فرانسس روبنسن (Francis Robinson) (1993، صفحہ 245) کی طرف سے واضح کیا گیا ہے:۔

''[چھاپہ خانے نے] [مذہبی علما] کی حاکمیت کی جڑوں کو شدید نقصان پہنچایا.....اب وہ، کتاب پڑھے جانے کے وقت متن میں مصنف کی عدم موجودگی میں اُس کی جگہ لینے کیلئے، لازمی طور پر موجود نہیں ہوتے تھے.....علم کی ترسیل پر اُن کی اجارہ داری کو توڑ دیا گیا تھا.....اب کتب سے کسی بھی احمد، محمود یا محمد کی طرف سے استفادہ کیا جا سکتا تھا، جو اس سے اپنی مرضی کے مطابق مفہوم لے سکتے تھے۔''

ان تین پہلوؤں .....تعلیم کے پھیلاؤ، اسلامی دُنیا کے مقابلۃً معاشی جمود، اور چھاپہ خانہ کے پھیلاؤ..... نے ایک ایسا ماحول قائم کرنے میں مدد دی، جس میں اسلامی اصلاح کیلئے پکاریں عام ہوگئیں (44) اس بات کا امکان نہیں ہے کہ ایسی پُکاروں کا کسی سابقہ دور میں کوئی اثر ہوتا۔ خواہ مسلمان ایسی اصلاح کے خواہشمند ہی کیوں نہ ہوتے۔ اُن لوگوں کے کام جنہوں نے اس سے قبل کے ادوار میں اصلاح کی پُکار دیں، پہلی نگاہ میں اس کی شہادت ہیں۔ مثال کے طور پر، مشہور اسلامی عالم تقی الدین احمد ابن تیمیہ (1263-1328) نے اصلاح کیلئے وسیع پیمانے پر آواز اُٹھائی، اگرچہ، ستم ظریفانہ طور پر، آج کل کے قدامت پسند اسلام کے علمبردار اُسے ایک قائد خیال کرتے ہیں لیکن بنیادی دھارے کی فکر پر اُس کی پکاروں کا اثر محدود تھا، کیونکہ اُس کے دور میں خیالات کی ترسیل روایتی طریقوں پر منحصر تھی، خاص طور پر مدرسہ کے نظام پر (45)

اگرچہ اسلامی اصلاح کی پکاروں اور پروٹسٹنٹ تحریک اصلاح کلیسا میں کچھ پسِ منظر اور ادارہ جاتی تفاصیل یکساں تھیں، لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ اول الذکر نے وہی راستہ اختیار کیا جو آخر الذکر نے اختیار کیا ایک غلطی ہوگی۔ پروٹسٹنٹوں کی بہت سی شکایات پوپ اور مرکزی کلیسا کے خلاف تھیں، جو پروٹسٹنٹوں کو ایک ٹھوس ہدف مہیا کرتی تھیں کہ وہ کس کے خلاف ناراضگی کی آواز اُٹھائیں۔ اسلامی دُنیا میں یہ صورتِ حال نہیں تھی، اور اس وجہ سے اسلامی اصلاح کی پکاروں میں

پوشیدہ پیغامات کسی ایک ادارے کو مرکز توجہ نہیں بناتے تھے۔ لہٰذا ''اسلامی اصلاح'' کی تحریک اور پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاح کلیسا کے درمیان مشابہت کو بہت دور تک کھینچنا عقلمندی نہیں ہوگی، لیکن بہرحال پھر بھی یہ چیز روشنی بخش ہوگی کہ دونوں کے درمیان موازنہ کیا جائے۔ دونوں تحاریک نے روایتی تحکم (کے خلاف بغاوت کی پُکار دی) اور ایسے اداروں کے خلاف بغاوت کی پکار دی، جو اپنے بنیادی مقصد اور پیغام سے دُور ہٹے ہوئے تھے۔ تحریکِ اصلاح کلیسا کی صورت میں، معافی ناموں کی فروخت اور کلیسائی حقوق واختیارات کی خرید وفروخت جیسے معمولات صرف برفانی تودے کے وہ سرے تھے، جو اس چیز کو نمایاں کرتے تھے کہ دورِ وسطیٰ کے آخری دور کا کلیسا اپنی اصل سے کتنا ہٹا ہوا تھا۔ اسلامی اصلاح کاروں کی مختلف قسم کی شکایات تھیں، اگرچہ اُنہوں نے بھی اسی طرح سے روایتی تحکمات کو مسترد کر دیا تھا۔ ایک اہم مثال آزادانہ استدلال (اجتہاد) کی اُن کی خواہش تھی کہ اُسے وسیع پیمانے پر برتا جائے اگرچہ یقیناً حال ہی میں اجتہاد کے استعمال کی مثالیں موجود تھیں اور ''اجتہاد کا دروازہ''، نظریاتی یا عملی طور پر بند نہیں ہوا تھا، (دیکھئے باب 3) لیکن اصلاح کار یہ یقین رکھتے تھے کہ اجتہاد کی ضد..... پُرانی آرا کی پیروی، اُن بنیادوں کے علم کے بغیر جن سے یہ اخذ کی گئی تھیں (تقلید)..... بحث مباحثے پر غالب عبدہٗ، جمال الدین افغانی، راشد رضا، سید احمد خان، اور محمد اقبال جیسے اصلاح کاروں نے اسلامی دُنیا کے جمود کیلئے تقلید پر الزام دیا، اور یہ دعویٰ کیا کہ اجتہاد کا وسیع تر استعمال، اسلامی قانون کو اُن کے جدید دور کے مسائل کیلئے زیادہ قابل قبول بنا دے گا۔ (46)

دونوں تحریکوں کی عملی نیت مذہب کو جدید بنانے کی تھی، اگرچہ پروٹسٹنٹوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے الہیاتی دلائل ''بنیادی کلیسا'' کی طرف واپسی کی طرف اشارہ کرتے تھے، لیکن عملی طور پر تحریکِ اصلاح کلیسا کے وابستگان تاجر، شہزادے اور وہ طبقہ اُمرا تھا، جو اسے قدامت پرستانہ اور کلیسا کے معاشی طور پر نقصان دہ اداروں سے معاشرے کو نجات دلانے کا ایک موقع خیال کرتے تھے۔ اسی طرح، اسلامی اصلاح کار، جیسا کہ علی شریعتی (1933-1977) یہ استدلال کرتے تھے کہ اسلام ''قرونِ وسطیٰ کے خاتمے پر زندگی گزار رہا ہے'' اور یہ پروٹسٹنٹ کے مماثل راستہ اختیار کرے گا، جنہوں نے ''اپنے قدیم مذہب کو تلف کر کے، اور روایتی کیتھولسزم کو ایک احتجاج میں، دُنیاداری کا ذہن رکھنے والے، سیاسی اور مادیت پسند پروٹسٹنٹزم میں تبدیل



کر کے اپنی نئی منزل تلاش کر لی۔'' اُنہوں نے آگے چل کر مسلمانوں کو ''ایک اسلامی پروٹسٹنٹزم کو [قبول کرنے پر اُبھارا] جو قرونِ وسطیٰ کی عیسائیت میں واقع ہو، جو اُن تمام زوال پذیر عوامل کو تباہ کر دے، جنہوں نے اسلام کے نام پر سوچ کے عمل اور معاشرے کے مقدر کو روک دیا اور اُسے حماقت آمیز بنا دیا، اور جو نئے خیالات اور نئی تحریکوں کو جنم دے۔'' (47)

www.MashalBooks.org

# کیا ہوسکتا تھا؟

جب آپ تاریخ پر غور کر رہے ہوں تو یہ پوچھنا بڑا آسان ہے کہ ''کیا ہوسکتا تھا۔'' کیا واقع ہوسکتا تھا اگر عثمانیوں کی رعایا میں مطبوعہ مواد کو، اُس سے صدیوں پہلے پھیلانے کی صلاحیت ہوتی، جب اُنہوں نے پھیلایا؟ یہ یقیناً ممکن ہے کہ مقامی مشاہیر یا دوسرے اچھی طرح سے مربوط معاشی اشرافیہ نے ایسی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی ہوتی، جو مذہبی اشرافیہ کی جواز بخشی کی طاقت کو کم کرتیں، اگر ایسا ہوتا تو دُنیا آج بہت مختلف جگہ ہوسکتی تھی، اور یہ ممکن ہے کہ ایک عثمانی معاشی نشاۃ ثانیہ واقع ہوتی، بالکل اُسی طرز پر جس طرح ابتدائی جدید انگلستان یا جمہوریہ ڈچ میں یہ واقع ہوئی۔

واقعات کا ایسا سلسلہ کبھی واقع نہ ہوا۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلامی دُنیا کا اسلام کے آغاز سے ہی ایک طویل مدتی معاشی جمود مقدر تھا؟ اس کا جواب ایک غیر مشروط نہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُس راستے کا جو کچھ یورپی ممالک نے اختیار کیا اسلامی دُنیا میں اُبھرنے کا امکان کم تھا، اگر یہ عثمانیوں یا کسی بھی دوسری مسلم ریاست کیلئے ہرگز ناممکن نہیں تھا کہ وہ اسی راستے کو اختیار کرتے۔ علاوہ ازیں، یہ بھی سچ ہے کہ وہ راستہ جو مغربی یورپ نے معاشی ترقی کیلئے اختیار کیا وہ کسی طرح بھی واحد راستہ نہیں ہے۔ تاہم، اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اُس راستے کو نظر انداز کرنا بے فائدہ ہے، جو کامیاب مغربی یورپی معیشتوں نے اختیار کیا، آنے والے دو ابواب اس کام کا بیڑا اُٹھاتے ہیں، یہ دکھاتے ہوئے کہ کس طرح دو پروٹسٹنٹ اقوام .....انگلستان اور ڈچ جمہوریہ..... نے معاشی کامیابی کا راستہ طے کیا، جبکہ ایک کیتھولک قوم (سپین) اور سلطنتِ عثمانیہ پیچھے رہ گئیں۔



www.MashalBooks.org

# (7)

# کامیابی: انگلستان اور جمہوریہ ڈچ

سولھویں صدی کے پہلے نصف میں، مغربی یورپ اُڑان بھرنے کیلئے تیار محسوس ہوتا تھا۔ حال ہی میں نئی دریافت شدہ دُنیا، ناقابلِ بیان دولت کی پیش بینی کر رہی تھی۔ بڑی بڑی مرکزی ریاستیں ایک روز افزوں بڑے محاصلاتی نظام کو کنٹرول کر رہی تھیں، اور اس کی آبادی کا بڑا حصہ گزارے سے اوپر کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ پورے براعظم میں، ہنر اور مزدور اپنے خاندانوں کو، گزارے کیلئے ضروری سطح سے ڈیڑھ یا دوگنا خوراک اور لباس مہیا کر سکتے تھے، یہاں تک کہ غیر ہنرمند مزدور بھی زیادہ تر شہروں میں گزارے کی یا اس سے معمولی سا اوپر کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ تاہم یہ چیز ہمیشہ رہنے والی نہیں تھی۔ اگلی دو یا تین صدیوں میں، براعظم کے زیادہ تر حصے میں معیاراتِ زندگی دھڑام سے نیچے گر گئے۔ اُٹھارویں صدی کے اواخر تک، براعظم کے زیادہ تر حصے میں ہنرمند مزدور بھی بمشکل گزارے کی سطح کی اشیائے فروخت کی استطاعت رکھتے تھے، اور غیر ہنرمند مزدور تقریباً ہر جگہ گزارے سے کم تر سطح کے معاوضے حاصل کر رہے تھے۔

کیا واقع ہوا؟ سب سے زیادہ قابلِ قبول توضیح یہ ہے کہ پندرھرویں اور سولھویں صدیوں میں، چودھویں صدی کی ''کالی موت'' (1) کی تباہ کاریوں کی وجہ سے یورپی معاوضہ جات مصنوعی طور پر بلند تھے۔ نصف صدی کے عرصے میں تقریباً ایک تہائی سے نصف تک پوری آبادی موت کا شکار ہوگئی۔ وہ لوگ جو باقی بچ گئے وہ مزدور منڈی میں ایک اچھی پوزیشن میں تھے۔ کارکُن بہت کم تھے اور محنت کی قدر نتیجتہً بڑھ گئی۔ معاوضہ جات پر یہ اوپر کی طرف کا دباؤ کئی صدیوں تک رہا ؛یورپی آبادی سولھویں صدی کے نصف آخر میں کسی وقت تک اپنے کالی موت کے قبل کی سطح پر



واپس نہ آسکی..... جس نے یورپ کو ''مالتھس کے جال'' سے تقریباً دو صدیوں تک بچنے کی گنجائش پیدا کر دی۔ مالتھس کے جال میں، آبادی میں اضافہ آخر کار ایسے عارضی صدمات سے جیسا کہ آبادیاتی یا ٹیکنالوجیاتی تبدیلی سے معاشی فوائد کو صاف کر دیتا ہے، لوگ کچھ عرصے کیلئے خوشحال ہوجاتے ہیں..... اشیا کی پیداوار اور صرف اور فی کس افراد کی خدمات بڑھ جاتی ہیں..... لیکن کیونکہ وہ خوشحال ہوتے ہیں لہٰذا وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ زیادہ بچے پیدا کر سکتے ہیں۔ آخر کار، یہ زائد مُنہ اُن تمام فوائد کو نگل لیتے ہیں جو ابتدائی صدمے سے حاصل ہوئے تھے، اور لوگ اُس وقت زائد بچے پیدا کرنا بند کر دیتے ہیں جب وہ گزارے کی آمدنی کے قریب ہوتے ہیں۔ (2) یہی کچھ سولھویں صدی کے اواخر کے لگ بھگ، نظر بظاہر، یورپ کے بہت سے حصے میں واقع ہوا۔ یورپ کی آبادیاں، کارکنوں کیلئے کم معاوضہ جات کی قیمت پر، آخر کار اپنی کالی موت سے پہلے کی سطوح پر پہنچ گئیں۔

لیکن سارا قصہ یہی نہیں ہے۔ جب حقیقی معاوضہ جات تقریباً سارے یورپ میں یقیناً کم ہوگئے، تو بھی شمال مغربی یورپ بڑی حد تک اس انجام سے بچنے میں کامیاب رہا۔ لندن اور ایمسٹرڈیم میں، ہنرمند کارکنوں کے بہبود کے تناسبات، سولھویں صدی کے پہلے نصف سے لے کر صنعتکاری کے موقع تک بمشکل ہی تبدیل ہوتے (دیکھئے جدول 7.1) بہبود کے تناسبات دونوں شہروں میں ہنرمند کارکنوں کیلئے صنعتکاری کے پورے واقعے کے دوران 2 کے لگ بھگ رہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک اوسط کارکن گزارے کیلئے ضروری رقم سے دُگنی کے لگ بھگ کی استطاعت رکھتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک مثبت چیز محسوس نہیں ہوگی..... بہرحال یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ حقیقی معاوضہ جات انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں دو صدیوں تک جامد رہے۔ یہ اعداد و شمار باقی ماندہ یورپ سے واضح تفاوت کا اظہار کرتے ہیں جہاں بہبود کے تناسبات بہت تیزی سے گریں۔

**جدول 7.1:** آبادی سے ضرب دے کر ہنرمند مزدوروں کے بہبود تناسبات موجودہ ملک کے حساب سے

| | 1500-1549 | 1700-1749 | تبدیلی | مذہب |
|---|---|---|---|---|
| انگلستان (یوکے) | 2.19 | 2.21 | 0.02 | پروٹسٹنٹ |
| نیدرلینڈز | 2.02 | 2.02 | 0.00 | پروٹسٹنٹ |

www.MashalBooks.org

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| جرمنی | 1.56 | 1.06 | 0.49 | مخلوط |
| آسٹریا | 1.87 | 1.33 | 0.54 | کیتھولک |
| بلجیم | 2.41 | 2.23 | 0.18 | کیتھولک |
| فرانس | 1.44 | 1.26 | 0.18 | کیتھولک |
| اٹلی | 1.82 | 1.38 | 0.43 | کیتھولک |
| پولینڈ | 1.69 | 1.64 | 0.05 | کیتھولک |
| سپین | 1.79 | 1.71 | 0.08 | کیتھولک |

**ذرائع:** بہبودی تناسبات۔ایلین (2001)؛ آبادی..... بوسکرا ے آل۔(2013)

اسی دوران میں انگلستان اور جمہوریہ ڈچ کی آبادی آسمان سے باتیں کرنے لگی، جبکہ یہ مغربی یورپ میں باقی جگہوں پر آہستہ سے بڑھی۔(دیکھئے جدول 7.2) یہ ایک اور اشارہ ہے کہ انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں کچھ نہ کچھ مختلف ضرور تھا۔ صنعتی دور سے قبل کی دُنیا میں، شہری آبادیاں، معاشی کامیابی کے بہترین نشان نما تھیں۔ زیادہ آبادیوں کا مطلب تھا کہ وہاں شہری آبادی کو خوراک مہیا کرنے کی گنجائش تھی، اور شہری لوگ عموماً سامان تحسیش یا تجارت کی پیداکاری میں مصروف ہوتے تھے۔لیکن جدیدیت کے شہر رہنے کیلئے بدنامی کی حد تک غیر صحت بخش جگہیں تھیں، جہاں شرحِ اموات شرحِ پیدائش سے بہت زیادہ تھی۔ واضح بات ہے کہ، تیز نقل مکانی،.....جس کا محرک زیادہ معاوضہ جات تھے۔شہری آبادیوں کے بڑھنے کا سب سے بڑا محرک تھا۔لہٰذا، اگرچہ انگلستان اور جمہوریہ ڈچ، بمشکل اُس انداز سے اُڑان بھر رہے تھے۔جس انداز سے صنعتیائی گئی قوموں نے صنعتی انقلاب کے بعد بھری،لیکن وہ اُن بلند معاوضہ جات کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے، جو کالی موت کے مابعد نتیجے کے طور پر وجود میں آتے۔ یقیناً یہ معاوضہ جات مصنوعی طور پر بلند نہیں ہوتے تھے؛ وہ ایک معمول بن گئے، اور صنعت کاری کے آغاز کے بعد اور بھی زیادہ ڈرامائی انداز سے بلند ہوئے۔



**جدول 7.2:** دس بڑے شہروں کی کُل آبادی (ہزاروں میں) موجودہ ممالک کے حوالے سے

| | 1500 | 1700 | 1800 | فی سال% تبدیلی 1500-1700 | فی سال تبدیلی 1500-1800 | مذہب |
|---|---|---|---|---|---|---|
| انگلستان(یوکے) | 88 | 736 | 1,539 | 1.07% | 0.96% | پروٹسٹنٹ |
| نیدرلینڈز | 136 | 500 | 474 | 0.65% | 0.42% | پروٹسٹنٹ |
| جرمنی | 251 | 368 | 623 | 0.19% | 0.30% | مخلوط |
| بلجیم | 275 | 369 | 357 | 0.15% | 0.09% | کیتھولک |
| فرانس | 583 | 992 | 1,216 | 0.27% | 0.25% | کیتھولک |
| اٹلی | 707 | 1,078 | 1,369 | 0.21% | 0.22% | کیتھولک |
| سپین | 376 | 527 | 756 | 0.17% | 0.23% | کیتھولک |

**نوٹ:** صرف وہی ممالک شامل کئے گئے جن کے 1700 تک کم ازکم دس شہر تھے ذریعہ بوسکرا ے آل۔(2013)

پچھلے باب میں ایک وجہ بیان کی گئی کہ انگلستان اور جمہوریہ ڈچ کیوں اس منفی معاشی انجام سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ جس میں باقی ماندہ یورپ سولھویں اور سترھویں صدیوں میں مبتلا رہا:۔ اُن دونوں نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرلیا اور نتیجے کے طور پر اُن کے سیاسی ادارے تبدیل ہوگئے۔ سولھویں صدی کے اختتام تک پروٹسٹنٹ یورپ میں مذہبی اشرافیہ کے پاس حکمرانی کو جائز قرار دینے کی کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ اپنے اقتدار کو توسیع دینے کیلئے پروٹسٹنٹ حکمران جواز بخشی اقتدار کے دوسرے زیادہ مہنگے ذرائع کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اسی دوران میں کیتھولک یورپ اور سلطنتِ عثمانیہ میں، مذہب اور مذہبی ادارے جواز بخشی اقتدار کے اہم ذرائع رہے، کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پروٹسٹنٹ حکمران اپنے احکامات کو مذہبی تناظر کا لبادہ اُوڑھانے سے باز رہے؛ بلکہ الزبتھ اول بالکل یہی کچھ کرنے کیلئے مشہور تھیں۔ تاہم تحریکِ اصلاح کلیسا نے مذہبی جواز بخشی اقتدار کے موثر پن کو کم کردیا۔ پروٹسٹنٹ ممالک میں

www.MashalBooks.org

اس نے توسیع اقتدار کے کارندوں کے انتخاب سے وابستہ نفع ونقصان کے تجزیے کو متاثر کیا۔ اگرچہ مذہب جواز بخشی اقتدار کیلئے سب سے کم مہنگا انتخاب تھا، لیکن تحریک اصلاح کلیسا نے ڈرامائی طور پر اس کے فائدے کو کم کر دیا، لہٰذا، پروٹسٹنٹ بادشاہوں اور ملکاؤں نے اقتدار کو توسیع دینے کے متبادل ذرائع کو اختیار کر لیا۔

یہ باب ان تبدیلیوں اور اُن کے طویل المدتی معاشی اثرات کا کھوج لگاتا ہے۔ اس کا بنیادی نتیجہ یہ ہے کہ یہ چیز اہمیت رکھتی ہے کہ سیاسی اقتدار کو کون توسیع دیتا ہے۔ جہاں توسیعی کارندوں کی ترغیبات معاشی کامیابی سے مطابقت رکھتی تھیں، وہاں معاشی ترقی کے آنے کا امکان تھا۔ اس کے برعکس، غیر محفوظ حقوقِ ملکیت، اور عوامی فلاح میں کم سے کم سرمایہ کاری، زیادہ تر تاریخ میں معمول تھی، کیونکہ وہ گروہ جو حکمرانی کو توسیع دیتے تھے..... خاص طور پر مذہبی حاکمیت اور افواج..... بہت زیادہ اس کے بارے میں فکرمند نہیں تھے۔ یہ چیز تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد تبدیل ہوئی۔ پروٹسٹنٹ ریاستوں میں مذہبی حاکمیت کا نقصان معاشی اشرافیہ کا فائدہ تھا؛ موخرالذکر نے تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد اپنے اثر ورسوخ کو بلند ہوتے ہوئے دیکھا۔

اس بات کا باقی ماندہ حصہ ان دو پروٹسٹنٹ اقوام میں ان تبدیلیوں کے نتائج کا جائزہ لیتا ہے، جو بعد از تحریکِ اصلاح کلیسا کے دور میں انتہائی کامیاب تھیں: انگلستان اور جمہوریہ ڈچ۔ 1500 تک ان میں سے کوئی ایک بھی معاشی اُڑان کیلئے واضح اُمیدوار نہیں تھا۔ انگلستان ابھی ایک خونی طویل خانہ جنگی (جنگِ گلاب) پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا، اور فوجی طاقت، ٹیکنالوجی اور معاشی ترقی کے حوالے سے جنوبی یورپ طاقتوں اور غالباً سلطنتِ عثمانیہ سے بھی پیچھے تھا۔ شمالی نیدرلینڈز (جدید دور کا نیدرلینڈز) کامیابی کیلئے انگلستان کی نسبت بہت بہتر پوزیشن میں تھا لیکن جنوبی نیدرلینڈز (جدید دور کے بلجیم) سے خاصا پیچھے تھا۔ سولھویں صدی کے آغاز میں شمال مغربی یورپ کے بڑے تجارتی اور مالیاتی مراکز اینٹورپ اور برجز تھے نہ کہ ایمسٹرڈیم۔ جنوبی نیدرلینڈز، جو کیتھولک رہا، واضح طور پر شمالی نیدرلینڈز کی نسبت بہتر معاشی پوزیشن میں تھا۔ تو پھر، سترھویں صدی ''ڈچ صدی'' کیوں تھی اور جدید معاشی ترقی انگلستان میں کیوں شروع ہوئی؟ انگلستان اور ڈچ جمہوریہ اُن مالتھوسی دباؤں سے کیوں کر بچ نکلے، جو آخرکار پورے ابتدائی جدید دور میں، بہت سی یورپی معیشتوں کو کچلنے پر اختتام پذیر ہوئے۔



# مابعد تحریکِ اصلاحِ کلیسا کا انگلستان

انگلستان نے 1530 کی دہائی میں ہنری ہشتم کے ماتحت عہد (1509-1547) تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کیا۔ کیتھولک ملکہ میری اوّل (عہد 1553-1558) کے ماتحت کیتھولسزم کی طرف دوبارہ تبدیلی کی کوشش کے ایک مختصر دورانیے کے بعد، انگلستان نے، ملکہ ایلزبیتھ اول (عہد 1558-1603) کے ماتحت مستقل طور پر کلیسائے انگلیسی سے وابستگی اختیار کر لی۔ تاریخ انگلستان میں کچھ عجیب وغریب چیزیں ہیں جن کا اطلاق تمام پروٹسٹنٹ اقوام پر نہیں ہوتا، لیکن انگلستان کے حتمی معاشی اور ٹیکنالوجیاتی غلبے کے تناظر میں، اس میں کلیسا۔ ریاست تعلقات کا تجزیہ کرنا خاص طور پر اہم ہے۔

تحریکِ اصلاح کلیسا سے پہلے، انگریز بادشاہ اپنی حکمرانی کو دو ذرائع سے توسیع دیتے تھے: کلیسا اور پارلیمان سے۔ بعض اوقات یہ طبقات ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ہوتے تھے، کیونکہ ارکانِ کلیسا ایوان بالا میں بہت سی نشستیں رکھتے تھے۔ ''پارلیمان'' کی اصطلاح اوّل اوّل 1230 کی دہائی میں نمودار ہوئی، اور پہلی پارلیمانوں نے بادشاہ کو ٹیکس کے محصولات مہیا کر کے اُس کی حکمرانی کو توسیع دی، اس کے بدلے میں، ارکانِ پارلیمان اپنے نوابوں کے ذریعے مقدمات کی ہدایت کاری کر سکتے تھے، اور اُنہیں مستقبل کے ٹیکسوں کو مسترد کرنے کا بھی اختیار تھا۔ پارلیمان تین گروپوں پر مشتمل تھی..... ارکانِ کلیسا، اشرافیہ اور معاشی اشرافیہ..... آہستہ سے ترقی کرتے ہوئے کاروباری شہروں کے ہوتے ہوئے، جن کے پہلے نمائندگان 1275 تک موجود تھے 3 تیرھویں صدی کی پارلیمان کا کردار صرف مقامی ٹیکس اکٹھا کرنے تک محدود تھا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی مقامی ٹیکس اکٹھا کرنے تک محدود تھی۔ چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے دوران، دونوں ایوانوں نے مقنّنہ کا کردار اپنا لیا کیونکہ بادشاہوں نے طویل اور مہنگی جنگوں کو رقومات مہیا کرنے کی خاطر زیادہ سے زیادہ مراعات دیں۔ پہلے ٹیوڈر ہنری ہفتم

www.MashalBooks.org

(عہد 1485-1509) کے تخت نشین ہونے تک، پارلیمان ایک ٹیکس لگانے والا، قانون ساز، اور مشاورتی ادارہ تھا۔ بادشاہ، پارلیمان کی منظوری کے بغیر نہ قوانین بنا سکتا تھا، نہ اُن میں ترمیم کرسکتا اور نہ ہی اُنہیں واپس لے سکتا تھا اور نہ ہی ٹیکس عائد کرسکتا تھا۔(4)

تحریکِ اصلاحِ کلیسا سے قبل کلیسا توسیع اقتدار میں ایک بنیادی کھلاڑی تھا۔ مذہبی جواز بخشی اقتدار کی اہمیت کی تاریخ کم ازکم فاتح ولیم (عہد 1066-1087) کے دور تک پیچھے جاتی ہے جس نے پوپ کی آشیر باد اور ایک مقدس جھنڈے کی مدد سے انگلستان کو فتح کیا، جس نے ولیم کی فتح کو ایک مذہبی جہاد کا تقدس دے دیا، ہنری دوم (عہد 1154-1189) نے، ایک صدی بعد، اسی طرح کی اشیر باد اپنی مجوزہ فتح آئرلینڈ کیلئے حاصل کی۔ بادشاہ جان اوّل (عہد 1199-1216) اس سے بھی آگے چلا گیا اور اُس نے کلیسا کو ناراض نوابوں سے اپنی حفاظت کی اپیل کی اور اپنا تاج پوپ کے حق میں چھوڑ دیا.....اس طرح کہ پوپ نے اسے بطور جاگیر کے جان کو واپس کر دیا۔ پوپ کی حمایت کے بدلے میں۔ بلاشبہ، کلیسا انگلستان کا قبل تحریک اصلاح کلیسا کا وہ واحد ادارہ تھا جس کے پاس اتنی دولت اور طاقت تھی کہ وہ اسے بادشاہ کے کنٹرول سے باہر رکھ سکتا تھا۔(5) انگلستان میں ایک بڑے زمیندار ہونے کے ناطے، جو تحریکِ اصلاح کلیسا کے وقت تمام انگلیسی زمین کے تقریباً 30 فیصد کا مالک تھا، کلیسا کسی بھی ایسے حکمرانی کی حکمرانی کو توسیع دینے کا جذبۂ محرکہ رکھتا تھا، جو نظم وضبط قائم کرے اور کلیسا کے وسیع جائیدادوں کے حق کی حفاظت کرے۔

تحریکِ اصلاح کلیسا انگلستان میں جزوی طور پر ہنری ہشتم کی انوکھی، خواہشات کی وجہ سے آئی۔ جو کیتھرین ایرے گان (Aragon Catherine) سے طلاق چاہتا تھا، جو پوپ نے نہ دی۔ ہنری ہشتم نے اوپر سے انگلیسی تحریکِ اصلاحِ کلیسا قائم کی۔ مقدس رومی سلطنت کے برعکس، جہاں سیاسی حالات، مقامی معاشی اور مذہبی ترجیحات کے ساتھ مخلوط ہوکر یہ طے کرتے تھے کہ آیا کوئی شہری تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کرتا ہے، ہنری ہشتم نے پروٹسٹنزم کا اپنا مارکہ پارلیمنٹ کے ذریعے متعارف کروایا۔ انگلستان میں چھاپہ خانے نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو پھیلانے میں نسبتاً خاموش کردار ادا کیا، لیکن یہ چیز پچھلے ابواب میں پیش کئے گئے وسیع تر استدلال کی نفی نہیں کرتی۔ جس وقت تک ہنری ہشتم تحریکِ اصلاح کلیسا کو انگلستان لے کر آیا، چھاپہ خانہ



پہلے ہی ایک ایسی تحریک کو شروع کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا تھا، جسے کلیسا روک نہ سکا۔ ہنری ہشتم نے اسے محض اپنی پُشت در پُشت حکمرانی کی خواہشات کو آگے بڑھانے کیلئے، موقع پرستانہ طور پر استعمال کیا۔ یہاں اس فیصلے کے غیر ارادی اور ناقابلِ پیش بینی نتائج زیرِ غور ہیں۔

تحریکِ اصلاحِ کلیسا نے مستقل طور پر مذہبی اشرافیہ کی انگلیسی بادشاہ کی حکومت کو جواز بخشنے کی صلاحیت کو تبدیل کر دیا، ہنری ہشتم نے کلیسا کی تمام زمینوں کو ضبط کر لیا اور کسی بھی اہلِ کلیسا کی طاقت کو، جس نے نئے عالمی نظام کو تسلیم نہ کیا، بے اثر کر دیا۔ جب ہنری ہشتم نے کیتھرین سے طلاق لینے کے بعد این بولین (Anne Boleyn) سے شادی کی، تو وہ (کیتھرین) ایلزبتھ کے ساتھ حاملہ تھی۔ یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ ہنری ہشتم یہ یقین رکھتا تھا کہ ''انگلیسی بادشاہ اپنی بادشاہت کے مستقبل کا تعین اور اُس کی جواز بخشی خود کرسکتا تھا، بغیر روم کی طرف سے اجازت نامے کے۔ [ہنری] نے ہسپانوی ملکہ کی جگہ انگلیسی این کو لاکر، ٹیوڈر تخت نشینی کو شہزادی میری سے این کے ابھی نامولود بچے کی طرف منتقل کر کے، نئی تاریخ لکھنے کا بڑا اُٹھایا۔''(6)

ہنری ہشتم کے اپنے جواز بخشی کے کارندوں میں سے ایک کو رضا کارانہ طور پر ختم کرنے کے بعد، اُس نے اپنے اقتدار کو توسیع دینے کیلئے دوسرے کارندوں کی طرف رُخ کیا..... پارلیمان کلیسا کا فطری نعیم البدل تھا: اس نے اس سے پہلے بھی بادشاہ کی متنازعہ پالیسیوں کو، پارلیمانی سند عطا کر کے اُنہیں جائز بنانے میں۔ مدد کی۔ نتیجۃً ہنری ہشتم نے اپنی تحریک اصلاحِ کلیسا کو جائز بنانے میں پارلیمان کو استعمال کیا۔ 1530 کی دہائی کے دوران، ہنری ہشتم نے پارلیمان کے ذریعے اصلاحات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا، جنہوں نے، کلیسا کی قیمت پر بادشاہی اور پارلیمانی طاقت دونوں کو بڑھاوا دیا۔ 1532 کے کلیسائی اپیلوں کے قانون نے مذہبی یا دوسرے معاملات پر تمام اپلیس پوپ کو کرنے سے منع کر دیا(7)، 1534 کے بالادستی کے ایکٹ (The Act of Supremacy) نے کلیسا پر اُن تمام اختیارات کو جو کبھی پوپ کے ہاتھ میں تھے'' بادشاہ کیلئے مختص کر دیا۔(8) 1530 کی دہائی کے اخیر پر جاری ہونے والے خانقاہوں کی تحلیل کے ایکٹ (Dissolution of Monasteries Acts) نے کلیسا کی جائیداد کی بڑے پیمانے پر ضبطی کی اجازت دے دی، اور ایوان بالا میں سے پادریوں کی رہائش گاہوں کے منتظمین کو 1539-1540 میں نکال دیا گیا۔(9)

www.MashalBooks.org

ان تبدیلیوں کے پارلیمان اور بادشاہ کی طرف سے بنائے ہوئے قوانین کی اقسام کیلئے بہت بڑے نتائج تھے۔ ایک اہم اور فوری نتیجہ، انگلیسی زمین اور جائیداد کے حقوق کے قانون پر ایک دہائی طویل مباحثہ تھا۔ یہ مباحثہ دو ایکٹوں کے گرد مرکوز تھا: استمتاع کا قانون (The Statute of Uses)(1536) اور وصیتوں کا قانون (The Statute of Wills) (1536)۔(10) ان قوانین پر مباحثے کی نوعیت اہم ہے، کیونکہ یہ بادشاہ پارلیمان کے درمیان قوتِ محرکہ کی تبدیلی پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس مباحثے کی بنیاد یہ تھی کہ ہنری ہشتم رقومات کیلئے سخت ضرورت مند تھا، اس جائیداد کے قانون میں بڑے رخنے کو ختم کرنے کا خواہشمند تھا، جو جائیداد کے مالکان و زمیندارانہ واجبات سے بچنے کی اجازت دیتا تھا۔ یہ رخنہ۔ استمتاع (کسی کا کسی دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنا۔م) اس طرح کام کرتا تھا: ایک شخص الف نے اپنی زمین کا ''استمتاع'' ایک قابلِ اعتماد شریک جُرم ایک شخص ب کو، دیا، جو بدلے میں، الف کی طرف سے نامزد کئے جانے والے اشخاص کو الف کی وفات پر زمین کے فوائد سے بہرہ مند ہونے کی اجازت دے گا۔ یہ چیز زمینداروں کو، بادشاہ کو قابل ادائیگی زمیندارانہ واجبات سے گریز کی اجازت دیتی تھی۔ جاگیردارنہ قانون کے تحت، کسی شخص کے وارثان اُس تمام زمین کے واجبات بادشاہ کو ادا کرنے کے پابند ہوتے تھے، جو مرنے والا اپنی وفات کے وقت اپنے پاس رکھتا تھا۔ اگر مرحوم اپنی زمین کو استمتاع میں رکھ دیتا، تو وہ اپنی وفات کے وقت سرکاری طور پر اس کا مالک نہیں ہوتا تھا، لہٰذا اُس کے وارثان بادشاہ کو کچھ بھی ادا کرنے کے پابند نہیں ہوتے تھے۔

ہنری ہشتم زمیندارانہ واجبات سے گریز کو، جس کو استمتاعوں سے سہولت ملتی تھی، ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایوان نمائندگان اور ایوانِ بالا میں مالکان زمین استمتاعوں کے بنیادی فیض یابوں میں سے تھے۔ لہٰذا ہنری ہشتم کو، محض اُن سے اس رخنے کو ختم کرنے کی درخواست کرنے سے، کامیابی کا امکان نہیں تھا۔ لہٰذا ہنری نے عدالتوں پر اپنے اثر کو استعمال کیا اور ایک حکم حاصل کرلیا جو اس بات کا اعلان کرتا تھا کہ زمین وصیت کے ذریعے ترکے میں نہیں چھوڑی جاسکتی اور یہ کہ تاج کو تمام زمین پر مکمل حقوق حاصل ہیں (11) یہ چیز تمام زمیندار اشرافیہ کیلئے تباہ کُن ہوسکتی تھی، جن میں سے بہت سے لوگوں نے پہلے ہی اپنی زمین استمتاع میں رکھی ہوئی تھی۔ لہٰذا ہنری ہشتم نے ایک سمجھوتے کی تجویز پیش کی: بادشاہ نے ایسی قانون سازی کی پیشکش کی جو ایک مرتبہ پھر



استمتاع سے فائدہ اُٹھانے والے زمیندار ٹیکس کے تابع ہوں گے یہ قانون استمتاعوں کے قانون (Statute of Uses) کے طور پر 1536 میں منظور ہوا۔

استمتاع کے قانون کے منظور ہونے کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس بات کو منکشف کرتا ہے کہ تاج اور پارلیمان کی قوتِ محرکہ کہ تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد کے سالوں میں کس قدر تبدیل ہوگئی..... استمتاعات کے قانون کی منظوری کے بعد، ہنری ہشتم کو پارلیمان کے اندر کی زمیندار اشرافیہ کی طرف سے تقریباً بغاوت کا سامنا کرنا پڑا، جو یہ محسوس کرتے تھے کہ ہنری نے، اُن کے حقوق بطور مالکانِ جائیداد سے تجاوز کیا ہے 12 ہنری اپنے دفاع کیلئے لڑائی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں تھا..... پارلیمان ٹیوڈر خاندان کیلئے ایک اہم توسیع کار تھی..... لہٰذا وہ اُن بہت سی مراعات پر جو اُس نے قانون استمتاعات میں حاصل کی تھیں، نرم پڑ گیا۔ اس کا نتیجہ قانونِ وصیت (The Statute of Wills) تھا (1540)۔ اس قانون نے زمین کو وصیت کے ذریعے ترکے میں قابلِ انتقال بنادیا، اور بادشاہ کے حقوق کو پوری جائیداد کی بجائے جیسا کہ قانون استمتاعات میں صورت حال تھی جائیداد کے ایک تہائی حصے تک محدود کردیا۔ 13 یہ زمینداروں کے حقوقِ ملکیت کیلئے ایک بہت بڑی پیشرفت تھی..... ایک بات یہ تھی کہ اس نے پہلوٹھی کے بچے کو جائیداد منتقل ہونے کے نظام کیلئے موت کی گھنٹی بجادی، اور اجازت دے دی کہ زمیندار اپنی زمین کو کسی بھی شخص کو جسے وہ چاہیں، ایک وصیت لکھ کر منتقل کرسکتے تھے۔ زیادہ اہم بات یہ تھی، کہ وصیت کے قانون نے، حقوقِ ملکیت کو ایک بے مثال مضبوطی اور وضاحت مہیا کردی۔ اس کے بعد مالکانِ زمین اپنی زمین کو، جس کے نام وہ چاہیں، تاج کی طرف سے کم سے کم مداخلت یا تاج کو کم سے کم ادائیگی کے ساتھ وصیت کرسکتے تھے۔ تاج پارلیمان تعلقات کے تناظر میں، یہ آنے والی چیزوں کا نقیب تھا۔ محصولات اور اپنے اقتدار کی توسیع کیلئے بادشاہ کے پارلیمان پر زیادہ شدت سے انحصار کرنے کی وجہ سے، بادشاہ کو اور حقوق سے دستبردار ہونا پڑا، جن میں سے زیادہ تر ایوانِ نمائندگان کے ارکان کے معاشی مفادات کی حمایت کرتے تھے۔

گریف اور روبن (Greif and Rubin) (2015) یہ استدلال کرتے ہیں کہ پارلیمان کے ذریعے اقتدار کی جوازبخشی کی طرف تبدیلی پورے ٹیوڈر دور میں قائم رہی، جزوی طور پر اُن منفرد حالات کی وجہ سے جن میں، ہنری ہشتم کے تین بچے تخت نشین ہوئے ہنری ہشتم

www.mashalbooks.org

کے نابالغ بچے نے 1547 میں تخت سنبھالا۔ ایک بچے اور پہلے ایسے انگریز بادشاہ کے طور پر جو پیدائشی پروٹسٹنٹ تھا، وہ وہ روایتی جوازِ اقتدار کے ذرائع نہیں رکھتا تھا، جو اس سے پہلے انگلیسی تخت کے بالغ مرد وارثان کو حاصل ہوتے تھے۔ اُس کی دو بڑی بہنوں میری اول اور الزبتھ اول کیلئے صورتِ حال اور بھی زیادہ خراب تھی۔ میری اول انگلستان پر دوبارہ کیتھولسزم کو عائد کرنے کا ارادہ رکھتی تھی.....اکثر اوقات پُرتشدد طریقے سے، جس کی وجہ سے اُس کا لقب خونی میری پڑ گیا .....جبکہ الیز بتھ اول کا ارادہ پروٹسٹنزم کو متعارف کروانے کا تھا۔ اس حقیقت نے ان کیلئے حالات اور بھی مشکل بنا دیئے کہ جب وہ اقتدار میں آئیں تو ان کے اقتدار کے جواز کے بارے میں کھلے سوالات موجود تھے۔ اُن کے والد ہنری ہشتم نے ان دونوں بہنوں کو، پارلیمان کے علیحدہ علیحدہ قوانین کے ذریعے 1533 اور 1536 میں سرکاری طور پر ناجائز بچے قرار دلوایا تھا (14) جس نے اُنہیں تخت کیلئے نااہل بنا دیا ہنری نے میری کو اس وقت ایک ناجائز اولاد قرار دلوایا تھا جب این بولین تخت نشین ہوئی، تاکہ وہ ایلز بتھ کیلئے راہ ہموار کر سکے، جبکہ اُس نے ایلز بتھ کو اُس وقت ناجائز اولاد قرار دلوایا تھا، جب اُس نے بولین کا سر قلم کروایا۔ اگرچہ 1543 کے تخت نشینی کے قانون نے بطور ناجائز اولاد کے اُن کی حیثیت کو منسوخ کر دیا تھا (15) لیکن اُن کے تخت کے حق کے بارے میں کھلے سوالات موجود تھے۔ میری اوّل اور ایلز بتھ اول دونوں نے، جب ایک مرتبہ اُن کا عہد شروع ہو گیا، پارلیمان سے، اپنے حق حکومت کے جواز کی سرکاری طور پر توثیق کی ضرورت محسوس کی۔ ان قوانین کے نام بڑے معنی خیز تھے: 1553 کا ملکہ وغیرہ کی حکمرانی کے جواز کا ایکٹ اور ملکہ کے تاج کے استحقاق کا ایکٹ 1558۔ (16)

اس طرح ہنری ہشتم کے بعد کے تین ٹیوڈر بادشاہ منفرد حالات میں تخت نشین ہوئے۔ ایڈورڈ ششم، میری اوّل اور ایلز بتھ اول جوازِ اقتدار کے اُن دو روایتی ذرائع سے محروم تھے جو ان کے بہت سے پیشروؤں کے پاس تھے: ایک بالغ مرد وارث ہونا اور کلیسا کی طرف سے حمایت۔ ان حالات میں ٹیوڈر بادشاہوں نے اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کیلئے ''بادشاہوں کے الوہی حق'' (یا ملکاؤں کے) کا دعویٰ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کے کمزور جواز حکومت کا مطلب تھا کہ اب وہ پارلیمان کی حمایت کے بغیر مطلقاً حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ (17)

پارلیمان کے ارکان نے یقیناً ٹیوڈروں کی حمایت اپنی رحمدلی کی وجہ سے نہیں کی تھی۔ ٹیوڈر



حکومت کی پارلیمانی حمایت ایک قیمت پر ہوئی، خاص طور پر ایوان نمائندگان میں، ہنری ہشتم، ایڈورڈ ششم اور ایلز بتھ اول نے ایسی رعایات دیں، جنہوں نے پارلیمان میں مالکان جائیداد کو، مذہبی حاکمیت کی قیمت پر ایک بڑی آواز مہیا کی۔ بہت سے ارکان پارلیمان کا مالی مفاد تھا، حقوقِ ملکیت حاصل کرنے میں، تجارت کو ترقی دینے میں، اندرونی بہتریاں لانے میں اور عمومی معاشی خوشحالی لانے میں۔ ایلز بتھ اول کے ماتحت صنعت، غریبوں کی مدد، اور زرعی فائدے سے متعلق سینکڑوں بل منظور کئے گئے۔ اہم بلوں میں کاریگروں کا قانون (Statute of (1558-1563) Artificers) شامل تھا، جس نے انگلیسی ریاست کو وہ بہت سے حقوق دیئے جو اس سے پہلے انجمنوں (گلڈز) کے پاس تھے؛ سودی قوانین کا دوبارہ قیام، جس نے 10 فیصد تک سود کی اجازت دی (18) اور 1601 کا غریبوں کا قانون (Poor law) ان میں سے آخری قانون نے سماجی تحفظ کا ایک جال مہیا کیا، جو اس وقت یورپ میں کہیں نہیں تھا، اور معاشی اشرافیہ نے اس کی پُرزور حمایت کی تاکہ آوارہ گردی کو کم کیا جا سکے۔ ایونر گریف (Avner Greif) اور مرالی لائی گن (Maral Iyigun) (2013) یہ بیان کرتے ہیں کہ غریبوں کا قانون انگلستان کی طویل مدتی خوشحالی کیلئے لازمی تھا، کیونکہ اس نے موجدوں کو ترغیب دی کہ وہ ایجاداتی سرگرمیوں کے ساتھ منسلک نقصان کے خطرات مول لیں کیونکہ یہ قانون ناکامی کی صورت میں اُنہیں تحفظ کا جال فراہم کرتا تھا۔

ایوان نمائندگان کو ان رعایات کے باوجود، ایلز بتھ اول کو محصولات کے آزادانہ ذرائع بھی دستیاب تھے، جو اسے پارلیمان کے مقابلے میں کچھ طاقت مہیا کرتے تھے۔ ان محصولات میں سے سب سے زیادہ متنازعہ اجاروں کی فروخت تھی، جو بادشاہ کو پیداکاروں کی قیمت پر رقومات مہیا کرتے تھے۔ ایلز بیتھ نے سپین کے ساتھ جنگ میں سرمایہ لگانے کیلئے تاج کی 25 فیصد زمین بھی بیچ ڈالی۔ (19) جب تک تاج کو محصولات کے یہ آزاد وسائل مہیا تھے اُس کے لئے ایوان نمائندگان کے ساتھ گفت وشنید کرنے کیلئے کوئی ترغیب نہ تھی۔ لیکن اجاروں اور زمین کی فروخت کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ یہ محصولات کے نہ ختم ہونے والے دھارے مہیا نہیں کرتے۔ جب ایک مرتبہ تاج اجارہ داریوں کیلئے صنعتوں اور بیچنے کیلئے زمینوں سے خالی ہو گیا، تو یہ رقومات کیلئے پارلیمان کے پاس واپس چلا گیا۔

www.mashalbooks.org

اگر چہ ایلزبتھ اول نے ایوانِ نمائندگان سے بالا بالا کچھ طاقت کو قائم رکھا، لیکن پارلیمان سولھویں صدی کے دوران ایک زیادہ اہم اقتدار کی جواز بخشی، محصولات پیدا کرنے اور قانون سازی کا ایک زیادہ اہم ادارہ بن گیا اگر تاج پارلیمان کی خواہش کے مطابق قوانین اور پالیساں نہیں بناتی، تو وہ یا اس کے جواز یا محصولات کو واپس لینے کی دھمکی دے سکتی تھی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، پارلیمان کی اضافہ شدہ سیاسی طاقت اور تنظیمی صلاحیتوں نے اسے اس قابل بنا دیا کہ یہ کسی بھی ایسے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی دھمکی دے سکے جو اسے کمزور کرنے کی کوشش کرے۔

وہ تحقیق جو میں نے ابونر گریف (Auner Greif) (2015) کے ساتھ کرلی ہے، جو اُن نکات کو اُٹھالیتی ہے جو اس کتاب میں پیش کئے دلائل چھوڑ دیتے ہیں، یہ بتاتی ہے کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد سیاسی طاقت کے توازن میں ہونے والی تبدیلی، سترھویں صدی میں مختلف ادارہ جاتی اور پالیسی کی تبدیلیوں کا ذریعہ بنی، خاص طور پر، ہمارا تجزیہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ 1640 کی دہائی کی خانہ جنگیاں اور 89-1688 کا شاندار انقلاب، بادشاہ کو جواز اقتدار دینے کے پارلیمان کے کردار پر ہونے والے تصادمات تھے۔(21) محصولات مہیا کرنے کے علاوہ، پارلیمان نے قانون کا تعین کرنے میں بھی بنیادی کردار ادا کیا...... یعنی اس سلسلے میں کہ بادشاہ کیلئے کون سے اقدامات لینا جائز تھا۔ جب تک بادشاہ پارلیمان کے متعین کردہ قانون کی حکمرانی کی پیروی کرتا تھا، وہ جائز تھا۔ لہٰذا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب سترھویں صدی کے سٹورٹ بادشاہوں نے، کیتھولک، کلیسا کی جواز بخشی اقتدار کی طاقت کو دوبارہ قائم کرنا چاہا...... چارلس اول نے ایک کیتھولک شہزادی سے شادی کی، اور جیمز دوم کی بیوی نے، اس سے چند ہفتے پہلے کہ پارلیمان نے اُسے اقتدار سے باہر کیا، ایک کیتھولک وارث کو جنم دیا...... تو پارلیمان کے سامنے بغاوت کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ بصورتِ دیگر، دولت اور توسیع اقتدار کی طاقت کی شکل میں اُنہوں نے جو فوائد ٹیوڈر دور میں حاصل کئے تھے، اُن کی بیخ کنی ہو جاتی۔

جب 1689 میں، گرد ذرا بیٹھی، تو پارلیمان کو ایک شدید طور پر کمزور شدہ تاج کے مقابلے میں بالادستی حاصل ہوگئی...... گریف اور روبن کے تجزیے کا خلاصہ یہ ہے کہ شاندار انقلاب کے قضیے کے طے ہو جانے کے بعد جو نیا ادارہ جاتی ڈھانچہ عائد کیا گیا، اس نے تاج اور پارلیمان کو، اپنے مشترکہ مفادات کو آگے بڑھانے کیلئے تعاون کرنے کے قابل بنا دیا، نئے ادارہ جاتی



انتظامات کا انحصار پہلے کی نسبت بہت زیادہ قانون کی حکمرانی پر تھا، اس قانون کی حکمرانی پر جس کی رہنمائی پارلیمان کر رہی تھی۔ اس چیز نے جوابی طور پر کاروبار کی حامی پالیسیوں اور قوانین کی تدوین کی حوصلہ افزائی کی۔ مثال کے طور پر، گریف اور روبن یہ تحریر کرتے ہیں کہ کس طرح بحری اور تجارتی پالیسی حکمرانی کے تعطل کے وقفے (1649-1660) کے درمیان، جب پارلیمان کے پاس انتظامی اختیارات تھے کاروباری مفادات کی عکاسی کی اس دہائی میں، پارلیمان نے Navigation Acts منظور کئے جہازوں کے قافلوں کو لیوانٹ کمپنی کی جہازرانی کو تحفظ دینے کا حکم دیا، اور کاروباری پالیسی پر جنگوں میں اُلجھی (پہلی انگلیسی ...... ڈچ جنگ، [1652-1654] اور انگلیسی ہسپانوی جنگ [1654-1660]۔(22) ڈان بوگارٹ (Don Bogart) اور گرے رچرڈس (Gray Richardson) (2009,2011)، یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح پارلیمان نے، پوری اٹھارویں صدی کے دوران، تبادلوں، ترمیمات، اور احاطہ بندیوں کو بہت زیادہ موثر اور کم مہنگا بنانے کیلئے، زمین کے حقوق کو دوبارہ منظم کیا، جبکہ بوگارٹ (2011) یہ بتاتا ہے کہ قوانین کی وضاحت اور اُن لوگوں کیلئے جنہوں نے نقل وحمل کی بہتری کا بیڑا اُٹھایا، حقوقِ ملکیت کے تحفظ میں شاندار انقلاب کے بعد بہتری آئی۔ یہ چیز، مروج، اٹھارویں صدی سے قبل کے حقوقِ ملکیت کے دستور سے واضح طور پر تقابل میں تھی، جس میں بہت سی کمزوریاں موجود تھیں: مالکان پر حد بندیاں تھیں کہ وہ اپنی زمین کو کس طرح بہتر بنا اور استعمال کر سکتے تھے، مقامی آبادیوں کو عوامی بنیادی اشیا مہیا کرنے سے روک دیا گیا تھا، اور حقوقِ ملکیت کو تبدیل کرنے کا عمل مہنگا اور وقت طلب تھا۔

انگلیسی خانہ جنگیاں اور شاندار انقلاب وہ پہلی مثالیں نہ تھیں، جہاں انگریز بادشاہ کو اندر سے بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے صرف دو صدیاں پہلے، لینکا سٹر اور یارک کے شاہی خاندانوں کے درمیان تخت پر مخالفانہ دعوؤں پر لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جسے گلابوں کی جنگ کا نام دیا جاتا ہے...... جو چیز شاندار انقلاب اور کسی حد تک، خانہ جنگیوں کو تخت اُلٹنے کی سابقہ کوششوں میں فرق پیدا کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ایک خاندان کے اقتدار کو ایک دوسرے خاندان کے اقتدار سے تبدیل کرنے سے زیادہ کچھ انجام دیا۔ گلابوں کی جنگ سے کوئی حقیقی ادارہ جاتی تبدیلی واقع نہ ہوئی...... معاشی اشرافیہ پر اختیار رکھنے والا ایک بادشاہ آ گیا۔ اس کے مقابلے

www.MashalBooks.org

میں، شاندار انقلاب ایک نئے ادارہ جاتی ڈھانچے پر منتج ہوا، 1689 کے بعد، پارلیمان تاج پر حکومت کرنے لگی اور اس کے مفادات انگلیسی معاشی اور خارجہ پالیسی پر غالب آ گئے۔

گریف اور روبن کے نشاندہی کئے ہوئے نتائج کا وسیع تر خلاصہ یہ ہے کہ یہ واقعات اُس طویل تاریخی عمل کا نتیجہ تھے جو ہنری ہشتم کی تحریکِ اصلاح کلیسا کے ساتھ شروع ہوا، یہ ٹیوڈروں کی زیرِ حکومت جواز بخشی اقتدار کے متبادل ذرائع کی تلاش تھی، جو پارلیمان کی طاقت اور دولت میں اضافے کا سبب بنی، پارلیمان کی اس وقت کی وجہ سے بڑے حکومتی سرمائے مفاد کی ترغیبات اُن قوانین اور پالیسیوں سے ہم آہنگ ہوگئیں جو معاشی ترقی کیلئے سودمند تھیں، جب پارلیمان بادشاہت کے مقابلے میں برتر ہوگئی، تو اس نے نئے قوانین وضع اور لاگو کئے جو اس کے اپنے معاشی مفادات سے ہم آہنگ تھے۔ کیونکہ یہ مفادات وسیع تر کلاں معاشی کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ تھے، لہٰذا انگلستان اٹھارویں صدی کے آغاز تک معاشی کامیابی کی بہتر پوزیشن میں تھا۔ یہ بات محض اتفاقی نہیں ہے کہ یہ ٹھیک یہی جگہ اور یہی وقت تھا، جب وہ جہاں جدید معیشت......اور صنعتی انقلاب......جلد ہی نمودار ہوئے۔



# تحریکِ اصلاح کلیسا، ڈچ بغاوت، اور معاشی کامیابی

غالباً نیدرلینڈز اس بات کی سب زیادہ سیدھی مثال پیش کرتا ہے کہ مذہبی جواز بخشی اقتدار سے ہٹ کر تحریکیں کس طرح معاشی خوشحالی کی حوصلہ افزائی کرسکتی ہیں۔ سپین کے خلاف ڈچ بغاوت (1568-1648) اور 1570 میں اس کی کیلوینیزم کی طرف تبدیلی، اس کتاب میں پیش کئے گئے دلائل کے ساتھ واضح طور پر ہم آہنگ ہے۔ بغاوت سے قبل نیدرلینڈز پہلے ہی یورپ کی ترقی یافتہ ترین معیشتوں میں سے ایک تھا۔ تاہم، معاشی سرگرمیوں کا مرکز جنوبی نیدرلینڈز میں تھا ...... جو کہ آج کل کا بلجیم ہے۔ اینٹواپ اور گینٹ جیسے شہروں میں، یہ علاقے بغاوت کے بعد ہسپانوی حکومت کے تحت کیتھولک رہے۔ تاہم، ڈچ سٹیٹ جنرل (یعنی پارلیمان) نے شمالی نیدرلینڈز میں تحریک اصلاح کلیسا کو قبول کر لینے کے بعد، معاشی سرگرمی کا مرکز آج کل کے نیدرلینڈز میں منتقل ہوگیا، جس نے ڈچ ''سنہری دور'' کا آغاز کیا۔ آنے والی صدی میں، ڈچ جمہوریہ ایک برتر طاقت (سپر پاور) بن گیا'' جو چھوٹی چھوٹی سیاسی چپقلشوں اور دوسری یورپی طاقتوں کی سامراج سازی کی کوششوں میں گہرے طور پر ملوث ہو گیا، اس دور میں دولت، دیہات کی شہروں میں تبدیلی توانائی کا استعمال، آبادی، معاوضہ جات اور صنعت تمام کے تمام مطلق طور پر اور اضافی معنوں میں، دونوں طرح سے خوب پھلے پھولے۔

1550 اور 1675 کے درمیان، شہروں میں رہنے والا ڈچ آبادی کا تھوڑا حصہ 24 فیصد سے بڑھ کر 45 فیصد ہوگیا، اور حقیقی معاوضہ جات میں فرق ہالینڈ...... جو کہ جمہوریہ ڈچ میں معاشی طور پر ترقی یافتہ ترین صوبہ تھا......اور انگلستان کے درمیان بہت زیادہ ہوگیا۔ (23) ڈچ سائنس اور فنون میں بھی آگے بڑھ گیا۔ ڈچ معاشی خوشحالی نے ایک ایسا ماحول مہیا کیا جس میں ہوئی جنز (Huygens) اور فان لیوون ہوئیک (Van Leeuwenhoek) جیسے سائنسدان اور ریمبراں (Rembrandt) اور ورمیر (Vermeer) جیسے فنکار اُبھرے۔

www.MashalBooks.org

ایک اتنی چھوٹی قوم کیسے ایک برتر طاقت بن گئی؟ اس دور میں متعدد ادارہ جاتی اور تاریخی خصوصیات نے مل کر ڈچ معیشت کو آگے بڑھایا۔ اول، ڈچ قوم کو تحریک اصلاحِ کلیسا سے قبل ہی ایک برتری حاصل تھی۔ 1500 تک، زیریں ممالک میں باقی ماندہ یورپ کی نسبت شہر زیادہ ترقی کر چکے تھے، اس طرح کہ اُن کے کارکنوں کا ایک بہت بڑا حصہ زراعت سے باہر کام کر رہا تھا۔ یہ جزوی طور پر اُس ترقی کا نتیجہ تھا جو ڈچ، قرونِ وسطیٰ کے اواخر میں حاصل کر چکے تھے۔ جدید آبپاشی کی تکنیکوں اور کھاد کے بہت زیادہ استعمال کا نتیجہ زائد خوراک کی شکل میں نکلا جس نے شہری آبادی کو خوراک فراہم کی۔ (24) شہروں میں، مزدوروں اور کاریگروں کے معاوضہ جات انگلستان سے اگر زیادہ نہیں تھے، تو ان کا مقابلہ ضرور کرتے تھے اور باقی ماندہ یورپ میں معاوضوں کی نسبت زیادہ تھے۔ (25) واضح طور پر مختص شدہ اور لاگو کئے ہوئے حقوق ملکیت نے بڑی بڑی سرمایہ کی منڈیوں کو تقویت دی، ڈچ جہاز اور تاجر تجارت پر چھاتے ہوئے تھے، اور غیر زرعی سرگرمیوں کا رُخ تقریباً مکمل طور پر بین الاقوامی مارکیٹوں کی طرف تھا۔ (26)

ان پیشرفتوں کی بہت سی وجوہات تھیں۔ ایک وجہ یہ تھی کہ، زیریں ممالک کے برگنڈی حکمرانوں نے تاریخی طور پر اجارہ داری کی مراعات اور ساتھ ہی ساتھ گلڈ اور تجارتی پابندیوں کی حوصلہ شکنی کی، جو سب کی سب قرونِ وسطیٰ کی یورپی معیشتوں کے راستے میں رُکاوٹیں تھیں۔ (27) غالباً زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نفاذ جاگیرداری زیریں ممالک میں قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے دوسرے علاقوں کی نسبت کم تھا۔ اتنا پہلے جتنا کہ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں زمین کی بحالی اور نئے علاقوں کی نوآبادیات سازی نے دولتمند زمینداروں کو، کسانوں کو جاگیردارانہ چنگلوں سے آزاد کرنے پر مائل کیا، اور اس طرح اُنہیں اپنی زمین کے چھوٹے ٹکڑے بٹّے پر دے کر کاشت کرنے کی ترغیب دی (28) یہ ٹھیک ہے اشراف کے ایک چھوٹے جاگیردار حصے کا قرونِ وسطیٰ کے اواخر میں سیاسی زندگی پر غلبہ تھا، لیکن اُن کے چھوٹے حجم اور مرتکز اختیار نہ ہونے، شہری معاشی اشرافیہ کو، یورپ میں کسی اور جگہ کی نسبت یہاں حکومت میں اپنی زیادہ اہمیت حاصل کرنے کا موقع دیا (29) اس کا نتیجہ یہ تھا کہ 1500 تک، ڈچ کاروباری شہر سیاسی اور معاشی طور پر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔ (30)

ڈچ برتری کا مطلب یہ تھا کہ ایک سنہری دور سولھویں یا سترھویں صدی میں واقع ہو



سکتا تھا، خواہ نیدرلینڈز میں تحریکِ اصلاحِ کلیسا کا غلبہ نہ بھی ہوا ہوتا۔ تاہم دوسرے حقائق یہ ظاہر کرتے ہیں کہ سنہری دور کسی بھی طرح ایک یقینی چیز نہ تھی۔ پہلی اور اہم ترین چیز یہ ہے کہ یہ جنوبی نیدرلینڈز تھا۔ جہاں برتری زیادہ واضح تھی، لیکن اصل سنہری دور شمالی نیدرلینڈز میں واقع ہوا۔ سنہری دور سے پہلے، کپڑے، مسالہ جات، دھاتوں اور چینی میں بھرپور تجارت جنوبی نیدرلینڈز کے شہروں، فلیمش اور باربینٹ میں مرکوز تھی .....انہی چیزوں کی تجارت تھی، جو آخر کار سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں ڈچ جمہوریہ کی معاشی زندگی پر چھا گئی۔ شمالی نیدرلینڈز بھرپور تجارت میں شامل نہیں تھا۔ اس کی تجارت کم اہم بڑے حجم والی اشیاء پر مشتمل تھی، جیسا کہ مچھلی، غلہ، اور لکڑی (31) لہٰذا جنوبی نیدرلینڈز اس بات کی برمحل مثال پیش کرتا ہے کہ جو ہوا تو نہیں لیکن ہوسکتا تھا۔ یہ ڈچ اُڑان کے وقت ایک معاشی لنگڑا نہیں بنا، اور یہ آخر کار اُنیسویں صدی میں صنعتی ٹیکنالوجیوں کو اپنانے میں ایک نسبتاً پہل کار ثابت ہوا۔ لیکن جدید دور کے اوائل میں یہ اپنے شمالی ہمسائے کے برعکس ایک معاشی قائد ہونے سے بہت دور تھا۔ یہ نتیجہ پہلے سے مقدر نہ تھا، اور سولھویں صدی تک دیر بعد، جنوبی نیدرلینڈز، شمالی نیدرلینڈز کی نسبت کامیاب ہونے کی بہتر پوزیشن میں تھا۔ کیا یہ ایک اتفاق تھا کہ ڈچ نے ہسپانوی اور کیتھولک غلبے سے چھٹکارا پالیا، جبکہ جنوبی نیدرلینڈز ہسپانوی ہیبر برگ حکومت کے تحت کیتھولک رہا؟ کیا یہ اتفاق ہے کہ ڈچ سنہری دور ایک ایسی صدی میں واقع ہوا، جو تحریکِ اصلاحِ کلیسا کی طرف سے لائی ہوئی بڑی ادارہ جاتی تبدیلیوں اور سپین سے آزادی کی جنگ کے بعد آئی؟

اس کتاب میں پیش کیا گیا ڈھانچہ یہ رائے دیتا ہے کہ یہ محض اتفاقات نہیں تھے، اگرچہ یہ ڈھانچہ ڈچ معاملے پر انگلیسی معاملے سے مختلف انداز سے لاگو ہوتا ہے۔ دونوں میں ایک فرق یہ تھا کہ جمہوریہ ڈچ بادشاہت نہیں تھی۔ ڈچ ریاستیں اقتدار میں شریک تھیں; کوئی مرکزی حکومتی تنظیم نہیں تھی۔ صوبوں کے ناظم اعلیٰ تھے، جنہیں سٹیڈ ہاوڈر (Stadhouder) کہا جاتا تھا، لیکن انتظام کے لحاظ سے وہ صوبائی پارلیمانوں کی نسبت کمزور تھا۔ ایک اور اہم فرق یہ تھا کہ بغاوت سے دو صدیاں بیشتر، ڈچ شہری معاشی اشرافیہ دیہاتی آقاؤں اور کلیسا کے زُعما کی نسبت زیادہ طاقتور ہوگئی، کیونکہ شہری دولت اور معاشی سرگرمیاں ڈچ معیشت کا ایک روز افزوں اہم حصہ بن گیا۔ 32 لہٰذا قبل از تحریک اصلاحِ کلیسا کے کھلاڑی ڈچ سیاست میں بھی وہی تھے، جیسا کہ

انگلستان میں تھے، اگرچہ اُن کی طاقتیں ایک دوسرے کی نسبت سے مختلف تھیں ; دونوں میں طاقت کلیسا، زمیندار اشرافیہ اور شہری معاشی اشرافیہ کے درمیان تقسیم شدہ تھی۔

بغاوت کے ابتدائی مراحل کے دوران ڈچ سیاسی صورتِ حال ڈرامائی طور پر تبدیل ہوگئی۔ اسی بغاوت نے خاص طور پر سٹیٹس جنرل (States General) کو متاثر کیا جو انگلیسی پارلیمان کی مانند ایک قانون ساز ادارہ تھا، جس نے شہری، اشراف اور مذہبی اشرافیہ کو مختلف ڈچ ریاستوں سے اکٹھا کیا۔ سٹیٹس جنرل 1406 کو وجود میں آئی، لیکن 1572 سے قبل ہیبرگ کے ماتحت نسبتاً غیر فعال تھی، جس کا اجلاس زیادہ سے زیادہ سال میں ساٹھ دن ہوتا تھا۔ ہیبرگ کی ماتحتی ہیں، مذہب، فوج اور خارجہ پالیسی کے معاملات اس کی عملداری میں نہیں تھے۔ تاہم 1572 میں، بغاوت نے سٹیٹس جنرل میں فعالیت کو مہمیز دی۔ اس وقت سے لے کر بعد تک، سٹیٹس جنرل کا اجلاس اوسطاً سال میں 200 دن کیلئے ہوتا تھا، اور 1593 کے بعد یہ مستقل بغیر وقفے کے اجلاس میں رہتی تھی (33) سٹیٹس جنرل نے 1579 میں اپنے کردار کو رسمی شکل دی، جب اس نے اپنے آپ کو یونین آف اکژیخٹ (Union of Utrecht) کے تحت دوبارہ، بطور اُن صوبوں کے ایک نئے اتحاد کے رابطہ کار ادارے کے، جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ (34) اگرچہ یونین آف اٹریخت ایک دفاعی اتحاد تھا، لیکن آخر کار اس نے سٹیٹس جنرل کے کردار کو، ایک کلی طور پر پروٹسٹنٹ رابطہ کار اور نئی تشکیل شدہ جمہوریہ ڈچ کیلئے ایک قانون ساز ادارے کے کردار کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اس چیز نے اسے غیر ملکی طاقتوں کے ساتھ گفت وشنید کرنے، معاہدات کو انجام تک پہنچانے، اپنے سکے ڈھالنے اور مرکزی حکومت کے اخراجات کو مختصر کرنے کا اختیار دے دیا۔ (35)

تحریکِ اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ نے بغاوت کے ابتدائی مراحل میں ایک مرکزی کردار ادا کیا۔ (36) تحریکِ اصلاح کلیسا نے زیریں ممالک میں 1520 کی دہائی تک اپنے قدم جما لئے۔ اس وقت تک طباعت زیریں ممالک کے بہت سے شہروں میں پھیل چکی تھی..... اینٹورپ منطقی طور پر یورپ میں سرکردہ تجارتی شہر تھا..... اور پروٹسٹنٹ اپنے پروپیگنڈے کی طباعت مقامی طور پر کرتے تھے۔ مقدس رومی سلطنت کے بہت سے حصے کی مانند، تحریکِ اصلاحِ کلیسا مطبوعہ مواد کے ذریعے بنیاد سے اوپر کی طرف پھیلی، بجائے اوپر سے پھیلنے کے جیسا کہ



انگلستان میں ہوا۔ لیکن اس کے ابتدائی پھیلاؤ کے بعد ہسپانویوں نے تحریک کو کئی دہائیوں تک اسے تشدد کے ذریعے دبائے رکھا۔ چارلس پنجم نے، جو بطور ہسپانوی بادشاہ اور مقدس رومی شہنشاہ دونوں کے خدمات انجام دے رہا تھا، کتابوں پر پابندی لگائی، وعظوں کو اور لوتھر کی تحریروں کو روکا (37) کا سینکڑوں کتابوں کے جلانے کا حکم دیا، 1522 میں ایک ریاست کے تحت بازپُرس کا حکم دیا، اور برسلز میں 1523 میں دُنیا کے پہلے پروٹسٹنٹ شہید کو جلا کر موت کے گھاٹ اُتروایا۔ بطور کل ہسپانوی نے 2000 پروٹسٹنٹ کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ (38)

یہ واقعات سولھویں صدی کے نصف آخر کے واقعات کا اہم پیشِ خیمہ تھے۔ 1550 کی دہائی تک، مختلف جگہوں نے ہسپانوی بادشاہت کو، باوجود نئی دُنیا سے سونے اور چاندی کے بہاؤ کے، ایک نازک صورتِ حال میں لا کھڑا کیا۔ اس کے جواب میں، اُنہوں نے زائد محصولات کیلئے نیدرلینڈز کا رُخ کیا، ٹیکسوں کو بڑھاتے ہوئے اور قرضوں کی واپسی میں ناکام ہوتے ہوئے۔ بلاتعجب اس چیز نے بغاوت کے بیجوں کی آبیاری کی۔ فلپ دوم، چارلس پنجم کے بیٹے کی طرف سے کیلوینسٹوں کو قتل کرنے اور کیلوینسٹوں کی عبادت پر پابندیاں لگانے کیلئے مزید پُکاروں نے، 1560 کی دہائی میں بغاوت کے پہلے مرحلے کو چنگاری دکھانے میں مدد دی۔ کیتھولک کلیسا نے کیتھولک ہسپانویوں کی طرف داری کی..... جو ''سچے کیتھولک مذہب کے محافظ'' ہونے کا دعویٰ کرتے تھے..... اور اس طرح اُن لوگوں کیلئے جن کا بغاوت میں معاشی مفاد تھا، کلیسا کو معاشی اور مذہبی جبر کے ایک آلہ کار کے طور پر پیش کرنا آسان ہوگا، نتیجتہً، بغاوت کے ابتدائی سالوں میں شمالی نیدرلینڈز میں کئے جانے والے اولین اقدامات میں کلیسا کے اخراج اور اس کی دولت کی ضبطی شامل تھے۔ کیتھولک مخالف تشدد کے حملے عام ہوگئے، اور ہنگامہ کاروں نے کیتھولک آثار کو تباہ کر دیا جن کو توہمائی چیزیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس بغاوت سے نقصان اُٹھانے والے صرف کیتھولک ہی نہ تھے۔ بہت سے اشراف اور گلڈ کی تحفظ یافتہ صنعت ں نے اپنے مقدروں کو کیتھولک ہسپانوی حکومت کے پلڑے میں ڈال دیا..... اور اس طرح اپنے حتمی نقصان کو آواز دی۔ 39

شہری لوگ بغاوت کے پیچھے قوتِ محرکہ تھے، اور اُنہوں نے ہسپانویوں سے آزادی کا کئی اسباب کی بنا پر فائدہ اُٹھایا۔ اول، پروٹسٹنزم، تاجر برادری میں جنوبی نیدرلینڈز میں تیزی سے

پھیلا، لہٰذا بہت سے جنوبی تاجر، جبر اور اپنی جائیداد کی ضبطی سے بچنے کیلئے شمالی نیدرلینڈز منتقل ہوگئے۔ دوم، پروٹسٹنٹوں کے بارے میں ہسپانوی پالیسی اُن غیر ملکی تاجروں کے ساتھ تعلقات، جو پروٹسٹنٹوں سے ہمدردی رکھتے تھے، کیلئے خطرہ بن گئی۔ سوم شہر کے زُعما کیلئے تحریکِ اصلاح کلیسا کی حمایت کرنے میں براہِ راست مالی ترغیب تھی: اس کی کامیابی سے شہروں اور صوبوں نے وسیع کلیسائی جائیدادیں حاصل کیں۔ چہارم، جب ایک مرتبہ بغاوت شروع ہوگئی، تو اب اس کے ناکام ہونے کی صورت میں شہریوں کی شہریت اور معاشی خودمختاری کی سہولیات داؤ پر لگ جاتیں۔ پنجم اور اہم ترین بات، کہ اس بغاوت نے شہری اشرافیہ کو سٹیٹس جنرل کے اندر سیاسی بالادستی عطا کی۔

تحرکِ اصلاح کلیسا نے شہری معاشی اشرافیہ کو قدیم اشراف کے محافظ اور کلیسا کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے کیلئے، ضروری محرک، شکایات اور پروپیگنڈا مہیا کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کا بغاوت میں کردار نسبتاً کم ہوتا گیا: جب ایک مرتبہ ہسپانویوں کے ساتھ ابتدائی جنگ کامیاب ہوگئی، تو معاشی اور سیاسی محرکات زیادہ اہم ہوگئے۔ (40) تاہم، جیسا کہ انگلستان میں ہوا، تحریک اصلاحِ کلیسا سے حاصل ہونے والی ادارہ جاتی تبدیلیاں آخر کار بہت اہم ثابت ہوئیں...... ان واقعات نے ڈرامائی اور مستقل طور پر طاقت کو مذہبی حاکمیت سے معاشی اشرافیہ کی طرف منتقل کر دیا۔ ڈچ جمہوریہ میں، نتائج انگلستان کی نسبت بھی زیادہ واضح تھے۔ انگلستان کے برخلاف، جہاں تحریک اصلاح کلیسا کے بعد بھی زمیندار اشرافیہ نے اپنی بہت سی طاقت کو بحال رکھا، ڈچ اشرافیہ نے بغاوت کے بعد اپنی بہت سی طاقت کھودی۔ لہٰذا بغاوت کی حتمی کامیابی کا مطلب یہ تھا کہ ڈچ معاشی اشرافیہ نے ایسی سیاسی طاقت حاصل کرلی جو یورپ میں کسی بھی اور جگہ کی، نسبت بے مثال تھی۔ اس نکتے پر، جین ڈی ورائز (Jan de Vries) اور ایڈوین ڈیرواؤڈ (Ad van der wourd) (1997، صفحہ 165) یہ استدلال کرتے ہیں کہ بغاوت:۔

''صوبائی ریاستوں میں سیاسی نمائندگی کی ایسی تبدیلی پر منتج ہوئی، جو ایسی صورتِ حال سے جس میں بغاوت سے پہلے شہروں کو اشراف اور (عام طور پر) اہلِ کلیسا کے ساتھ طاقت کو تقسیم کرنا پڑتا تھا، ایک ایسی صورتِ حال میں جس میں بغاوت نے اہلِ کلیسا کو رسمی سیاسی طاقت سے خارج کر دیا تھا اور اشراف نے (جن میں سے بہت سے تاج اور کلیسا کے وفادار رہے) اپنا بہت



سا اثر ورسوخ کھو دیا تھا۔''

ڈی ورائز اور وین ڈیرواوڈ (صفحہ 168) آگے بڑھتے ہوئے یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ یہ تبدیلیاں، تحریکِ اصلاح کلیسا کے جمہوریہ ڈچ میں آنے کا براہِ راست نتیجہ تھیں:۔

''تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بغیر سیاسی تعلقات اس قدر مضبوطی سے شہروں کے حق میں تبدیل نہ ہوتے اور سیاسی ڈھانچے میں یہ اس تبدیلی نے ایک ایسی ریاست کو بنیادی مضبوطی عطا کی، جس میں شاہی خاندان کے اہداف عام طور پر اُن اہداف کے تابع رہتے جو ایک شہری نائب السلطنت اشرافیہ کے ہوتے، جو معاشی مفادات کے بارے میں اپنی حساسیت کو کلی طور پر کبھی بھی خیر باد نہ کہتی۔''

یہ محرکات ڈچ ریاست ذی لینڈ میں بہت نمایاں پر واضح تھے جہاں ڈی ورائیز اور وین ڈیر واؤ (صفحہ 8-507) وضاحت کرتے ہیں:

''بغاوت سے پہلے ذی لینڈ کی ریاست تین مختلف طبقات پر مشتمل تھی مڈل برگ کا صدر راہب، زی لینڈ کے اشراف، اور شہر...... جن میں سے ہر ایک واحد ووٹ کا حقدار تھا۔ تحریکِ اصلاح کلیسا نے اپنے اختیار کے صدر راہب کو فارغ کر دیا۔ کیونکہ ذی لینڈ کے زیادہ تر اشراف نے فلپ ثانی کے مقصد کو انتخاب کیا تھا، لہٰذا وہ بھی، صوبائی ریاستوں میں اپنی شراکت کے حق سے محروم ہوگئے...... [ذی لینڈ کے شہر] اس عمل میں بڑے جیت کار تھے۔''

بغاوت کے بعد شہری معاشی اشرافیہ کے عروج نے اُس طریقے کو بدل دیا جس میں حکومت اپنی مالیات کا انتظام کرتی تھی۔ 1572 میں سٹیٹس جنرل کے اپنا پہلا ''آزادانہ'' اجلاس منعقد کرنے کے بعد، غالب شہری مفادات نے ٹیکس کے بوجھ کے زیادہ منصفانہ حصے کو، مختلف صنعتوں اور شہری اور دیہاتی علاقوں میں عائد کر دیا۔ 1574 سے پہلے شہری زیادہ تر ٹیکس ادا کرتے تھے اور صرف چند اشیا پر ٹیکس عائد ہوتا تھا، جیسا کہ بیئر، شراب اور کوئلے پر (41)۔ 1574 میں ٹیکس کی حامل اشیا کی تعداد بڑھ گئی اور شہری اور دیہاتی مفادات نے ٹیکس کے بوجھ کا ایک زیادہ مساوی حصہ ادا کیا۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ اس سے پہلے شہری معاشی اشرافیہ وفاقی ٹیکس کے بل کی ایک غیر متناسب مقدار ادا کرتے تھے اس وسیع شدہ ٹیکس کی بنیاد کے معاشی نتائج بہت زیادہ تھے۔ ڈچ حکومت بغاوت کے بعد فی فرد بہت زیادہ ٹیکس جمع کر سکتی تھی۔

www.MashalBooks.org

کیونکہ یہ چھوٹے انتہائی غیر مرتکز ٹیکس کے علاقوں کو استعمال کرتی تھی۔ اور اس کا اوسط ٹیکس کا بوجھ جو بغاوت کے شروع میں آمدنی کا چھ فیصد تھا، بڑھ کر 1630 تک بیس فیصد تک ہو گیا۔ اس بات کے پیشِ نظر کہ آبادی اور فی کس مجموعی قومی پیداوار بلند ہو رہی تھیں، اس دور میں مجموعی ٹیکس کے محصولات دھماکہ خیز انداز سے بڑھے۔ (42) ٹیکس کے محصولات میں اضافے نے ڈچ حکومت کو کم شرحوں پر قرض حاصل کرنے کا موقع دیا، کیونکہ سرمایہ کار ایک تحفظ محسوس کرتے تھے یہ حکومت کے اندر اُنہیں واپس ادا کرنے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا ایک مثبت ردِعمل کی قوس اُبھری، ڈچ حکومت کی اضافہ شدہ مالی صلاحیت نے زیادہ محصولات کے حصول کی گنجائش پیدا کی اور محصولات نے کاروبار کو مزید تحریک دی۔ جوابی طور پر زیادہ کاروباری محصولات نے ٹیکس کی بنیاد کو مزید بڑھایا اور قرض لینے کے نقصان کو کم کیا۔ یہ خصوصیات ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتی ہیں جس نے ڈچ سنہرے دور کے سترھویں صدی کے آخر تک قائم رہنے کی گنجائش پیدا کی۔

ڈچ معاملے کے کئی ایسے پہلو تھے، جن پر اس کتاب میں پیش کئے گئے ڈھانچے کا اطلاق نہیں ہوتا۔ حقیقت میں کوئی مرکزی ڈچ ''بادشاہ'' نہیں تھا: سٹیڈ ہارڈر کے پاس انگریز، فرانسیسی یا ہسپانوی بادشاہ کی طاقت نہیں تھی۔ لیکن گزشتہ ابواب میں پیش کئے گئے بنیادی خیالات صحیح ہیں: جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ، معاشی اشرافیہ کی طاقت بمقابلہ مذہبی حاکمیت، زمیندار اشرافیہ، فوج اور طاقت کے دوسرے ذرائع ہے۔ انگلیسی معاملے میں، معاشی اشرافیہ کی مقابلاتی طاقت اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ وہ اس اتحاد کا حصہ تھے، جو بادشاہ کو حکمرانی کی توسیع دیتا تھا، اور اُسے اپنے انتظامی اختیارات کو اس طریقے پر استعمال کرنے کی ترغیب دیتا تھا: جو اُس کے مفادات سے مطابقت رکھتا ہو..... تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد انگلیسی معاشی اشرافیہ کی بہتر پوزیشن نے بالواسطہ طور پر کاروباری نتائج کو بہتر بنایا، کیونکہ اس عمل نے اُن ترغیبات میں تبدیلیوں کے ذریعے کام کیا جن کا سامنا بادشاہ کو تھا۔ ڈچ معاملے میں، مذہبی، فوجی، معاشی اور زمیندار اشرافیاؤں کے امتزاج نے مل کر انتظامی طاقت کو آپس میں تقسیم کیا، لہٰذا معاشی اشرافیہ کی اضافہ شدہ طاقت، مذہبی اور زمیندار اشرافیہ کی قیمت پر، معاشی نتائج کی براہِ راست بہتری پر منتج ہوتی۔

کتاب کا ڈھانچہ یہ رائے دیتا ہے کہ معاشی اشرافیہ کی طرف اضافہ شدہ سیاسی طاقت کی تبدیلی ایسے قوانین اور پالیسیوں پر منتج ہوتی ہوگی، جنہوں نے کاروباری سرگرمیوں کی سطح کو



بڑھایا ہوگا۔ غالباً اس کی مشہور ترین مثال سٹیٹس جنرل کی طرف سے یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی (VOC) اور ویسٹ انڈیا کمپنی (Wic) کا قیام تھا..... یہ اجازت نامے کی حامل مشترکہ سرمایہ کمپنیاں تھیں، جنہیں ریاست کی پُرزور پُشت پناہی حاصل تھی..... جو اُس وقت ایک انقلابی تنظیمی شکل تھی۔ وی او سی اور ڈبلیو آئی سی کے اجازت ناموں میں ایک بڑے پیمانے پر تجارتی اور فوجی مہمات کا تصور شامل تھا، جن کا ہدف ڈچ معاشی اور عسکری طاقت کو پوری دُنیا میں توسیع دینا تھا۔ اگرچہ ان کمپنیوں نے کسی حد تک آزادی کو برقرار رکھا لیکن یہ سفارت کاری کرنے، معاہدات پر دستخط کرنے، اتحاد بنانے، اسلحہ مہیا کرنے، اور قلعے تعمیر کرنے کیلئے سٹیٹس جنرل پر بھاری انحصار کرتی تھیں۔ (43) ان کمپنیوں میں حصص نے ایک بھاری ثانوی مارکیٹ کے جنم میں سہولت کاری کی، جس نے جوابی طور پر ایمسٹرڈیم کو سترھویں صدی کے آغاز کی دُنیا کی سرکردہ سرمائے کی مارکیٹوں میں سے ایک بنا دیا۔ (44) (ایمسٹرڈیم میں) سترھویں صدی کے آغاز میں وی او سی اور ڈبلیو آئی سی کے حصص کی فراہمی کے نتیجے میں، ایمسٹرڈیم میں پہلی ''جدید'' مارکیٹ برائے مستقبل اور انتخابات قائم ہوئی۔ (45)

معاشی اشرافیہ، مقامی سیاست پر بھی حاوی ہو گیا، جہاں، شہر انفرادی طور پر ایسی پالیسیوں کو اختیار کرنے میں آزاد تھے جو کاروبار کیلئے نفع مند ہوں۔ بہت سے شہروں نے عوامی بہتری کی چیزوں میں سرمایہ کاری کی جیسا کہ نہروں اور اندرونِ ملک ذرائع نقل وحمل میں۔ 1660 کی دہائی تک ڈچ قوم کے ہاں یورپ کی سب سے زیادہ فعال اندرونِ ملک کی نقل وحمل تھی۔ اگرچہ بعض اوقات نجی پارٹیاں بھی ان اشیاء میں رقوم فراہم کرتی تھیں، لیکن سٹیٹس جنرل اُن کی دیکھ بھال میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ ذرائع نقل وحمل میں بہتری کا جمہوریہ ڈچ کو، خاص طور پر ایمسٹرڈیم کو، سترھویں صدی کی بین الاقوامی تجارت کا مرکز بنانے میں اہم کردار تھا۔ (46) شہروں نے غریبوں کی مدد کا کنٹرول بھی سنبھال لیا۔ جس سے وہ کارکن غریب لوگوں اور عارضی طور پر بیروزگار ہونے والوں کو مدد فراہم کرتے تھے۔ سترھویں صدی میں جمہوریہ ڈچ میں آنے والے بے شمار لوگوں نے، یہ رائے دی کہ ڈچ قوم کے غریبوں کی مدد اور خیراتی نظام انتہائی موثر اور انسانی ہمدردی پر مبنی تھے، بہ نسبت باقی ماندہ یورپ کے (47) تحریکِ اصلاح کلیسا نے مزدوروں کی مارکیٹ کو بھی زیادہ براہِ راست انداز سے متاثر کیا: کیلوینسٹ کلیساؤں نے اُن تمام

ولیوں کے ایّام کو ختم کر دیا، جو کیتھولک کلیسا کی طرف سے پروان چڑھائے گئے تھے، اور اس طرح کام کے سال میں 15 فیصد کا اضافہ کر دیا۔(48)

ان اقدامات کی وجہ سے، ڈچ معیشت بغاوت کے بعد بہت ترقی کر گئی۔ حقیقی معاوضہ جات ڈچ جمہوریہ میں باقی ماندہ یورپ کی نسبت بہت تیزی سے بڑھنے لگے، حقیقی معاوضہ جات نیدرلینڈز اور انگلستان کے نسبتاً خوشحال جنوبی علاقوں میں بھی اُنیسویں صدی کے آغاز تک یکساں نہ ہو سکے۔ اس عرصے میں ڈچ آبادی دُگنا سے بھی زیادہ ہوگئی اور دیہاتوں سے شہر بننے کی شرح جو 1525 میں 32-31 فیصد تھی، 1675 میں بڑھ کر 45 فیصد تک ہوگئی۔ دوسب سے زیادہ شہر رکھنے والے صوبوں ہالینڈ اور ذی لینڈ میں، متعدد شہروں کے اضافے کی شرمیں، پوری بغاوت کے دوران، ایک فیصد سالانہ سے زیادہ تھیں، جو کہ قبل جدید دور میں ایک غیر معمولی تعداد ہے اور زیادہ تر ڈچ شہروں میں غیر معمولی طور پر زیادہ معاوضہ آبادی کا ایک چوتھائی ایسے شہروں میں رہتی تھی، جن کی آبادی کم از کم 10,000 تھی؛ یہاں تک کہ انگلستان میں بھی اُس وقت تک یہ تعداد دس میں سے ایک سے بھی کم تھی۔ 49 اُنیسویں صدی کے وسط سے انگلستان ڈچ جمہوریہ کے سنہرے دور کی شہر کاری کی شرح تک نہ پہنچ سکا۔

**جدول 7.3:** 1647-1570 ڈچ بغاوت کے دوران ہالینڈ اور ذی لینڈ میں شہری آبادی میں اضافہ

| | 1570 | 1647 | فی سال% تبدیلی |
|---|---|---|---|
| ایمسٹرڈیم | 30,000 | 140,000 | 2.02% |
| لیڈن | 15,000 | 60,000 | 1.82% |
| ہارلیم | 16,000 | 45,000 | 1.35% |
| مڈل برگ | 10,000 | 30,000 | 1.44% |
| روٹرڈیم | 7,000 | 30,000 | 1.91% |
| ڈیلفٹ | 14,000 | 21,000 | 0.53% |
| ڈورڈریخٹ | 10,000 | 20,000 | 0.90% |



| | | | |
|---|---|---|---|
| این خوی زن | 7,500 | 18,000 | 1.14% |
| داہیگ | 5,000 | 18,000 | 1.68% |
| گاوڈا | 9,000 | 15,000 | 0.67% |
| ہورن | 7,000 | 14,000 | 0.90% |

**ذریعہ:** اسرائیل (1995، صفحہ 328)

حقیقی معاوضہ جات میں یہ تیز اضافہ بڑی حد تک پیداواریت میں بہتریوں کی وجہ سے تھا۔ بلاشبہ جمہوریہ، سترھویں اور اٹھارویں صدیوں کے بیشتر حصے تک سب سے زیادہ پیداواری یورپی معیشت تھی۔(50) بغاوت کے دوران، ڈچ شہروں نے جنوبی نیدرلینڈز سے اعلیٰ مہارت یافتہ کارکن بھرتی کئے، جو جمہوریہ کے نسبتاً محفوظ تر پناہ گاہوں کی تلاش میں جنوب کی طرف بھاگ گئے تھے۔ نقل مکانی، ڈچ جمہوریہ میں ''امیر تجارت'' کو لے کر آئی؛ فلیمش منقش کپڑے کے پارچہ باف اور ماہر ایمسٹرڈیم، لیڈن، گاوڈا، مڈل برگ اور ڈیلفٹ کی طرف ہجرت کر گے تا کہ اپنی مصنوعات کو دوبارہ قائم کر سکیں، وہ ''نئے پارچہ جات'' جو اُنہوں نے تیار کئے، ڈچ سنہرے دور کے خاص صنعتی مصنوعات تھیں۔ (51) پروٹسٹنٹ جرمن بھی پُرتشدد تیس سالہ جنگ (1618-1648) کے دوران جمہوریہ ڈچ کی طرف بھاگ گئے اور اس طرح اُنہوں نے مہارت یافتہ کارکنوں کی تعداد میں مزید اضافہ کر دیا۔ ڈچ قوم نے دوسرے شعبوں میں بھی برتری حاصل کی۔ ڈچ ماسیلیاتی انجنیری اور قلعہ بندی اور بندرگاہوں کی تعمیر، سترھویں صدی میں یورپ کے لئے رشک کا باعث تھے۔ بہت حد تک زیریں ممالک کے منفرد جغرافیے اور زمین اور دفاع کی اضافہ شدہ طلب کی وجہ سے۔(52)

سنہرے دور نے بین الاقوامی مارکیٹوں میں اشیا اور پیداواری عوامل کے سلسلے میں ڈچ غلبے کے ظہور کا مشاہدہ کیا سرمایہ وافر تھا، اور سود کی شروح کم رہیں، جس نے ڈچ صنعت اور کاروباری تنظیم کو اُبھارا۔ آسان انتقال ملکیت و انتقال جائیداد کی گنجائش پیدا کرنے والے حقوق مالیت نے ڈچ مزدوروں کی مارکیٹ کو سہارا دیئے رکھا، اور نقل و حرکت کو ایک ایسے طریقے سے سہولت دی جو انگلستان میں بھی نہیں دیکھا گیا۔(53) سنہرے دور کے اختتام تک ڈچ جمہوریہ ایک سرکردہ

www.MashalBooks.org

سرمایے کا مرکز بھی تھا۔ اس طرح کہ ایمسٹرڈیم تمسکات ادائیگی کیلئے یورپ کا بنیادی حساب خانہ تھا۔ تجارت اور مالیات میں جمہوریہ کی مرکزیت نے اسے معلومات کے بہاؤ کا بھی مرکز بنا دیا۔ جس نے جوابی طور پر اس کی مرکزی معاشی حیثیت کو اور بھی مضبوط بنا دیا۔ (54)

لیکن ڈچ کی کامیابی ہمیشہ رہنے کیلئے مقدر نہیں تھی۔ اُن میکانیوں نے جنہوں نے اسے ایک معاشی اُڑان دی، لازمی طور پر اس اُڑان کو ہمیشہ کیلئے قائم نہیں رکھتا تھا۔ سنہرا دور ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصے تک رہا، جس کے بعد انگلستان ڈچ جمہوریہ سے آگے نکل گیا۔ 1670 کی دہائی کے بعد، شہرکاری اور آبادی میں اضافہ رُک گئے یا پیچھے کی طرف مُڑ گئے جیسا کہ فی کس آمدنی کے ساتھ بھی ہوا..... اگرچہ وہ باقیماندہ یورپ کی نسبت پھر بھی زیادہ ہی رہے۔ نیدرلینڈز صنعت کاری میں بھی تاخیر کا شکار رہا: بلجیم، جو ڈچ بغاوت کے بعد اپنے شمالی ہمسائے سے پیچھے رہ گیا، نے صنعت کاری جلدی کر لی، اور آخرکار نیدرلینڈز سے پیداوار اور دولت میں آگے نکل گیا۔ (55) نیدرلینڈز کی صنعت کاری کی نسبتاً سُستی کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ اپنی ہی کامیابی کا شکار تھا: ''سنہرے دور'' کی صدی کے دوران معاشی خصوصی مفادات ظہور پذیر ہوئے۔ اس کا نتیجہ ایسے صنعتی ضوابط تھے، جنہوں نے نو واردوں کیلئے رُکاوٹیں پیدا کیں۔ ایسے حفاظتی اقدامات تھے، جنہوں نے غیرملکی مارکیٹوں تک رسائی کم کر دی۔ اُمراشاہی کی حکمران اشرافیہ دوسرے معاشرتی گروپوں سے کٹ گئی، اور ایک قدامت پرستانہ ٹیکس کا نظام، جو صرف ٹیکس کے ایک مختصر طبقے کے مفادات کو پورا کرتا تھا۔ (56) اگرچہ ان مفادات نے سنہرے دور کے پہلے حصے میں ڈچ معیشت کی اچھی خدمت انجام دی، لیکن اُن میں صنعتکاری سے پیدا شدہ تخلیقی تباہی کو روکنے کی ترغیب پائی جاتی تھی۔

تاہم، سنہرے دور کے درمیان ڈچ معیشت کی ترقی نے نیدرلینڈز کو ایک ایسی پوزیشن میں لا کھڑا کیا، جہاں اگرچہ یہ صنعتکاری میں پیچھے رہ گیا، لیکن یہ اٹھارویں صدی تک یورپ کی سب سے زیادہ پیداواری معیشت رہا، اور اُنیسویں صدی کے اختتام تک دوسری صنعتی معیشتوں کے ساتھ مثبت انداز سے مقابلہ کرتا رہا۔ (57) زیادہ برمحل بات یہ ہے کہ، یہ حقیقت کہ نیدرلینڈز: صنعتکاری میں تاخیر کا شکار رہا، اس کتاب کے بنیادی استدلال کی نفی نہیں کرتی۔ یہ کتاب اُن مختلف ادارہ جاتی میکانیوں پر اپنی توجہ مرکوز کرتی ہے۔ جنہوں نے جدید معاشی ترقی کو



مغربی یورپ کے بعض حصوں اور مشرقِ وسطیٰ میں ممکن یا ناممکن بنایا۔ سترھویں صدی تک، نیدرلینڈز واضح طور پر ایک ایسی راہ پر پڑ چکا تھا جس پر جدید معاشی ترقی ممکن تھی۔ اور یہ تبدیلی بغاوت اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا سے پیدا ہونے والے ڈچ اداروں میں وسیع تبدیلیوں کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ ڈچ نے اس راستے کو انجام تک پہنچتے ہوئے کیوں نہ دیکھا، یہ ایک کلی طور پر مختلف مطالعے کا موضوع ہے۔

www.MashalBooks.org

# جدید معیشت کے نقیب

1500 میں، یہ چیز بالکل واضح نہیں تھی کہ اگلی چار صدیوں کی معاشی دُنیا اپنا مرکز، شمالی مغربی یورپ کی دو چھوٹی اقوام میں پائے گی۔ لیکن سولھویں صدی انگلستان اور ڈچ جمہوریہ میں بڑی ادارہ جاتی تبدیلی کی صدی تھی..... دونوں نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو قبول کیا..... انگلستان میں ہنری ہشتم نے تحریکِ اصلاح کلیسا کو شاہی خاندانی اسباب کی بنا پر اسے لاگو کیا، جبکہ ڈچ تحریک اصلاحِ کلیسا، ہسپانوی اقتدار کے خلاف بغاوت سے گہرے طور پر گندھی ہوتی تھی۔ اگرچہ دونوں اقوام کی مخصوص تواریخ میں اختلافات تھے۔ لیکن دونوں میں ایک بہت اہم مشابہت تھی: تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد کی دُنیا میں، معاشی اشرافیہ نے، کلیسا کی قیمت پر سیاسی طاقت حاصل کی، اس سے پیدا ہونے والے ادارہ جاتی انتظامات نے ایک ایسے ماحول کو پروان چڑھایا جہاں کاروبار دوست پالیسیاں ایک معمول تھیں، انگلستان میں پارلیمان میں معاشی مفادات کو کلیسا اور تاج کے مقابلے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی، جبکہ جمہوریہ ڈچ میں، شہری معاشی اشرافیہ روز افزوں، قومی اور مقامی سطح پر سب سے زیادہ اہم سیاسی پالیسی سازوں میں شمار ہونے جا رہی تھی۔

1600 تک، اس ادارہ جاتی تبدیلی نے انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں قوانین اور پالیسیوں کو متاثر کیا۔ یقیناً دونوں اقوام میں بُرائیاں باقی رہیں، اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ تبدیلی باقی رہے گئی..... انگلستان میں خانہ جنگیاں اور 1689 میں شاندار انقلاب؛ اور ڈچ جمہوریہ میں سپین کے ساتھ اسی سالہ جنگ۔ اور ادارہ جاتی تبدیلی نے مستقل معاشی غلبے کی ضمانت نہ دی: ڈچ جمہوریہ نے اپنی عالمی معاشی برتری کو اٹھارویں صدی میں انگلستان کے ہاتھوں کھو دیا، اور انگلستان نے اپنی برتری کو بیسویں صدی میں رہا ستہائے متحدہ کے ہاتھوں کھو دیا۔ لیکن نکتہ یہ نہیں ہے اُن دوسری قوموں کے برعکس جنہوں نے کبھی عالمی معیشت پر غلبہ حاصل کیا، ڈچ جمہوریہ اور



انگلستان کی طرف سے لائی جانے والی معاشی دُنیا واضح طور پر جدید تھی۔ اسی طرح کہ قوانین اور پالیسیوں پر اختیار روز افزوں طور پر، فوجی اور مذہبی اشرافیاؤں کی بجائے غیر مرتکز معاشی اور سیاسی اشرافیاؤں کے قالب میں مرتکز ہو گیا تھا۔ اس بات کو سمجھنا کہ یہ کیسے واقع ہوا اس قابل ہے کہ اس کا بیڑا اُٹھایا جائے، کیونکہ اس کا حتمی نتیجہ جدید معیشت تھی:۔ ایک ایسی معیشت جس نے غربت کو کم کیا، تمام طبقات کے لوگوں کیلئے معیارِ زیست میں اضافہ کیا، اور ایک ایسے ماحول کو پروان چڑھایا جہاں مستقل ادارہ جاتی اور ٹیکنالوجیاتی تبدیلی بجائے ایک استثنا کے ایک معمول تھا۔

کامیاب ریاستوں کی تاریخوں کا یہ دیکھنے کیلئے تجزیہ کرنا کہ کیا صحیح ہوا، ایک چیز ہے؛ ایسی ریاستوں کا تجزیہ کرنا جو کبھی کامیاب تھیں لیکن آخرکار جامد ہو گئیں، بالکل ایک دوسری چیز۔ اگر علیحدہ سے تجزیہ کیا جائے، تو یہ بات واضح نہیں ہوتی۔ کہ ''راستے پر منحصر'' واقعات کا سلسلہ، جو انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کی حتمی کامیابیوں کیلئے اس قدر اہم تھا، واقعی اتنا اہم تھا، جتنا کہ وہ تھا۔ اس بات کا سمجھنا بھی بالکل اتنا ہی ضروری ہے، کہ ایسی ہی ادارہ جاتی تبدیلیاں دُنیا کے بہت سے حصوں میں کیوں واقع نہ ہوئیں..... خاص طور پر اُن حصوں میں جو تاریخ کے کسی لمحے پر، ایک ایسی معاشی پوزیشن میں تھے جہاں ایسی تبدیلیاں قابل عمل تھیں۔ اس کتاب میں پیش کئے گئے استدلال اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا..... اور قدرے کم تر حد تک، بعد از تحریک اصلاحِ کلیسا کی کیتھولک دُنیا میں..... مذہبی جواز بخشی اقتدار کی اہمیت نے اس قسم کی کاروبار دوست تبدیلیوں کی حوصلہ شکنی کی جو انگلستان اور ڈچ جمہوریہ میں دیکھی گئیں۔ اُس زیادہ قدر و قیمت کے پیشِ نظر جو مذہبی جواز بخشی اقتدار کو دی گئی، مسلمان اور کیتھولک حکمرانوں کیلئے، یہ بات مہنگی اور غیر ضروری ہوتی کہ وہ معاشی اشرافیہ کے حق میں قوانین اور حقوق سے دستبردار ہو جاتے، اگلا باب یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ منطق، کیتھولک سپین اور مسلمان سلطنتِ عثمانیہ کے ادارہ جاتی اور معاشی مقدروں پر بہت زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ جو کہ دو ایسی ریاستیں ہیں، جو 1500 سے معاشی اور فوجی طاقت ہیں شمال مغربی یورپ کا مقابلہ کرتی رہیں۔

www.mashalbooks.org

# (8)

# جمود: سپین اور سلطنتِ عُثمانیہ

اگر سولھویں صدی کے وسط میں کسی باخبر شخص سے یہ پوچھا جاتا کہ، اس وقت سے دو صدیوں بعد کونسی قوم تیز رفتار اور پائیدار معاشی ترقی کے عمل سے گزرے گی، تو یقیناً انگلستان کے بارے میں اندازہ نہ لگاتا، اور اگرچہ شاید وہ نیدرلینڈز کے بارے میں اندازہ لگالیتا، تو وہ ترقی کے مرکز کے طور پر جدید دور کے بلجیم کی شناخت کرتا۔ زیریں ممالک بہرحال ہسپانوی مقبوضہ علاقے تھے، لہٰذا ہسپانوی تجوریوں میں بہت زیادہ دولت اُنڈیلی جاتی ہوگی۔ بلاشبہ، دو بہت معقول اندازے، جو سیاسی جغرافیائی حالات پر مبنی ہوتے، وہ ہسپانوی اور عثمانی سلطنتوں کے بارے میں ہوں گے۔ یہ دونوں سلطنتیں، منطقی طور پر سولھویں صدی کی دو مضبوط ترین سیاسی وجود تھے ہسپانوی سلطنت آج تک دُنیا میں پہنچائی جانے والی سب سے بڑی سلطنت بن گئی، جس میں ریاستہائے متحدہ کا بڑا حصہ، میکسیکو، وسطی امریکا، متعدد کریبین جزائر، جنوبی امریکا کا مغربی نصف، فلپائن، جنوبی اٹلی، زیریں ممالک اور مراکش کے کچھ حصے شامل تھے (دیکھئے شکل 8.1) اپنے عروج پر، سلطنتِ ہسپانیہ دُنیا کے قابل ذکر 13.9 فیصد حصے کو محیط تھی..... جو اپنے وقت کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور جدید دور کے اوائل میں صرف روس اور برطانیہ سے پیچھے تھی۔ (دیکھئے جدول 8.1) سونا اور چاندی امریکاؤں میں ہسپانوی نوآبادیات سے بہے چلے آتے تھے، اور زیریں ممالک میں اس کے مقبوضات دُنیا کے معاشی طاقت کے مراکز میں شمار ہوتے تھے۔ اسی اثنا میں، سلطنتِ عثمانیہ پوری صدی کے دوران پھیلتی رہی، اور آخر کار اس کی حکومت، شمالی افریقی ساحل کے بہت بڑے حصے پر، جزیرہ نما کے عرب، جزیرہ نمائے بلقان اور زیادہ تر



مشرقِ وسطیٰ پر قائم ہوگئی۔ ان مقبوضات کے حصول نے عثمانیوں کو مشرق اور مغرب کے درمیان اہم کاروباری علاقے پر کنٹرول کے قابل بنادیا۔ بشمول بحر احمر اور خلیج فارس کے کچھ حصوں کے .....ساتھ ہی ساتھ مشرقی بحیرہ روم اور بحر اسود کے۔ ہسپانوی اور عثمانیہ سلطنتیں اپنی عملداریوں اور تجارتی ترقیوں کو ایک طویل مدتی معاشی پیش قدمی میں کیوں تبدیل نہ کرسکیں؟ سولھویں صدی کے تناظر سے اس سوال کا جواب واضح نہیں تھا۔

**شکل 8.1:** سولھویں صدی میں ہسپانوی اور عثمانی سلطنتیں

**جدول 8.1:** جدید دور کے اوائل میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنتیں

| سلطنت | سب سے زیادہ علاقہ (ملین کلومیٹرز) | دُنیا کی قابل سکونت زمین کا فیصد |
|---|---|---|
| برطانوی | 36.6 | 26.8% |
| روسی | 22.8 | 16.7% |
| ہسپانوی | 19.00 | 13.9% |
| جنگ | 14.7 | 10.8% |
| فرانسیسی | 11.2 | 8.2% |
| پُرتگیزی | 10.4 | 7.2% |
| مِنگ | 6.5 | 4.8% |
| عثمانیہ | 5.6 | 4.1% |

www.MashalBooks.org

| | | |
|---|---|---|
| مغل | 4.0 | 2.9% |
| مرہٹہ | 2.5 | 1.8% |
| اِنکا | 2.0 | 1.5% |
| لیتھوانیا۔پولینڈ | 1.1 | 0.8% |

**ذرائع:** ٹرچن اے آل۔

https://www.mtholyoke.edu/acad/intrel/empires.htm

یہ بات پہلے سے طے شدہ نہ تھی کہ ان دونوں سلطنتوں کی کامیابی تیزی سے گزر جانے والی ہوگی۔ 1500 سے لے کر ہسپانوی فی کس مجموعی قومی پیداوار انگلستان سے تھوڑا سا اُوپر تھی، جنوبی نیدرلینڈز (موجودہ بلجیم) ۔ کے برابر تھی، اور یورپی طاقتوں میں سے صرف شمالی نیدرلینڈز اور شمالی اٹلی سے نیچے تھی۔ (دیکھیئے جدول 8.2)

**جدول 8.2:** پانچ مغربی یورپی ممالک میں فی کس مجموعی قومی پیداوار، 1750-1500 (نیدرلینڈز 1750=100)

| سال | سپین | انگلستان | نیدرلینڈز | بلجیم | اٹلی |
|---|---|---|---|---|---|
| 1500 | 46-51 | 46 | 62 | 49 | 71 |
| 1570 | 46-51 | 46-48 | 62 | 59 | 69 |
| 1650 | 41-51 | 57 | 101 | 56 | 64 |
| 1700 | 41-47 | 73 | 100 | 59 | 61 |
| 1750 | 43-44 | 89 | 100 | 65 | 65 |

**ذریعہ:** وین زینڈن (2009، جدول 10)

عثمانی بھی اسی طرح کے معاشی انحطاط سے گزرے۔ سولھویں صدی میں اپنے عروج کے دور میں سلطنتِ عثمانیہ نے وسطی اور جنوبی یورپ کی بڑی طاقتوں کو للکارا......سپین، وینس، اور مقدس رومی سلطنت کو۔ یورپ میں اس کے حملے، جو کہ اگرچہ بنیادی طور پر فوجی نوعیت کے تھے، اہم یورپی تجارتی اور کاروباری مراکز کیلئے بھی خطرہ بن گئے۔ تاہم سترھویں صدی کے



اختتام تک، سلطنتِ عثمانیہ نے بہت سی یورپی طاقتوں کو تجارتی معاہدوں کی پیشکش کی، جس میں اُنہوں نے یورپی معاشی اشرافیہ کو کسٹم میں رعایت، قانونی علمداری، اور سلطنت کے اندر مقدمے قائم کرنے سے آزادی کی پیشکش کی۔ یہ معاہدہ جات اُس عظیم تر اختلاف کی واشگاف علامات میں سے ایک تھے، جو صنعتکاری سے قبل سرکردہ مغربی یورپی ریاستوں اور سلطنتِ عثمانیہ کے درمیان واقع ہوا۔

کیا واقع ہوا؟ کیوں وہ دو ریاستیں، جو اُڑان بھرنے کیلئے کم از کم اُتنی ہی تیار تھیں، جتنا مثلاً انگلستان تھا، پیچھے رہ گئیں، جبکہ پروٹسٹنٹ شمال مغربی یورپ آگے نکل گیا، یہ باب یہ خیال پیش کرتا ہے کہ ان ریاستوں کی جغرافیائی سیاسی توسیع کی تہہ میں فطری معاشی کمزوریاں پنہاں تھیں، جن کا کھوج اُن اداروں میں لگایا جا سکتا ہے جو سیاسی اقتدار کو توسیع دیتی تھیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ نہ تو سلطنتِ عثمانیہ اور نہ ہی سپین نے اس بنیادی ادارہ جاتی تبدیلی کا تجربہ کیا تھا، جو اُن تبدیلیوں کے قریب ہوں جو پروٹسٹنٹ اقوام میں واقع ہوئیں۔ اُن میکانیوں نے جن کے ذریعے عثمانیوں اور ہسپانویوں نے اپنے اقتدار کو توسیع دی اُن کیلئے معاشی اشرافیہ کو نظرانداز کرنے کی گنجائش پیدا کر دی، اور اس کا جوابی طور پر اُن کی طویل مدتی معاشی خوشحالی پر نقصان دہ اثر تھا۔ اس انحطاط کی وضاحت اُن دلائل کی رو سے ہو سکتی ہے جو پچھلے ابواب میں پیش کئے گئے ہیں۔ ہسپانوی اور عثمانی سلطنتوں کی تواریخ، انگلستان اور جمہوریہ ڈچ کی تواریخ سے مخالف واضح کہانی بیان کرتی ہیں ان چاروں تواریخ میں ایک ہی پیغام موجود ہے: یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ سیاسی اقتدار کو توسیع کون دیتا ہے تاہم انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کے برخلاف، قانون کی منظور نہ ہونے والی اقسام کیلئے، ہسپانوی اور عثمانی توسیع اقتدار کے کارندوں کی شناخت اہمیت رکھتی ہے۔

ستم ظریفانہ طور پر، ہسپانوی بادشاہوں اور عثمانی سلطانوں کی مضبوطی ان دونوں کی معیشتوں کی بالآخر تباہی کا سبب بنی کیونکہ یہ دونوں حکمران اس قدر مضبوط تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے کبھی معاشی اشرافیہ کو سودا بازی کی میز پر لانے کی ضرورت محسوس نہ کی، اور نتیجۃً اُنہوں نے کبھی ایسے قوانین نہ بنائے جو طویل المدتی معاشی ترقی میں سہولت پیدا کرتے۔ ہسپانوی اور عثمانی سلطنتوں کے درمیان یہ وہ بنیادی مشابہت تھی، جو جدید دور کے آغاز میں انگلستان اور

www.MashalBooks.org

ڈچ جمہوریہ میں موجود نہیں تھی: ہسپانوی بادشاہ اور عثمانی سلطان ضرورت سے زیادہ جائزیت کے حامل تھے۔ دوسرے لفظوں میں ایک حکمران کی جائزیت کیلئے کچھ مناسب اوسط بنیاد ہوتی ہے: ایک کمزور حکمران کی لوگ پیروی نہیں کریں گے، اور وہ فوائد جو ایک مرکزی حکمرانی کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں، ختم ہو جائیں گے، جبکہ ایک مضبوط حکمران کو، اپنی حکمرانی کی توسیع کیلئے معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید نہیں کرنا پڑے گی۔ ہسپانوی اور عثمانی سلطنتوں کے ابتدائی دور کے ساتھ موخرالذکر مسئلہ تھا، جبکہ انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کی نسبتاً کمزور (اگرچہ بہت زیادہ کمزور نہیں) جائزیت نے ایک ایسی صورت حال کو پروان چڑھایا جس نے بالآخر خوشحالی کو تقویت دی۔



# سپین میں طویل مدّتی معاشی جمود

مغربی یورپ میں کسی بھی اور ملک کی طرح ہسپانوی بادشاہ کے توسیع کار بھی، بادشاہ کے اختیارات پر بندشیں عائد کرتے تھے، اور اپنے مفاد کے حق میں پالیسیاں بنانے پر اُکساتے تھے۔ معاشیات کی زبان میں ہسپانوی حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے پر پابندیوں کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ اپنی بہترین مرضی کا انتخاب اپنی خواہشات اور خود کو درپیش پابندیوں کو مدِّ نظر رکھ کر ہی کر سکتے تھے۔ اس بات کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ وہ پابندیاں جن کا ہسپانوی تاج کو سامنا تھا، بنیادی طور پر اُن پابندیوں سے مختلف تھیں جن کا سامنا ڈچ یا انگلیسی حکمرانوں کو ہوتا تھا۔ یہ پابندیاں لطیف ہوا میں سے پیدا نہیں ہوتی تھیں، وہ ان علاقوں کی تواریخ کے ''راستے پر پتھر'' وہ نتائج تھے، جو صدیوں میں جا کر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ سولھویں صدی تک اور خاص طور پر تحریک اصلاحِ کلیسا کے بعد یہ اختلافات اتنے بڑے تھے کہ انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کے حکمران ایک ایسے مسئلے کو ''حل کر رہے'' تھے، جو ہسپانوی تاج کے مسئلے سے مختلف تھا۔ لیکن یہ اختلافات کیا تھے؟ وہ پہلے پہل کیوں پیدا ہوئے؟ اُن کے نتائج کیا تھے؟

ان سوالوں کا جواب تاریخی پس نظر کا تقاضا کرتا ہے۔ مذہبی کشاکش، بنیادی طور پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہسپانیہ کی قرونِ وسطی کی تاریخ کے انتہائی اہم ورثوں میں سے ایک تھا۔ متعلقہ تاریخ 711، میں شروع ہوئی، جب مسلمان اموی جنگجو پہلی بار آئبیرین جزیرہ نما میں داخل ہوئے۔ اُمویوں نے جزیرہ نما کے بہت بڑے حصّے کو فتح کر لیا اور کچھ انتہائی اہم اور اس وقت کے امیر ترین شہروں میں بس گئے، بشمول اشبیلیہ اور ویلنسیا کے۔ آنے والی چھ صدیوں کے دوران، عیسائی فوجوں نے آہستہ آہستہ جزیرہ نما کے کچھ حصّے واپس لے لئے۔ دوبارہ فتح کے ورثے نے جدید سپین کے آغاز میں ایک مذہبی حرکیہ پیدا کر دیا جو مغربی یورپ میں کسی اور جگہ موجود نہیں تھا۔

www.MashalBooks.org

اُس طریقے نے جس میں جزیرہ نمائے آئبیریا کو دوبارہ فتح کیا گیا، ہسپانوی حکومت کے اداروں کی ساخت میں ایک بڑا کردار ادا کیا، ہسپانوی حکمرانوں نے فوج کے وفادار ارکان کو، اُن کی خدمت کے صلے میں حال ہی میں فتح شدہ شہروں میں، زمینوں کے قطعات عطا کئے۔ کیونکہ ہسپانوی حکمران، ان نئے شہری بننے والے اشراف پر فوجی حمایت کے لئے زیادہ انحصار کرتے تھے۔ لہٰذا شہروں نے ہسپانیہ کی حکمرانی میں، اُس وقت یورپ کے کسی اور علاقے کی نسبت زیادہ اہمیت حاصل کر لی، ان واقعات نے شمالی یورپ میں بھی، کم از کم دو صدیاں پہلے، ایسے ہی واقعات کی پیش آگاہی دے دی، بلاشبہ یہی یورپی پارلیمان (کورئیز) سپین میں اُبھریں۔ سب سے پہلے منصہِ شہود پر آنے والی کورئیز 1020 میں لیون کی کورئیز تھی، اور وہ پہلی کورئیز جہاں شہروں کی آواز تھی، 1169ء میں ہرگوس کی کورئیز تھی۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں کورئیزوں کی طاقت میں اضافہ ہوا، اور فرڈیننڈ چہارم کے دور (عہد 1295-1312) تک اُن کے سال میں ایک دفعہ اجلاس ہو رہے تھے۔ جو کہ ایک ایسی پیشرفت تھی جو یورپ میں کسی اور جگہ صدیوں تک واقع نہ ہوئی۔ کسیٹائل کی کورئیز۔ جو کہ سب سے بڑھ کر اسپین کا معاشی طور پر انتہائی اہم علاقہ تھا۔ اس دور میں تشکیل پذیر ہوئی، اور یہ اشراف، اہل کلیسا اور ''عام لوگوں'' پر مشتمل تھی، بڑی حد تک انگلستان کی پارلیمان کی مانند۔

قرونِ وسطی کے سپین کی توسیع حکمرانی پر مذہب کے کردار کو نظر انداز کرتے ہوئے، بحث کرنا ناممکن ہے۔ یہ بات ''کیتھولک مطلق العنان حکمرانوں، ازابیلا آف کیسٹائل (Isabella of Castile) (عہد 1479-1504) اور ایرے گون کے فرڈننیڈ دوم (عہد - 1479 1516) کے بارے میں اور بھی زیادہ صحیح ہے۔ اُن کا عہد متعدد اسباب کی بنا پر اہم تھا۔ اوّل، کیسٹائل اور ایرے گون کی بادشاہتوں کو متحد کر کے، انہوں نے سپین کی دوبارہ فتح کو مکمل کرنے کے لئے کافی وسائل کو متحرک کر لیا۔ انہوں نے 2/جنوری 1392 کو غرناطہ کے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ دوبارہ فتح کو مکمل کیا، جو کہ جزیرہ نمائے آئبیریا کی آخری مسلم بادشاہت تھی۔ پاپائیت نے دوبارہ فتح کی حمایت کی، اس نے غرناطہ کے خلاف جنگ کی تین چوتھائی رقوم ادا کیں، اور یورپ نے 1494 میں فرڈیننڈ اور ازابیلا کو ''کیتھولک تاجوروں'' کے طور پر تاج پہنائے۔(1) غرناطہ نے ہسپانوی بادشاہ کو تین لاکھ مزید رعایا مہیا کی، جو دولت کا ایک نیا اہم



ذریعہ تھا، جنوبی ساحل پر تحفظ مہیا کیا، اور غالباً زیادہ اہم طور پر وسیع تر یورپی ''اسلام کے خلاف جنگ'' میں وقار کا ایک انمول ذریعہ مہیا کیا۔

کیتھولک بادشاہوں نے اپنی مذہبی توثیقات کو، کلیسائی علامت کے قیام سے آگے بڑھایا۔ سپین آسانی سے اُس وقت مغربی یورپ کا مذہبی طور پر سب سے متنوّع علاقہ تھا، اس طرح کہ اُس میں ہزاروں یہودی اور مسلمان، اور اس سے بھی زیادہ حال ہی میں تبدیلی مذہب کرنے والے (Conversos) لاکھوں کیتھولکوں کے ساتھ باہم مخلوط ہوتے تھے۔ کلیسائی عدالت کا ظاہر شدہ مقصد ''مذہب کی وحدت'' پیدا کرنا تھا۔ لہٰذا یورپ نے 1478 میں بادشاہ کو ملحدوں کو نیست و نابود کرنے کی اجازت دے دی۔ کلیسائی عدالت نے یہودیوں اور نو مذہبوں کو کئی دہائیوں تک دہشت زدہ کئے رکھا، اور بعد میں مسلمان نو مذہبوں (Morisco) کو بھی دہشت زدہ کیا، اور اس طرح مذہبی اقلیتوں کے ہزاروں لوگوں کے اخراج یا موت کا سبب بنی۔(2)

کلیسائی عدالت کے دور کے دوران مذہبی اقلیتوں کی وحشیانہ اذیت رسانی بدیہی طور پر اس بات کی شہادت ہے کہ مذہبی جواز بخشی اقتدار ہسپانوی بادشاہ کے لئے اہم تھی۔ یہ ایک مہنگی پالیسی تھی۔ نہ صرف کلیسائی عدالت کے ادارہ جات کے قیام کے حوالے سے، بلکہ اُس انسانی سرمایے اور مزدوروں کے نقصان کے حوالے سے بھی، جو عقوبت کے نتیجے میں سپین سے بھاگ گئے۔ لیکن بادشاہ نے کلیسائی عدالت کے فوائد کو اس کے نقصانات سے زیادہ خیال کیا ہوگا۔ ایسی عقوبت صرف ایسی صورت میں بادشاہ کے لئے نفع مند ہوگی، اگر کلیسا کے ساتھ اپنے آپکو وابستہ کرنے سے کوئی حقیقی فائدہ حاصل ہوتا۔ مذہبی جواز بخشی اقتدار حاصل کرنے کے کم مہنگے طریقے موجود تھے۔ کلیساؤں کو عطیات دے کر، مذہب دوست پالیسی بنا کر۔ لیکن کلیسائی عدالت کی طرح کی مہنگی پالیسی بھی، بادشاہ کے نقطہِ نگاہ سے مناسب ہوگی، اگر اندازہ لگائے گئے فوائد خاصے زیادہ ہوں گے۔ بلاشبہ، اینڈرسن اے آل (Anderson et al (2016، یہ دیکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ اور ابتدائی دور کے جدید یورپ اور (خاص طور پر سپین) میں یہودیوں کی اذیت رسانی کا بہت زیادہ امکان تھا، جب موسم بے موقع طور پر خراب تھا اور فصلوں کے ناکام ہونے کا امکان تھا بالکل ٹھیک اُسی طرح کی غیر محفوظ حالت، جس کے تحت کوئی بھی حکمران اتنی زیادہ جائزیت حاصل کرنے کا خواہاں ہوگا، جتنی کہ ممکن ہو۔

www.MashalBooks.org

اشرافیہ نے بھی ہسپانیہ کی دوبارہ فتح سے فائدہ اٹھایا، اور اُس نے حال ہی میں فتح شدہ علاقوں کے بہت سے حصوں پر قبضہ کر لیا۔ بادشاہ نے ان کو معاشی اور سیاسی ترغیبات سے بے اثر کر دیا۔ ٹیکس میں چھوٹ، خطابات، عطیہ جات، اور اُن کی نئی زمینداریوں اور مذاہب کی جواز بخشی سے۔ یہ احسان کا بدلہ اشرافیہ کے بٹوؤں کے لئے بہت تھا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ اب ان کے پاسی تاج سے قوانین اور پالیسیوں پر کسی قسم کی سودا بازی کی طاقت نہیں ہے۔(3) فرڈیننڈ اور ازابیلا بھی روم کو یہ درخواست گزارنے میں کامیاب ہو گئے، کہ وہ اعلیٰ کلیسائی منصب کے لئے اُن کے ترجیح یافتہ اُمیدواروں کی حمایت کرے، اور اس طرح ہسپانوی مذہبی حاکمیت کو اپنی عملداری میں لانے میں اُن کی مدد کرے۔(4)

فرڈیننڈ اور ازابیلا نے یہ ادارہ جاتی وراثت اپنے ہیسبرگ پوتے چارلس پنجم کو منتقل کر دی۔ جو مقدس رومی سلطنت کا شہنشاہ بھی بن گیا اور 1516 میں ہسپانوی تاج کا وارث ہوا۔ اور اُس کے بیٹے فِلپ دوم کو جو 1556 میں چالس کا جانشین ہوا۔ چارلس پنجم ہسپانوی تاج کا اپنی والدہ (Joanna) (جوانا) کے ذریعے وارث ہوا، جو فرڈیننڈ اور ازابیلا کی بیٹی تھی۔ اُس نے اپنے ہسبرگ والد، فلپ آف برگنڈی، سے زیریں ممالک وراثت میں پائے۔ نئی دُنیا میں ہسپانوی مقبوضات اور سسلی، ساڑدینیا، نیپلز، اور شمالی افریقہ کے ایرے گون مقبوضات کو ملا کر ہسبرگ بادشاہ ایک عالمی سلطنت کے وارث تھے۔

چارلس پنجم اور فلپ دوم کی خواہش سب سے زیادہ اپنی سلطنت کو توسیع دینے کی تھی۔ لہٰذا انہوں نے سپین کو متعدد مہنگی اور خون آشام کشاکشوں میں اُلجھا دیا، جو بڑی اور اُبھرتی ہوئی یورپی سامراجی طاقتوں کے درمیان تھیں۔ سپین نے سولھویں صدی میں تمام بڑی بری طاقتوں کے خلاف انیس جنگیں لڑیں: گیارہ فرانس کے خلاف، آٹھ سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف، چھ انگلستان کے خلاف، تین ڈچ کے خلاف، اور تین وینس کے خلاف، بشمول دوری جنگوں کے (یہ تعداد اتحادوں کی وجہ سے انیس سے زیادہ بنتی ہے)۔ پوری سولھویں صدی میں، سپین صرف کل اٹھارہ سالوں تک جنگ میں نہیں رہا۔ ان میں سے کچھ جنگیں مذہب پر تھیں، دوسری محض سامراجی توسیع تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ جنگیں مہنگی تھیں، اور سولھویں صدی کی بنیادی معاشی کہانیوں میں سے سپین اور یورپ میں دوسری جگہوں پر بھی۔ جنگوں میں رقم مہیا کرنے کے لئے



محصولات کی تلاش تھی۔

انگلستان، ڈچ جمہوریہ اور دوسری یورپی اقوام کے ساتھ ساتھ سپین کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا کہ تاج ان مہنگی جنگوں کے لئے رقوم کس طرح مہیا کرتا تھا، اس طریقے پر منحصر تھا جس میں وہ اپنی حکمرانی کو توسیع دیتا تھا، اور اس رسائی پر جو اسے معاشی اشرافیہ کے کنٹرول سے بالا بالا رقومات تک حاصل تھی۔

اس کتاب میں پیش کیا گیا ڈھانچہ اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ چارلس پنجم اور فلپ دوم نے کیوں اور کس طرح اُن قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کی، جو ان کے عہد کی شناخت تھیں۔ دوسرے یورپی حکمرانوں کی طرح چارلس پنجم اور فلپ دوم کے متعدد اہداف تھے۔ ان میں سے چند ایک یہ تھے، زمینی حدود کی توسیع اور حفاظت سے ''شان وشوکت'' اور دولت حاصل کرنا، نئی دُنیا سے سکّوں کی تیاری میں اضافہ کرنا، اور ''اسلام کے خلاف لڑائیاں''۔ اور اُنہیں کورئیز کی طرف سے الاٹ شدہ رقوم اور نئی دُنیا سے دھڑا دھڑ آنے والے سونے اور چاندی کی وسیع مقداروں پر بجٹ کی پابندیوں کا سامنا تھا۔ اُن کی کورئیز کے مقابلے سودا بازی کی پوزیشن کی مضبوطی، اُس طریقِ کار کا نتیجہ تھی جس میں وہ اپنے اقتدار کو توسیع دیتے تھے۔ وراثت کے ذریعے جائز حکمران بننے کی انتہا یہ تھی کہ ہسبرگوں نے ''کیتھولک بادشاہوں'' کا کردار بھی وراثت میں حاصل کیا۔ سولھویں صدی میں ہسپانوی بادشاہ نے ہسپانوی کلیسا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا اور اس طرح پادریوں کی تقرری کا اختیار بھی حاصل کر لیا۔ ان نفع بخش تقرریوں، ٹیکس سے استثنیٰ اور وقتاً فوقتاً کلیسا کے دشمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کی پکار کے بدلے میں، کلیسا بادشاہ کو مدد فراہم کرتا تھا۔ مثال کے طور پر طلیطہ کے اسقفی حلقہ نے جو روم سے باہر پوری عیسائی دنیا میں دوسرا امیر ترین حلقہ تھا بادشاہ کو پروٹسٹنٹ انگلستان کے خلاف جنگ کرنے اور ہسپانوی آرمیڈا کی دوبارہ تعمیر کرنے 5 کے لئے 300,000 ڈوکیٹ عطیہ کئے۔ (5) پاپائیت بھی بادشاہ کو وقتاً فوقتاً رقوم مہیا کرتی تھی۔ سپین کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف جنگ میں مدد دینے کے لئے پوپ نے مسیحی جہاد کی اعانت (Cruzada) کی تجدید کی، جو اس نے فرڈیننڈ اور ازابیلا کو غرناطہ کے خلاف دیا، اور یہ محصولات کا مستقل ذریعہ بن گیا۔

بادشاہ کا کلیسا سے تعلق اور اس کا بطور ''عیسائیت کے محافظ'' کردار، اس بات کی توضیح کرنے

میں بہت دور تک جاتا ہے کہ یروٹسٹزم سپین میں کیوں قدم نہ جما سکا۔ یہاں تک کہ تحریک اصلاحِ کلیسا سے قبل بھی، فرڈیننڈ اور ازابیلا نے غیر وقیانوسی عقیدے کو کلیسائی عدالت کے ذریعے صاف کرنے کی کوشش کی۔ چارلس پنجم اور فلپ دوم نے اس پالیسی کو سولھویں صدی میں جاری رکھا۔ اور فلپ دوم نے، 1560 کی دہائی میں، فرانس کے راستے کتالونیا میں سرایت کرتے ہوئے نظر آنے والی یروٹسٹنٹ حسیت کو ختم کرنے کے لئے کلیسائی عدالت کی مشینری کو استعمال کیا۔ 1552-1551 میں کلیسائی عدالت نے ممنوعہ پروٹسٹنٹ کتب کی ایک فہرست شائع کی، جو کسی اور جگہ جاری ہونے والی فہرستوں کی نسبت کافی وسیع تھی۔ کسی بھی شخص پر جس پر ذرا سا بھی وقیانوسیت سے دور ہٹنے کا شبہ ہوتا، اور لوتھرن ہونے کا الزام لگایا جا سکتا تھا اور وہ تشدد اور خفیہ مقدمے کی زد میں ہوتا تھا۔(6)

کلیسا کی حمایت نے ہیسبرگوں کو کورئیز کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں ایک بالادستی دے دی، چارلس پنجم کے عہد کے آغاز میں، اشرافیہ اُسے ایک غیر ملکی شہزادے کے طور پر شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی (چارلس پنجم بلجیم میں پلا بڑھا اور اُس نے بطور بادشاہ اپنی آمد سے قبل سپین میں کبھی قدم نہیں رکھا تھا)۔ تاہم کیسٹائل کی کورئیز نے اُسے 600,000 ڈوکیٹ غیر مشروط طور پر عطیہ کئے محض اس وعدے پر کہ وہ کیسٹائل کے قوانین کا احترام کرے گا اور سپینش سیکھے گا۔(7) کیسٹائل کی معاشی اشرافیہ کا اپنے بادشاہ کے بارے میں شبہ 1520 میں نقطۂ جوش پر پہنچ گیا، ایک ایسے واقعے کی شکل میں جسے کومونروز کی بغاوت کہا جاتا ہے۔ شہری پست تر اشرافیہ نے بادشاہت اور طبقہ اشراف کے خلاف اس بغاوت کی اختراع کی اُس انگلیسی خانہ جنگی کی طرز پر جو ایک صدی سے زیادہ عرصے کے بعد نمودار ہوئی۔ کومیونروز کو بہت سی شکایات تھیں: وہ طاقت اور دولت کے ہیسبرگ بادشاہ اراہل کلیسا اور اشرافیہ کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں میں ارتکاز سے خطرہ محسوس کرتے تھے، وہ محسوس کرتے تھے کہ چارلس پنجم کی خواہشات کیسٹائل کو غلام بنانے کا خطرہ اپنے اندر رکھتی تھیں، اور وہ زیادہ عمومی طور پر شاہی اور اشرافیہ کی طاقت پر قدغن لگانا چاہتے تھے (8) کومیونروز کی بدقسمتی کہ اُن کی بغاوت کی پُرتشدد ناکامی نے اُسی چیز کو اور بھڑکا دیا جس کے خلاف وہ بغوت کر رہے تھے کیونکہ اب وہ بادشاہ کے لئے خطرہ پیدا نہیں کر رہے تھے، لہٰذا اب اُسے محاصل کے بدلے میں اُن کے لئے کچھ زیادہ چھوڑنے کی ضرورت نہ رہی۔ بغاوت کے



فوری نتیجے میں، ایک شاہی فرمان نے کورئیز سے، بادشاہ کی رقومات کو روکنے کا اختیار ختم کر دیا، اور اُن کی اسی بارے میں کوئی اہمیت نہ رہی کہ بادشاہ اپنی رقوم کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ اس ناکام بغاوت کے بعد، بادشاہ کی طاقت اور بھی زیادہ مرتکز ہوگئی، اور کورئیز ''حکمران کے تقاضوں ایک ربڑ کی مُہر سے زیادہ کچھ نہ رہ گئی''۔(9) چارلس پنجم نے یہ بات واضح کر دی کہ وہ رقوم جن کا وہ تقاضا کرے گا، کورئیز کے مطالبات کے ساتھ مشروط نہیں ہوں گی، اور اُنہیں بتا دیا کہ ''کل میں تمہاری رقوم کا تقاضا کرتا تھا، آج میں تمہارا مشورہ چاہتا ہوں۔''(10)

انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کے برخلاف، کمزور شدہ، ہسپانوی معاشی اشرافیہ کا انجام کار، چارلس پنجم اور فِلپ دوم کی طرف سے اپنائی جانے والی پالیسیوں میں بہت کم حصّہ رہ گیا۔ بطور مقدس رومی شہنشاہ کے چارلس پنجم نے اُس بڑھتے ہوئے بڑھتی ہوئی پروٹسٹنٹ حسیت کے خلاف جو پوری جرمن سرزمین میں پھیل رہا تھا، مخالفت کی قیادت کی۔ باوجود ہسپانوی معاشی یا سیاسی مفادات کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہونے کے، پروٹسٹنٹرں کے خلاف جنگ چارلس کی سب سے پہلی ترجیحات میں سے ایک تھی۔ کیسٹائل کی کورئیز نے چارلس کو وسطی یورپ میں لڑائی کرنے کے لئے رقم دینے سے انکار کر دیا، لیکن وہ اس قدر طاقتور اور دولتمند تھا کہ اس چیز نے بمشکل ہی اُس پر کوئی اثر ڈالا۔(11) چارلس نے زیریں ممالک میں جنگوں میں بھی، جو بظاہر پروٹسٹزم کو روکنے کے لئے تھیں ہسپانوی وسائل استعمال کئے۔ ڈچ پروٹسٹوں کے خلاف جنگ اتنی پہلے شروع ہوگئی جتنا کہ 1521، جب چارلس پنجم نے تمام لوتھر کی کتابوں کو جلانے کا حکم دیا، یہ چیز آخرکار مشتبہ ملحدین کی پُرتشدد ایذا رسانی پر منتج ہوئی۔ فلپ دوم نے بھی، زیریں ممالک میں پروٹسٹنٹزم کے پھیلاؤ کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا، اور اُس نے 1565 میں شروع ہونے والے گیلوینزم کو ختم کرنے کے لئے کلیسائی عدالت کا استعمال کیا(12)۔ وہ چیز جو مذہبی جبر کے طور پر شروع ہوئی، تیزی سے بڑھ کر سیاسی، معاشی، اور ہسپانوی حکمرانی سے آزادی کے لئے بغاوت تک پہنچ گئی۔ (دیکھئے باب 7) ڈچ لوگوں کے خلاف جنگ ہسپانوی تاج کے لئے مہنگی ثابت ہوئی، اور یہ فلپ دوم کے زیرِ حکومت حاکم اعلیٰ کی ناکامی کا بنیادی سبب بنا۔ فلپ کے تنگ مالی وسائل اُس وقت فوری طور پر ظاہر ہوگئے، جب زیریں ممالک میں تعینات ہسپانوی افواج کو ادائیگیوں میں تاخیر ہونے لگی۔ ان افواج نے 1572 اور 1607 کے درمیان چھیالیس مرتبہ

بغاوت کی۔ بشمول اینٹورپ کے تباہ کن محاصرے کے، جہاں ہسپانوی فوجوں نے مالِ غنیمت لوٹا اور حقیقتاً یورپ کے ایک امیر ترین شہر کو تباہ کر دیا۔(13)

ہسپانوی بادشاہ نے مسلمانوں کے ساتھ تصادم میں بھی وسائل کا استعمال کیا۔ 1502 میں بادشاہ نے کیسٹائل کے مسلمانوں کو یا عیسائیت قبول کرنے یا ملک چھوڑنے کا انتخاب دیا، اور اس نے یہی انتخاب 1525 میں اریے گون کے مسلمانوں کو بھی دیا۔ نومذہب مسلمانوں (moriscos) کو پوری صدی کے دوران وقتاً فوقتاً ہراساں کیا جاتا تھا اور انہوں نے 1568 - 1570 غرناطہ میں بغاوت کر دی، عثمانیوں نے ہسپانوی مفادات کے لئے اور بھی شدید خطرہ پیدا کیا۔ فلپ دوم کے عہد کے پہلے بیس سال تک بحیرہ روم کے لئے عثمانیوں کے ساتھ تصادم ہسپانوی خارجہ پالیسی پر غالب رہا۔(14) سپین 1560 اور 1570 کی دہائیوں میں عثمانیوں کے ساتھ مسلسل تصادم میں تھا اور شمالی افریقہ اور اطالوی ریاستوں پر کنٹرول کے لئے مقابلہ کرتا رہا۔ سپین کو پاپائے روم کی طرف سے ان مشنوں کے لئے حمایت ملتی رہی بشمول کروزیڈا (مسیحی جہاد کے لئے اعانت) کے۔ یہ جنگیں بڑھ کر لیپونٹو کی لڑائی میں انتہا کو پہنچ گئیں، جس میں سپین، وینس اور پاپائے روم کے اتحاد نے عثمانیوں پر ایک تباہ کن بحری حملہ کیا، اس لڑائی کو وسیع طور پر بحیرہ روم میں، ہسپانوی، اطالوی حلقۂ اثر پر عثمانی حملوں کے اختتام کے آغاز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ یہ ہسپانویوں کی عثمانیوں کے خلاف لڑائی کے نقطۂ عروج کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔ 1580 کے بعد ہسپانوی خارجہ پالیسی نے شمال مغربی یورپ پر بہت زیادہ شدّت سے توجہ مرکوز کی(15)۔

فلپ دوم کے بطور بادشاہ بیالیس سالوں میں سے، کیسٹائل صرف چھ ماہ کے لئے امن کی حالت میں رہا۔ یہ جنگیں مہنگی تھیں۔ فوج بادشاہ کے اخراجات کا 60 فیصد خرچ کر دیتی تھیں۔(16) اور فلپ کے عہد کی داستان، ان جنگوں کے لئے رقوم تلاش کرنے کی داستان ہے۔ اسی طرح اس کے والد چارلس پنجم نے کیسٹائل کی کورٹیز کا اجلاس پندرہ مرتبہ بلایا، عموماً رقومات کی تلاش میں۔ اگرچہ کورٹیز بادشاہ کے مطالبات کی شکایت کرتی رہتی تھی، لیکن عام طور پر وہ اسے وہ کچھ دے دیتی تھی جس کی وہ خواہش کرتا تھا، بغیر بدلے میں زیادہ کچھ حاصل کئے۔(17) بادشاہ کورٹیز کے ساتھ مذاکرات میں دو باہم مربوط اسباب کی بنا پر کامیاب ہو جاتا تھا: اس کے پاس توسیعِ اقتدار کے متبادل وسائل اور محصولات کے متبادل وسائل تھے۔ محصولات



کا ایک ذریعہ کلیسا تھا، جو کورٹیز کے حلقۂ اثر سے باہر رقومات مہیا کرتا تھا۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ، سونے اور چاندی کی بڑی بڑی مقداریں امریکاؤں سے دھڑا دھڑ آ رہی تھیں۔ قیمتی جواہرات کی تجارت کے عروج کے زمانے میں (1607 - 1577)، قیمتی جواہرات، بادشاہ کے کل محاصل کے چھٹے حصّے سے لے کر ایک چوتھائی تک کی وجہ بنتے تھے، کیونکہ امریکہ سے آنے والے جہازوں سے ''شاہی پنجم''۔ کل کمائی کا پانچواں حصّہ۔ شاہ کی تجوریوں میں داخل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔(18) قیمتی جواہرات کی کمائی نے بادشاہ کو جینوئیز اور جرمن بینک مالکان سے بڑی بڑی رقمیں اُدھار لینے کو بھی ممکن بنا دیا، اس طرح کہ جواہرات کو قرضوں کی پشت پناہی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ قرضے کھلی مارکیٹ میں دستیاب نہ تھے، بادشاہ اس کے قرضخواہوں کے ساتھ کورٹیز کے دائرہ کار سے باہر نجی طور پر ان کی شرائط پر گفت و شنید کرتا تھا، قرض لینے کا ترجیحی طریقہ چھوٹی مدت کے قرضوں کی صورت میں تھا، جنہیں ایسینٹوز (Asientos) کہا جاتا تھا، جس کے لئے کورٹیز سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔(19) قرضوں کا ایک سیلاب اُمڈ آیا۔ 1600 تک صرف سود کی ادائیگیاں جواہرات کی درآمد کی رقم سے تین گُنا زیادہ تھیں، اور واجب الادا قرض کی سطح سالانہ محصولات کے لگ بھگ پانچ گُنا تک تھی۔

فلپ دوم، امریکاؤں سے آنے والے جواہرات کے باوجود بھی، جو کچھ حاصل کر رہا تھا، اُس سے زیادہ خرچ کر رہا تھا۔ اس چیز نے اُسے بہت سے غیر قانونی قدم اٹھانے پر مجبور کیا، یا اخراجات میں کٹوتی کرنے یا محصولات کو بڑھانے کے لئے۔ اُس کی سب سے مشہور غیر قانونی بجٹ کی کٹوتیوں میں شامل تھیں فوجوں کو ادائیگیوں کا روکنا اور اپنے دوسرے قرضوں کی واپس ادائیگی میں ناکام ہونا۔ اُس نے اپنے قرضخواہوں کو تمام ادائیگیاں چار مرتبہ روکیں اور اس طرح اپنے جینوئی اور جرمن قرضخواہوں کو ناراض کیا۔ اس کی ادائیگیاں روکنے کے رجحان کے باوجود، بینک مالکان اُسے صرف اس مد سے قرض دیتے تھے کہ وہ اُس کے کمزور کردار ادا کرنے کی صورت میں وہ رقومات تک اُس کی رسائی کو روکنے کے لئے گٹھ جوڑ کر سکتے تھے۔(20) محصولات کے حوالے سے، شاہ نجی خزانے کو ضبط کرنے پر ضرورت سے زیادہ تیار رہتا تھا، جب وہ مالی بندش میں ہوتا۔ پہلی ضبطی 1523 میں واقع ہوئی، جب بادشاہ نے فوج کو ادائیگی کے لئے 200,000 ڈوکیٹ لئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ، جب بھی بادشاہ مشکل میں ہوتا تو ضبطیاں اُس کی پالیسی

www.MashalBooks.org

بن گئی، 1531 سے 1534 تک، امریکا سے آنے والے 59 فیصد جواہرات کو ضبط کر لیا گیا اور 1556 کے جواہرات کے مجرمی بحرے کو کُلی طور پر ضبط کر لیا گیا (21) بادشاہ اُمرائے سلطنت، ہڈالگو (Hidalgo) (ہسپانیہ میں کمتر طبقہ خواص کا فرد۔م) کے مرتبے کو اُن لوگوں کو بیچ دیتا تھا جو اسی کی استطاعت رکھتے تھے۔ ان نوازشات میں زیادتی نے ٹیکس کی بنیاد کو محدود کر دیا۔ ہڈالگو کا مرتبہ حاصل کرنے کی بنیادی وجوہات میں سے ایک یہ تھی کہ اُمرا ٹیکس سے مبّرا تھے۔ لیکن اس نے محصولات کا ایک تیز ذریعہ مہیا کر دیا۔ خانہ شماری کے سے ظاہر کرتے ہیں کہ سپین کے کم از کم بارہ فیصد گھرانوں کو 1542 میں ہڈالگو کا مرتبہ حاصل تھا، اور آنے والی دہائیوں میں اور بھی زیادہ بکریاں ہوئیں۔ (22)

چارلس پنجم اور فلپ دوم ان تجاوزات کی سزاؤں سے بچ نکلنے میں کیسے کامیاب ہوئے، جنہوں نے عوام اور معاشی اشرافیہ دونوں کو نقصان پہنچایا؟ کورئیز مکمل طور پر بے اختیار نہ تھی; درحقیقت جب حالت موافق ہوتے تو یہ اپنی پالیسی کو منوانے کے قابل ہوتی تھی۔ جان لنچ (John Lynch) (صفحہ 1991,288) یہ تحریر کرتا ہے کہ، ''ایک سنجیدہ معاملے، ایک عوامی مقصد، اور ایک دیوالیہ حکومت کے ہوتے ہوئے، کورئیز بادشاہ کی مخالفت کرنے کی خواہش اور وسائل پا سکتی تھی۔'' کورئیز بادشاہ کی مخالفت کرنے کی خواہش اور وسائل پا سکتی تھی۔'' لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ کورئیز کا ہسپانوی ہٹولے کی ڈوریوں پر کنٹرول کمزور تھا۔ رقوماحات پر کنٹرول ہی وہ بنیادی وجہ تھی جس سے انگلیسی اور ڈچ پارلیمانوں کو اتنی سودابازی کی طاقت حاصل تھی۔ سپین میں بادشاہ کو کیسٹائل کی کورٹیز کے دائرہِ کار سے باہر محصولات کے اتنے وسائل میسر تھے۔ جن میں سے امریکاؤں سے آنے والے جواہرات اور جینوئیز اور جرمن لوگوں کی طرف سے قرضہ جات دو بہت اہم ذرائع تھے..... کہ بادشاہ کو معاشی اشرافیہ کیلئے بہت کچھ چھوڑنے کی ضرورت نہیں تھی۔ (23)

اس ادارہ جاتی انتظام کے ہسپانوی معاشی اشرافیہ کیلئے تباہ کُن اثرات تھے، اور امریکاؤں میں امیر ترین نوآبادیات کیلئے اور بھی زیادہ تباہ کُن اثرات تھے; ہسپانوی استحصالی اداروں کے دیرپا اثرات آج بھی لاطینی امریکا کے کچھ حصوں میں محسوس کئے جاتے ہیں۔ (24) غالباً سب سے مشہور مختصر مدّت کا سولھویں صدی کی ہسپانوی پالیسی کا معاشی نتیجہ، وہ تیز افراطِ زر تھا،



جو امریکا سے قیمتی دھاتوں کی دھڑا دھڑ آمد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ افراطِ زر کے دباؤ نے، جو یورپ میں کسی اور جگہ کی نسبت سپین میں زیادہ تھے، ہسپانوی برآمدات کو نقصان پہنچایا۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے شاہ کی تحفظ یافتہ اُون کی صنعت کو بھی متاثر کیا۔ (25) بادشاہ نے شہری معاشی اشرافیہ کو بھی بڑھتے ہوئے ٹیکس کے بوجھ تلے دبا دیا۔ (26) بادشاہ کی طرف سے درخواست شدہ زائد ٹیکس اور مسلسل کم ہونے والی ٹیکس کی بنیاد نے مل کر ٹیکس کے بوجھ کو چھوٹے سے شہری درمیانے طبقے اور دیہاتی کسان طبقے پر ڈال دیا، اس چیز نے، براہِ راست سرمایہ کاری کیلئے رقومات سے محروم کر کے صنعتی ترقی کی رفتار کو سُست کر دیا۔ اس نے، گھریلو اشیا کیلئے مارکیٹ کے حجم کو کم کر کے، بالواسطہ طور پر صنعت میں رُکاوٹ پیدا کی..... غریب کسان کوئی بڑی مارکیٹ نہیں بناتے اور زائد سرمایہ والے لوگوں کو زمین میں سرمایہ کاری کرنے پر مائل کر کے، جو خطابات کے حامل لوگوں کیلئے ٹیکس سے مبرا تھی۔ (27)

سپین کی شاہی پالیسی کا ایک اور نتیجہ یہ تھا کہ وہ زیادہ تر تاجر جو سپین میں تجارت کرتے تھے، جینوئیز، جرمن اور ڈچ اصل کے تھے۔ بادشاہ غیر ملکی تاجروں کو، قرض تک رسائی کے بدلے میں، امریکی قیمتی دھاتوں کے ایک حصے کی پیشکش کرتا تھا۔ اس چیز نے غیر ملکی تاجروں کو ہسپانوی تجارت میں شامل ہونے کی ترغیب دی، جبکہ اُنہیں اُس تجارت میں ایک مراعات یافتہ حیثیت بھی دی۔ (28) لیکن اس نے انہیں اپنے صدر دفاتر سپین میں قائم کرنے کی کوئی ترغیب نہ دی۔ اتنی زیادہ کاروباری سرگرمی نہ تھی کہ وہ سرمایہ کاروں کو، سوائے قیمتی دھاتوں کے کسی اور چیز میں بڑی سرمایہ کاریوں پر آمادہ کرتی۔ لہٰذا، میڈرڈ طلیطلہ، اور اشبیلیہ، ایمسٹرڈیم کی طرح کبھی بھی سرمایے کے مراکز نہ بن سکے، باوجود ہسپانوی تجوریوں میں سکّوں کے تمام بہاؤ کے۔ مورخ ہنری کیمن (Henry Kamen) (2003، صفحہ 298) اس نکتے پر مختصر مگر جامع طور پر بحث کرتا ہے ''اگر سپین حقیقی طور پر دولت کا مرکز ہوتا، تو بڑے بڑے بینک اپنے صدر دفاتر کو وہاں منتقل کرتے..... لیکن اس کی بجائے وہ وہیں رہے جہاں وہ تھے، اینٹورپ، آسبرگ یا جینووا میں۔ لیزبن، اشبیلیہ اور کارٹیجینا ڈی انڈیاس صرف مامور شدہ گماشتوں کے مستحق تھے۔

امریکی قیمتی دھاتوں کی وسیع مقدار نے شاہ کیلئے صنعت میں سرمایہ کرنے کیلئے عدم ترغیب کو بھی ہوا دی۔ سولھویں صدی میں سپین بنیادی طور پر خام مال خاص طور پر اون برآمد کرتا تھا اور

تیار شدہ اشیا جیسا کہ کپڑے اور پارچہ جات درآمد کرتا تھا۔ وہ ادائیگیوں کے توازن کو امریکا سے آنے والی نقد رقم سے برابر کرتے تھے بجائے صنعتی پیداوار کے ذریعے سے برابر کرنے کے (29) اُن جنگوں نے، جو سپین نے پروٹسٹنٹوں کے خلاف لڑیں، ان برآمدی صنعتوں کو نقصان پہنچایا۔ زیریں ممالک اور انگلستان ہسپانوی اون کے دو انتہائی اہم برآمدی مارکیٹیں تھیں، اور ان ممالک کے ساتھ تجارت اُس وقت سُست ہوگئی جب ہسپانویوں نے شمال مغربی یورپی ممالک کے ساتھ جنگ شروع کی۔ ان پالیسیوں کے منفی اثرات میڈرڈ میں دیکھے جاسکتے تھے جہاں ایک چھوٹی سی سیاسی اور اُمرا کی اشرافیہ بنیادی طور پر سامان تعیش درآمد کرتی تھی اور باقی ماندہ آبادی عام طور پر گزارے کے قریب تھے اور صرف اشیائے ضروریہ طلب کرتی تھی۔ (30)

ہسپانوی معاشی بدانتظامی کی دوسری مثالیں کثرت سے ہیں۔ قیمتوں کو کم کرنے کی ایک کوشش میں، کیسٹائل کی کورئیز نے 1548 میں برآمدات کو منع کرنے اور درآمدات کی حوصلہ افزائی کرنے کیلئے ایک بل پیش کیا۔ 1552 میں اُنہوں نے، اون، ریشم اور چمڑے سے بنی ہوئی اشیا کی برآمد کی حقیقی ممانعت کیلئے قانون بنا کر اس قانون کو تقویت دی۔ اس تجارت، مخالف پالیسی کا وہی نتیجہ تھا، جو معاشیات کی مبادیات سے واقف کوئی بھی شخص اُمید کرسکتا ہے..... صنعت کو بہت زیادہ نقصان ہوا..... اور کورئیز نے 1558 میں اس قانون کو واپس لے لیا۔ (31) لیکن اس واپسی کے بعد برآمدات پر ٹیکس لگا دیا گیا، جو 1564 میں مزید بڑھ گیا۔ برآمدات پر ٹیکس بادشاہ کیلئے پُرکشش تھا کیونکہ یہ اُسے ایسے محصولات مہیا کرتا تھا، جو کورئیز کے ہاتھوں سے باہر تھے۔ (32) بلاحیرت، ان ٹیکسوں نے ہسپانوی معاشی پیداوار کو مزید کم کردیا۔

اس بات کا تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ یہودیوں، مسلمانوں اور یہودی اور مسلمانوں سے تبدیلی مذہب کرنے والوں کے کلیسائی عدالت کے تحت اخراج اور اس کے مابعد نتائج کا معیشت پر معمولی اثر ہوا ہوگا۔ 1609 اور 1614 کے درمیان 275,000 مورِسکوز کو سپین سے نکالا گیا، جن میں سے ایک تہائی کیسٹائل سے تھے۔ یہ مورِسکوز بنیادی طور پر شہروں میں رہتے تھے اور زیادہ تر ناپسندیدہ پیشے کام کرتے تھے۔ (33) اگرچہ ان اخراجوں کے معاشی اثرات واضح نہیں تھے، لیکن اُنہوں نے لازماً ہسپانوی معاشی اور سماجی زندگی میں کردار ادا کیا ہوگا۔ پھر ایک اور معیشت کو روکنے والی مذہبی پالیسی، تحریکِ اصلاح کلیسا سے آگے آگے آنے والی، ہسپانوی



دانشوروں کو باقی ماندہ برِّاعظم میں جانے سے روکنے کی شعوری کوشش تھی۔ 1530 کی دہائی میں، زیادہ تر ہسپانوی انسان دوست مفکرین، یا تو سپین سے بھاگ گئے، یا اُنہیں کلیسائی عدالت کی طرف سے جیلوں میں ڈال دیا گیا اور 1550 کی دہائی میں بادشاہ نے ہسپانوی طلبا کو غیر ملکی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا۔ (34)

تاہم، اتنی دیر سے جتنا کہ 1600، سپین ابھی تک ایک مالدار ملک تھا، جس کی فی کس قومی پیداوار انگلستان کے برابر تھی اور یورپ میں صرف زیریں ممالک، اور اٹلی سے پیچھے تھی۔ (دیکھئے جدول 8.2) (35) لیکن مالتھوسی دباؤ، جنہوں نے پورے مغربی یورپ میں معاوضہ جات اور صرف کو کم کردیا تھا، سوائے انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کے، وہ سپین میں بھی موجود تھے۔ 1598 میں فلپ دوم کی وفات کے وقت، حقیقی معاوضہ جات اُس کی نسبت 41 فیصد کم تھے، جتنے کہ اُس سال تھے جب اُس کے والد چارلس پنجم نے تخت سنبھالا (1519)، اور فی کس زرعی صرف 24 فیصد کم تھا۔ (دیکھئے اشکال 8.2، اور 8.3) مغربی یورپ کے باقی ماندہ بہت سے ممالک کی طرح، ہسپانوی حقیقی معاوضہ جات میں، چودھویں صدی کے اواخر میں کالی موت کے بعد بڑے پیمانے پر مزدوروں کی کمی کے نتیجے میں، اضافہ ہوا، اور وہ آنے والی صدیوں میں آہستہ آہستہ نیچے گرتے گئے، اور اسی طرح صرف سترھویں صدی میں جائز ہموار ہوئے۔

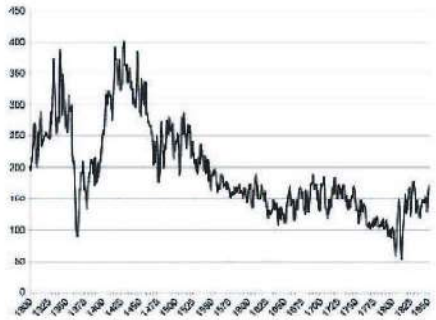

**شکل 8.2:** ہسپانیہ میں حقیقی معاوضہ جات کی شروح 1850-1300 (100=17905)

**ذریعہ:** الواریز۔ نوگل اور ڈی لا ایسکوسورا۔ (2013)

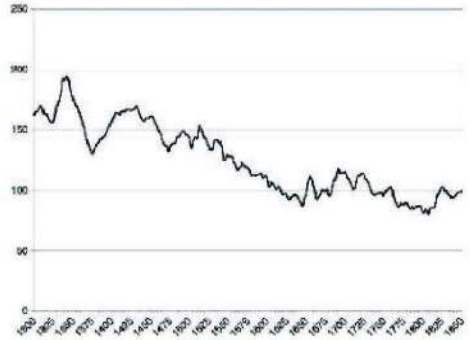

**شکل 8.3:** سپین میں حقیقی فی کس زرعی صرف 1300-1850 (1550s=100)

**ذریعہ:** الواریز۔نوگل اور ڈی لا ایسکوسودا (2013)

یہ بات حیران کُن ہے کہ سپین نے انگلستان اور ڈچ جمہوریہ کی طرح کا راستہ اختیار نہ کیا، خاص طور پر اس بات کے پیشِ نظر کہ سپین کی فی کس قومی مجموعی پیداوار، سولھویں صدی کے زیادہ تر حصے تک انگلستان سے کوئی بہت زیادہ پیچھے نہیں تھی۔ نا صرف یہ کہ انگلستان اور ڈچ جمہوریہ اُن مالتھوسی دباؤں سے بچنے میں کامیاب ہوگئے۔ جنہوں نے آخرکار ہسپانوی معاوضہ جات اور خرچ کو کچل ڈالا، بلکہ سترھویں صدی کے اختتام پر سپین اور اُسی کے شمال مغربی یورپی کے درمیان حقیقی مجموعی قومی پیداوار کے درمیان ایک بہت بڑا فرق پیدا ہوگیا۔ اس فرق کو اس حقیقت کے ساتھ منسوب کیا جاسکتا ہے کہ وہ خصوصیات جو طویلِ مدنی معاشی ترقی کی پیش گوئی کرتی ہیں، سولھویں صدی کے سپین میں ناپید تھیں۔ سپین کی نو دریافت شدہ دولت کو سرمایہ کاری میں لگانے کیلئے کوئی ترغیب نہیں تھی۔ ادارہ جاتی اور معاشی خصوصیات کے سنگم نے دولت کو کہیں اور منتقل کردیا۔ برآمدات کی حوصلہ شکنی اور زمین کی دولت کی حوصلہ افزائی کرنے والے ٹیکس، اہم تجارتی شراکت کاروں کے ساتھ جنگیں اور بڑھتی ہوئی قیمتوں، جامد ہوتے ہوئے معاوضہ جات، اور اضافہ شدہ ٹیکسوں، نے مل کر صنعت میں سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی کی۔ اُس وقت بھی ایسی پالیسیوں کی معاشی کوتاہ اندیشی بغیر توجہ میں آئے نہ رہی۔ اصلاح کاروں کے ایک گروہ نے جو آربیٹرسٹاس (arbitristas) کے نام سے جانا جاتا تھا، نئی دُنیا سے آنے والے سیکٹوں کی درآمد



پر پابندی، پیداکاری کی اہمیت، معاشی اشرافیہ کیلئے زیادہ سیاسی طاقت، اور بہت سی دوسری اصلاحات کی تبلیغ کی، جو امکانی طور پر سپین کی طویل عرصے کے انحطاط کو روک دیں گی۔ (36) لیکن یہ اصلاحی تحریک آخرکار ناکام ہوگئی، کیونکہ، اگرچہ یہ ہسپانوی معیشت کی طویل مدنی صحت کیلئے بہتر تھی لیکن یہ بادشاہ کی اور اُن لوگوں کی جو اس کے اقتدار کو توسیع دیتے تھے، مختصر مدت کے مفادات کو فائدہ نہیں پہنچاتی تھی..... بہترین فلسفیانہ دلائل کو بھی کسی پالیسی میں اپنی راہ بناتے میں مشکلات پیش آتی ہیں، اگر یہ اُن لوگوں کو فائدہ نہ پہنچائیں جو سودابازی کی میز پر ہوں۔ وہ معاشی اشرافیہ جس نے ان معاشی اصلاحات سے سب سے زیادہ فائدہ اُٹھایا جدید سپین کے ابتدائی دور میں ہوتا، بالکل حکمرانی کے اتنے مضبوط توسیع کار نہیں تھے، کہ وہ ان تجاویز کو کوئی موقع دلوا سکتے۔

یاددہانی کیلئے، دو واضح ادارہ جاتی پہلوؤں نے ہسپانوی بادشاہ کو، معاشی اشرافیہ کو بڑی حد تک نظرانداز کرنے کا مواقع فراہم کیا: کورئیز سے بالا بالا محصولات حاصل کرنے کی اس کی صلاحیت اور اس کی مذہبی جواز بخشی۔ آدمی یہ قیاس کرسکتا ہے کہ امریکاؤں سے دھڑا دھڑ آنے والی رقوم اور ہیسبرگ کی طرف سے اطالوی اور جرمن بینکاروں کی طرف سے آنے والے قرضہ جات وہ واحد وجہ تھے جس سے ہسپانوی بادشاہ ہسپانوی معاشی اشرافیہ سے گفت وشنید کرنے سے احتراز کرسکتا تھا۔ تاہم چارلس پنجم اور فلپ دوم کے اقدامات اونچی آواز سے بولتے ہیں: وہ کلیسا کی منظوری حاصل کرنے اور بطور عیسائیت کے محافظین کے اپنے مرتبے کو قائم رکھنے کیلئے مہنگے اقدامات کرتے تھے۔ کلیسا کی عدالت، اخراجات اور انسانی سرمایہ اور مزدوروں کے نقصان کے حوالے سے مہنگی تھی، لیکن ہسبرگوں نے پوری سولھویں صدی میں یہودیوں اور مسلمانوں کو اذیتیں دینے کیلئے اس کا استعمال جاری رکھا۔ چارلس پنجم نے مقدس رومی سلطنت میں تحریکِ اصلاح کلیسا کے پھیلاؤ کے خلاف جنگ ہسپانوی سرمائے سے بڑی اور فلپ دوم نے اسی پالیسی کو زیریں ممالک میں جاری رکھا۔ فلپ دوم کے جانشین، فلپ سوم (عہد 1598-1621) اور فلپ چہارم (1621-1665) نے سپین کو تیس سالہ جنگ (1618-1648) میں گھسیٹا، جو وسطی یورپ میں واقع ہوئی، اور کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جنگجوؤں کے درمیان تصادم میں تبدیل ہوگئی۔ ان میں سے کوئی بھی پالیسی براہِ راست ہسپانوی مفاد میں نہیں تھی..... اگرچہ وہ ہیبرگول کے مفاد

میں تھیں.....اور یہ سب سپین کیلئے مہنگی تھیں۔لیکن سپین کا ان میں ملوث ہونا اس روشنی میں سمجھ میں آتا ہے کہ ہسپانوی بادشاہ کلیسا سے جائزیت حاصل کرتا تھا اور اس کے بدلے میں کلیسا کے مفادات کوتحفظ دینے کیلئےلڑتا تھا۔

آخرکار، ہسپانوی معیشت مطلق اور اضافی دونوں معنوں میں زوال پذیر ہوگئی۔(37) معاشی کامیابی کے کسی بھی پیمانے سے، ہسپانوی معیشت نے سولھویں صدی میں توسیع کے دور کے بعد جدوجہد کی۔ایک عام ہسپانوی 1500 کی نسبت 1820 میں غریب تر تھا، حقیقی معاوضہ جات اُنیسویں صدی کے وسط تک بھی مالی موت سے پہلے کی سطوح تک نہ پہنچے، اور زرعی اشیا کا استعمال دھڑام سے نیچے گر گیا۔اضافی معنوں میں، ہسپانوی معیشت نے بھی نقصان اُٹھایا۔

سپین کا حقیقی فی کس جی ڈی پی، 1570 میں انگلستان کی نسبت تھوڑا سا زیادہ تھا;1700 تک یہ انگلستان کے ساٹھ فیصد تک تھا،اور 1750 تک یہ پچاس فیصد سے بھی کم تھا۔ ہسپانوی فی کس جی ڈی پی 1570 میں ڈچ فی کس جی ڈی پی کی نسبت 78 فیصد تھا،لیکن 1650 تک یہ ڈچ فی کس جی ڈی پی کے 46 فیصد تک گر گیا۔(38) شہر بھی سولھویں صدی کے بعد انحطاط پذیر ہوگئے۔ ہسپانوی شہرکاری کی شرح 1591 میں 14.5 سے گر کر 1750 میں 13.5 ہوگئی;۔ 1594 اور 1694 کے درمیان، ویلاڈولڈ،طلیطلہ،اور سیگو ویا کے شہروں کی نصف سے زیادہ آبادی کم ہوگئی (39) شہری آبادی دوبارہ اٹھارویں صدی کے آخر میں جا کر بڑھنا شروع ہوگئی۔ یہ چیز اُس سے متضاد ہے جو کچھ انگلستان اور نیوز لینڈز میں واقع ہوا، جہاں صنعت کاری کے موقع پر آبادیوں کا طوفان آ گیا۔ یہاں تک ہسپانوی زرعی پیداوار بھی سترھویں صدی میں زوال پذیر ہوگئی۔ انگلستان، ڈچ جمہوریہ اور فرانس سے واضح طور پر برعکس، جن میں سے سب جنہوں نے بہت زیادہ پیداواریت کے فوائد حاصل کیئے۔(40)

سرمایے کے اجتماع،محفوظ حقوقِ ملکیت، اور اُن دوسرے بہت سے پہلوؤں کے پر(مبنی معیشت جو)، عام طور پر طویل مدنی معاشی خوشحالی کے ساتھ منسوب کئے جاتے ہیں،معیشت کوترقی دینے میں سپین کی ناکامی، یورپ کی معاشی تاریخ میں بہت بڑے ''گنوائے گئے مواقع'' کی داستان ہے۔ چندنسلوں تک ایسے محسوس ہوا کہ سپین زبردست ترقی کرنے کے دہانے پر ہے



اور ایک عظیم یورپ کا ایک عظیم معاشی طاقت کا مرکز بننے والا ہے۔اب تک یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ یہ حقیقت کہ ایسا واقع نہ ہوا،اس گہری جڑیں رکھنے والے ادارہ جاتی ڈھانچے کی وجہ سے تھا،جس نے معاشی ترقی میں مدد نہ کی۔ ہسپانوی بادشاہ کی طاقت کا مطلب یہ تھا کہ اُسے معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنے کی ضرورت شاذونادر صرف محصولات حاصل کرنے کیلئے ہوتی تھی۔ یہ ابتدائی جدید سپین کیلئے قسمت کی ستم ظریفی تھی: بادشاہ کی مضبوطی ٹھیک وہ چیز تھی جس نے سپین کی طویل مدنی کمزوری میں سہولت پیدا کی۔

www.MashalBooks.org

# سلطنتِ عثمانیہ میں مذہبی جواز بخشیِ اقتدار اور معاشی جمود

عثمانی سلطان کے بارے میں بھی یہ سوچنا کہ وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے پر لگی ہوئی پابندیوں کے مسئلے کو حل کر رہا تھا، اُتنا ہی مفید ہے جتنا کہ انگلیسی، ڈچ یا ہسپانوی حکمرانوں کے بارے میں سوچنا تھا۔ سلطان نے اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کے لیے اُن بہترین قوانین اور پالیسیوں کا انتخاب کیا جو وہ کرسکتا تھا، جو اُن پابندیوں کے ساتھ مشروط تھیں جن کا اُسے اپنے توسیعی کارندوں کی طرف سے سامنا تھا۔ تاہم سلطان کی پابندیاں اُن پابندیوں سے بہت مختلف تھیں جن کا سامنا مغربی یورپی حکمرانوں کو تھا، خاص طور پر پرٹسٹنٹوں کو۔ ان پابندیوں کے درمیان اختلافات اتفاقی نہیں تھے: وہ ''راستے پر منحصر'' اقدامات کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ تھے، جن میں سے بہت سوں کو یہ کتاب نمایاں کرتی ہے۔ یہ حصہ وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ وہ اختلافات کیا تھے، وہ کیوں پیدا ہوئے اور اُن کے معاشی نتائج۔ سولھویں صدی کے آغاز سے، عثمانی ایک ایسی وسیع اور مختلف الاجزا سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔ جس میں عرب، تُرک، سلاو، مسلمان اور عیسائی اور یہودی شامل تھے۔ اُن کے نسلی اور بہت سے علاقوں کی مذہبی ساخت کے اختلافات کا مطلب یہ تھا کہ جو چیز بعض علاقوں میں موثر طور پر توسیع حکمرانی کا کام کرتی تھی۔ بعض دوسرے علاقوں میں کم موثر تھی۔ بلاشبہ اسلامی علما کی طرف سے جواز بخشی اقتدار صرف اُن جگہوں پر موثر تھا جہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمان تھی۔ برکن (Barkan)(1970) کے مطابق پندرھویں صدی میں استنبول سے باہر تقریباً 60 فیصد عثمانی گھرانے اور مسلمان تھے۔ اگرچہ پوری سلطنت میں بہت زیادہ تنوع تھا۔ 1520 کی دہائی تک، عثمانیوں نے اُن جنوب مشرقی یورپی شہروں پر حکومت کی جہاں تقریباً کوئی مسلمان نہیں تھا، جیسا کہ ایتھنز، جبکہ دوسرے جنوب مشرقی یورپی شہر بڑی حد تک مسلمان تھے۔ دیکھئے جدول 8.3) یہاں تک کہ اناطولیہ میں صرف 58 فیصد مسلمان (جدید دور کا ترکی) میں بھی، عیسائی بہت سے شہروں بشمول استنبول کے صرف 58 فیصد مسلمان تھا آبادی



کا ایک غیر معمولی حصہ تھے۔ دوسری طرف، مسلمان عرب صوبوں میں بہت زیادہ آبادی میں تھے (دیکھئے جدول 8.4) اس کا مطلب ہے کہ مذہبی حکام بعض مقامات پر اچھے توسیع کار تھے..... عرب صوبوں اور اناطولیہ کے کچھ حصوں میں .....لیکن دوسرے علاقوں میں جائزیت مہیا کرنے میں بہت کم موثر تھے۔ (41)

**جدول 8.3:** بڑی بڑی عثمانیہ شہری آبادیوں کی مذہبی ساخت (1520-1535)

| شہر | مسلمانوں کا حصہ | عیسائیوں کا حصہ | یہودیوں کا حصہ |
|---|---|---|---|
| ترکی | | | |
| قونیہ | 98.0% | 2.0% | 0.0% |
| برصہ | 97.1% | 1.1% | 1.8% |
| انقرہ | 88.7% | 10.2% | 1.0% |
| ایڈرن | 82.2% | 12.9% | 4.9% |
| استنبول | 58.3% | 31.6% | 10.1% |
| ٹوکاٹ | 53.9% | 46.1% | 0.0% |
| سیواس | 25.8% | 74.2% | 0.0% |
| یونان | | | |
| یَریسا | 92.2% | 9.8% | 0.0% |
| سَیرلیس | 61.4% | 32.7% | 5.9% |
| نیکوپولس | 37.7% | 62.3% | 0.0% |
| ٹریکالا | 36.5% | 41.6% | 21.9% |
| تھیسالونیکی | 25.3% | 20.3% | 54.4% |
| ایتھنز | 0.5% | 99.5% | 0.0% |

www.MashalBooks.org

| | | | |
|---|---|---|---|
| جنوب مشرقی یورپ (یونان کے علاوہ) | | | |
| موناسٹر | 75.7% | 20.2% | 4.0% |
| سکوپجے | 74.8% | 23.8% | 1.4% |
| صوفیہ | 66.4% | 33.6% | 0.0% |

**ذرائع**: برکن (1970) ویسٹ کاٹ (2013)

**جدول 8.4:** بعض عرب صوبوں کی مذہبی ساخت قریباً 1570-1590

| شہر | جدید ملک | مسلمانوں کا حصہ | عیسائیوں کا حصہ | یہودیوں کا حصہ |
|---|---|---|---|---|
| بصرہ | عراق | 100.00% | 0.0% | 0.0% |
| حلب | شام | 97.3% | 2.6% | 0.2% |
| بغداد | عراق | 93.2% | 5.9% | 0.9% |
| دمشق | شام | 91.1% | 7.8% | 2.1% |
| طرابلس | لیبیا | 76.4% | 23.0% | 0.6% |

ذرائع: برکن (1970) ویسٹ کاٹ (2013)

وقت کے ساتھ ساتھ، بہت سے سابقہ عیسائی صوبوں میں مسلم آبادی کا حصہ بڑھ گیا، اور اس طرح مذہبی جواز بخشی اقتدار کے موثر میں اضافہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ ایتھنز بھی، جس میں سولھویں صدی کے آغاز میں بہت کم مسلمان تھے، 1675 تک 29 فیصد تک مسلمان ہو چکا تھا۔ زیادہ عمومی طور پر، سولھویں اور سترھویں صدیوں کے دوران، یورپ روز افزوں مسلمان ہوتا گیا، خاص طور پر بڑے شہروں میں مسلمانوں کی آبادی بڑھتی گئی۔ (دیکھئے جدول 8.5) اس نے ٹھیک اُن علاقوں میں مذہبی جواز بخشی اقتدار کے موثرین کو بڑھا دیا، جہاں ابتدائی عثمانی دور میں یہ سب سے کم موثر تھی۔



**جدول 8.5:** سولھویں سترھویں صدیوں میں مسلمان آبادی کا حصہ، منتخب جنوب مشرقی یورپی شہروں میں۔

| شہر | سولھویں صدی میں مسلمانوں کا حصہ | سترھویں صدی میں مسلمانوں کا حصہ | مشاہدہ کے سال |
|---|---|---|---|
| ایتھنز | 5% | 29% | 1540, 1675 |
| بلغراد | 29% | 78% | 1536, 1660 |
| ایونینا | 4% | 49% | 1564, 1670 |
| نِکوسیا | 15% | 50% | 1596, 1683 |
| پَرزرَن | 40% | 80% | 1530, 1643 |
| سرائیوو | 27% | 98% | 1477, 1600 |
| سیریز | 55% | 70% | 1500, 1659 |

**ذرائع**: ویسٹ کاٹ (2013)، بیرمین اے آل۔ (2005)

پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں، عثمانیوں کی فوجی طاقت اور مذہبی جائزیت کے اختلاط نے اُنہیں توسیعی فتوحات کا آغاز کرنے کا موقع دیا۔ عثمانیوں نے اُنہیں توسیعی فتوحات کا آغاز کرنے کا موقع دیا۔ عثمانیوں نے ترکمان فوجی اشرافیہ کے ساتھ سودا بازی کر کے فوجی طاقت حاصل کی، جس نے نومفتوحہ علاقوں میں زمین کے بدلے سلطان کی توسیع پسندانہ کوششوں کی مدد کی۔ نتیجے کے طور پر، سلطنتِ عثمانیہ کا حجم اس کی پہلی چند صدیوں میں بہت زیادہ پھیل گیا۔ شمال مغربی جزیرہ نمائے انا طولیہ (ترکی) میں توسیع کے ابتدائی سالوں کے بعد عثمانیوں نے جزیرہ نمائے بلقان کو اور باقی ماندہ جزیرہ نمائے انا طولیہ کو پندرھویں صدی کے وسط تک فتح کر لیا۔ عثمانیوں نے سولھویں صدی میں اپنی سلطنت کو ان علاقوں کے فتح کرنے سے توسیع دی: جدید دور کے ہنگری، رومانیہ، مالدووا، آذربائیجان، آرمینیا، عراق، شام، لبنان، اُردن، اسرائیل، جزیرہ نمائے عرب کے کچھ حصے (بشمول مکہ اور مدینہ کے) اور تقریباً پورے شمالی افریقہ کے ساحل کے۔
(دیکھئے شکل 8.1)

اپنے مغربی یورپی حریفوں کی طرح، عثمانی بھی سولھویں صدی میں مسلسل جنگ میں اُلجھے ہوتے تھے۔ جنگیں رقم کا تقاضا کرتی تھیں، اور اُن کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے عثمانیوں

www.KitaboSunnat.com

نے، اپنے وسیع ہوتے ہوئے صوبوں کے وسائل کو اُنڈیلا۔ اُن کی مالیاتی مشینری سولھویں صدی میں یورپ کی بڑی طاقتوں کی مشینری کے برابر تھی۔ صرف فرانس ہی اس قابل تھا کہ وہ معنی خیز حد تک عثمانیوں کی نسبت زیادہ محصولات جمع کرنے کے قابل تھا، اگرچہ یورپی ریاستیں فی شہری کے حساب سے کہیں زیادہ محصولات اکٹھا کرنے کے قابل تھے بہ نسبت عثمانیوں کے (دیکھئے جدول 8.6) بلاشبہ، عثمانیوں کے ہاتھ میں اُس سے تین گنا محاصل کی رقوم تھیں، جتنی کہ 1550 کی دہائی میں انگلیسیوں کے ہاتھ میں تھیں، اور وینس کے لوگوں کی نسبت دوگنا محصولات تھے، جو مشرقی بحیرۂ روم میں غلبے کی جدوجہد میں اُن کے انتہائی اہم حریف تھے۔ دوتہائی سے لے کر تین چوتھائی تک ٹیکس کے محصولات ٹیمار کے ذریعے حاصل ہوتے تھے جو کہ ایک فوجی پٹے کا ٹھیکہ تھا، جس کے ذریعے صوبائی گھڑسوار فوجی، ریاست کیلئے اپنی فوجی خدمات کے صلے میں کسانوں سے براہِ راست زرعی ٹیکس وصول کرتی تھی۔ (42) ٹیمار کا نظام جاگیردارانہ یورپ کے ٹیکس وصولی کے نظام کی مانند تھا، جہاں جاگیردار فوجی خدمات کے عوض محاصل کو کنٹرول کرتے تھے۔ ٹیمار کے نظام کا عثمانیوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ وہ اُنہیں اپنی فوجی کو کرنسی کی قلت کا سامنا ہونے کے باوجود کسانوں کیلئے کرنسی میں ٹیکس کی ادائیگی کو ناممکن بنا دیتی تھی، معاوضہ جات ادا کرنے کے قابل بنا دیتا تھا۔ مذہبی قانون دان (قاضی) اس بات کا اختیار تفویض کرتے تھے کہ کون ٹیکس وصول کرے گا، اور تمام جاگیردارانہ آمدنیاں اور مراعات سلطان سے آتی تھیں۔ (43) کسی علاقے میں ان قانون دانوں اور ٹیمار کے حاملین کو بہت زیادہ طاقتور ہونے سے روکنے کیلئے، سلطان ان دونوں چیزوں کو کم از کم ہر تین سال کے بعد گھماتے رہتے تھے۔ (44)

**جدول 8.6:** ریاستی محصولات 1559-1550، سالانہ اوسطیں (کُل) چاندی کے ٹنوں میں اور (فی کس) چاندی کے گراموں میں

| | کُل ٹیکس محاصل | فی کس ٹیکس محاصل |
|---|---|---|
| فرانس | 151.6 | 10.9 |
| سپین | 107.1 | 19.1 |
| سلطنت عثمانیہ | 106.1 | 5.6 |



| | | |
|---|---|---|
| وینس | 48.9 | 29.9 |
| انگلستان | 35.9 | 8.9 |
| پولینڈ۔لیتھوانیا | 6.5 | 0.9 |

**ذرائع:** کارامان اور پامک (2010)۔

باب پنجم نے اس طرف توجہ دلائی کہ عثمانیوں کیلئے مذہبی جواز بخشی اقتدار کس قدر اہم تھی، خاص طور پر قسطنطنیہ (1453) (1517) مکہ اور مدینہ کی فتوحات کے بعد۔ ان فوجی کامیابیوں نے سلطانوں کو اقتدار کا مذہبی جواز عنایت کیا، باوجود اس کے کہ اُن کے پاس نہ تو پیغمبرؐ تک خونی رشتہ تھا، نہ ہی عرب ورثہ تھا۔ اُنہوں نے اپنی مذہبی جواز بخشی کو، قوانین اور پالیسیاں بنانے میں ''مسلم کا کردار'' ادا کر کے، تقویت دی، جو کہ کسی حکمران کیلئے ایک لازمی کام تھا، جو اسلامی مذہبی حاکمیت سے جواز حاصل ہونے کا دعویٰ کرتا (دیکھئے باب 3) عثمانیوں نے مذہبی حاکمیت کی مزید حمایت، اُنہیں حکومت میں لا کر، حاصل کی، جس نے مذہبی علما کو اُن کی قوانین اور پالیسیوں کی عوامی منظوری دے کر، اُن کی مزید حمایت حاصل کی، پندرھویں صدی کے اواخر میں عثمانیوں نے مفتی اعظم کا منصب قائم کیا، جو کہ ایک طاقتور منصب تھا، جو مذہبی قانون دانوں کے سلسلۂ مراتب کی نگرانی کرتا تھا۔

مذہبی حاکمیت کو ریاست میں لانے سے اُن کی جواز بخشی اقتدار کی صلاحیت کم ہوگئی۔ کیونکہ مذہبی انتظامیہ کو سلطان کے ماتحت تصور کیا جاتا تھا، لہٰذا مذہبی حاکمیت اب جواز بخشی اقتدار کا آزاد ذریعہ نہیں تھا، جتنا کہ اسلامی علما کی جماعت گزشتہ صدیوں میں ہوتی تھی۔ یہ عثمانیوں کی طرف سے چچاتُلا فیصلہ تھا، جس کے لحاظ سے، ریاست کے اندر، دو عوامل نے مذہبی مرکزیت کے فوائد کو، کمزور شدہ دو عوامل نے مذہبی مرکزیت کے فوائد کو، کمزور شدہ جواز بخشی کی صلاحیت کے نقصانات سے زیادہ کر دیا، اوّل، ایک بڑھتی ہوئی، اور مختلف الاجزا سلطنت کو ایسے عدالتی فیصلوں کی ضرورت تھی، جو ماحولیات کے ایک حلقے میں عثمانیہ پالیسی کی حمایت کریں۔ ایک ایسی انتظامیہ پیدا کر کے جس میں اعلیٰ مناصب طاقت دولت اور وقار حاصل کریں، عثمانیوں نے ہر مرتبے کے قانون دانوں کو اپنی پالیسیوں کی حمایت کرنے کی ترغیب پیدا کر دی؛ کوئی بھی قانون

دان، جو عثمانیہ پالیسی کو چیلنج کرتا، سلسلۂ مراتب کے اندر ترقی نہیں کرسکتا تھا۔ دوم اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عثمانیوں نے متنازعہ پالیسیاں اپنائیں.....خاص طور پر علاقائی توسیعی کے سلسلے میں .....جن میں سے بہت سی اسلام کی حکم عدولی کرتی تھیں۔ اتنا جلدی جتنا کہ 1485، عثمانیوں نے اپنی نگاہیں مسلم مملوک سلطنت پر حملہ کرنے پر ٹکائی تھیں، جو مصر، مشرقِ وسطیٰ کے کچھ حصوں، اور مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر کنٹرول رکھتی تھی۔ 1517 تک عثمانیوں نے مملوکوں کو فتح کرلیا۔ ایک دوسری مسلم ریاست کے خلاف جنگ واضح طور پر عثمانی مذہبی حاکمیت کی حمایت کی متقاضی تھی۔ کیونکہ مسلمانوں پر حملہ کرنے اور اُنہیں قتل کرنے کا جواز لانا، اسلامی تناظر میں، بہ نسبت اسلام سے باہر کی دُنیا کی ریاستوں پر حملہ کرنے کے زیادہ مشکل تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد (1555 -1532) عثمانیوں نے اپنے مشرقی جانب ایک اور مسلم سلطنت پر حملہ کردیا، فارسی صفویوں پر۔ مختصر یہ کہ یہ جنگیں ''ایک اچھے مسلمان کا کردار ادا کرنے'' سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ عثمانیوں کیلئے ایک ایسی کمزور مذہبی حاکمیت رکھنا جو اس کے فیصلوں کی حمایت کرے۔ ایسی طاقتور لیکن آزاد مذہبی حاکمیت رکھنے سے زیادہ فائدہ مند تھا، جو اس کے توسیع پسندانہ عزائم کی حمایت نہ کرے۔

سلطان اور مذہبی حاکمیت کے درمیان ہم زیستی کے تعلق کی بہت مشہور مثال طاقتور مفتی اعظم ابوسعود کی طرف سے پیش کی گئی، جو اہم سلطان سلیمان اول کی حکومت میں (عہد 1520- 1566) بنیادی مذہبی اہلکار تھا۔ ابوسعود سلطان کی خواہش کو حنفی اسلامی قانون کے ساتھ، ہم آہنگ کرنے کیلئے مشہور تھا، جو اتنی دور تک چلا گیا کہ سلیمان اول کو خلیفہ کے لقب کا جواز پیش کردیا، باوجود اس کے عثمانیوں کا (حضرت) محمدؐ کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ عرب تھے۔ ابوسعود، دوسرے مفتیان اعظم کی طرح، نظم ونسق کے معاملے میں بھی، قبضہ چھوڑنے کیلئے آمادہ تھا: اُس نے جُرم، جائیداد، وقف، ٹیکسوں، اور شادی بیاہ کے قوانین کو سلطان کی خواہشات کے حق میں اور ایک ایسے طریقے پر منظّم کیا جو اسلامی قانون سے ہم آہنگ تھا۔ (45)

سلطان کی، مذہبی حاکمیت کو سنبھالنے اور اس کے ساتھ ساتھ صوبائی فوجی اشرافیہ سے حمایت حاصل کرنے کی صلاحیت کے معاشی نتائج تھے۔ بہت سے مغربی یورپی حکمرانوں کے خاص طور پر پروٹسٹنٹوں کے برعکس، عثمانیوں کو اپنی حکمرانی کی توسیعی، یا ٹیکس کے محصولات حاصل



کرنے کیلئے معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عثمانیوں نے مقامی زمینداروں کو کبھی مراعات نہیں دیں.....وہ مراعات دیتے تھے، خاص طور پر ٹیمار سسٹم کے تحت، نہ ہی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانوں نے کبھی بھی غیر عثمانیوں معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید نہیں کی.....اُنہوں نے گفت وشنید کی، اور جونہی اٹھارویں اور اُنیسویں صدیوں میں عثمانیہ معیشت کمزور ہوتی، تو سلطانوں نے غیر ملکی تاجروں کی کاروباری مراعات کو معاہدات کے ذریعے وسیع کیا، یہاں نکتہ صرف یہ ہے کہ عثمانی معاشی اشرافیہ..... تاجروں، صرافوں، اور صنعتکاروں.....کا حکومتی پالیسیوں میں بہت کم عمل دخل ہوتا تھا۔

یہ چیز مغربی یورپی حکمرانوں کے ساتھ ایک واضح تقابل رکھتی ہے، یہاں تک کہ کیتھولک حکمرانوں کے ساتھ بھی، جنہوں نے پارلیمانوں میں معاشی اشرافیاؤں کے ساتھ اتنی جلدی جتنا کہ بیسویں صدی، گفت وشنید شروع کردی تھی۔ یورپی حکمرانوں نے، محاصل اور سیاسی توسیع کاری کے بدلے میں، پارلیمانوں میں معاشی اشرافیہ کیلئے حقوقِ ملکیت اور لوگوں پر حقوق میں، مختلف اوقات ہیں، کچھ نہ کچھ چھوڑ دیا۔ یہ چیز تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد خاص طور پر صحیح تھی۔ جب کلیسا نے پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو اقتدار کا جواز بخشنے کی صلاحیت کھودی۔ لیکن سلطنتِ عثمانیہ میں پارلیمان سے مشابہہ کوئی ادارہ نہیں تھا۔ کوئی ایسے گروپ نہیں تھے جو بادشاہ کو محدود کرنے کیلئے باقاعدہ طور پر اجلاس کرتے ہوں۔ یہ چیز جزوی طور پر اس وجہ سے تھی کہ ایسے کوئی آزاد شہر نہیں تھے جن کے ساتھ گفت وشنید کی جاتی (46) لیکن سترھویں صدی سے پہلے سلطان کو معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کی وجہ سادہ ہے: سلطان کو معاشی اشرافیہ کیلئے کوئی حقوق چھوڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کیونکہ وہ محاصل اور جائزیت اُس کے بغیر بھی حاصل کرسکتا تھا۔

عثمانی سلطانوں پر پابندیاں پتھر پر لکیر نہیں تھیں۔ اُن ادارہ جاتی تبدیلیوں پر جو سترھویں صدی میں واقع ہوئیں، تھوڑی سی توجہ مرکوز کرنے سے یہ دیکھنا ممکن ہے کہ یہ پابندیاں وقت کے ساتھ ساتھ کیسے تبدیل ہوئیں۔ عثمانیوں کی توسیع کا طریقہ کار اس صدی کے دوران ڈرامائی طور پر تبدیل ہوگیا، کیونکہ مغربی یورپ اور صفوی سلطنت کی طرف سے پیچھے دھکیلے جانے کی وجہ سے فتح کے ذریعے عثمانی توسیع کم ہونا شروع ہوگئی۔ اسی اثنا میں، جب عثمانیوں نے، بڑھتی ہوئی یورپی

طاقتوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی خاطر ایک مستقل قائمہ فوج کی ضرورت کا احساس کیا، تو جنگ کے اخراجات بڑھنے لگ گئے۔ فتح کے محصولات تک کم رسائی، اور جنگ کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے عثمانیوں کی مالی صورتِ حال کو تبدیل کر دیا۔ سترھویں صدی کے وسط تک عثمانی، یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں کی نسبت، واضح طور پر کم محصولات حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ سلطنتِ عثمانیہ کی آبادی انگلستان کی آبادی سے چار گُنا اور ڈچ جمہوریہ کی نسبت دس گُنا زیادہ تھی۔ لیکن عثمانی، 1650 کی دہائی تک اپنے شہریوں سے، ان دو اقوام کی نسبت کم ٹیکس اکٹھا کر رہے تھے۔ (دیکھئے جدول 8.7)

**جدول 8.7:** سترھویں صدی میں ریاستی محاصل، سالانہ اوسطیں چاندی کے ٹنوں میں (کُل) اور (فی کس) چاندی کے گراموں میں ہیں۔

| | کل ٹیکس کے محاصل | | فی کس ٹیکس کے محاصل | |
|---|---|---|---|---|
| | 1600-1609 | 1650-1659 | 1600-1609 | 1650-1659 |
| سپین | 430.8 | 412.7 | 62.6 | 57.3 |
| فرانس | 29.2 | 1053.7 | 18.1 | 56.5 |
| سلطنتِ عثمانیہ | 122.6 | 150.1 | 5.8 | 7.4 |
| ڈچ جمہوریہ | 116.8 | 213.9 | 76.2 | 114.0 |
| وینس | 67.6 | 68.0 | 37.5 | 42.5 |
| انگلستان | 65.7 | 196.1 | 15.2 | 38.7 |
| پولینڈ لیتھوانیا | 15.2 | 39.9 | 1.6 | 5.0 |
| پرشیا | 3.5 | 6.3 | 2.4 | 9.0 |

**ذرائع:** کارامان اور پامک (2010)

ان وجوہات کی بنا پر سترھویں صدی میں، عثمانیوں نے ٹیکس وصولی کے نظام اور اور مقامی نظم ونسق دونوں کو غیر مرتکز کر دیا۔ وہ اپنی حکمرانی کی توسیع اور ایسے علاقوں میں ٹیکسوں کی وصولی، جو استنبول سے آسانی سے کنٹرول نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اس کیلئے، مقامی دلالوں، جنہیں ''سرکردہ



لوگ'' (اعیان) کہا جاتا تھا، متوجہ ہوئے۔ عثمانیوں نے اعیان کو کئی مقاصد کیلئے ملازمت میں رکھا: ٹیکسوں کی وصولی، فوجوں کو متحرک کرتے، عوامی نظم ونسق قائم کرنے اور شہری تنازعات کو حل کرنے کیلئے۔ (دیکھئے باب 6) اعیان کسی نہ کسی قسم کی مقامی، سماجی، معاشی سیاسی طاقت رکھتے تھے۔ وہ اشراف تھے۔ جن کی حیثیت اُن کے نظم ونسق قائم کرنے کی صلاحیت کے رہینِ منت تھی۔ عثمانیوں نے ابتدائی طور پر اپنی مالی اور قانون حیثیت کو اس طرح غیر مرتکز کیا کہ اُنہوں نے اعیان کو، پیشگی نقد ادائیگی کے بدلے ایک سال کیلئے اجرت اور ٹیکس وصولی کا اختیار دے دیا۔ جوں جوں مالی تقاضے بڑھتے گئے۔ انہوں نے ان ٹھیکوں کے دورانئے کو بڑھا دیا۔ کیونکہ ایسی کوئی سرمائے کی مارکیٹیں نہیں تھیں جہاں سے ریاست بڑے پیمانے پر قرض لے سکتی، لہٰذا ان ٹھیکوں کو توسیع دینا ہی ایک ایسا طریقہ تھا جو عثمانیوں کو، مستقبل کے ٹیکس محاصل کو ایک ضمانت کے طور پر استعمال کر کے، رقم کی بڑی مقدار میں قرض پر لینے کا موقع دیتا تھا۔ 1695 میں شروع کر کے، ریاست ایک ایسے ادارے کے تحت جسے ''مالکانہ'' کہا جاتا تھا، زندگی بھر کی ٹیکس وصولی کے اجازت ناموں کے بدلے چھوٹی مدت کی بڑے پیمانے پر ادائیگیوں کا تقاضا کرتی تھی۔

سطحی طور پر توسیع حکمرانی کی کہ مذہبی اور فوجی اشرافیاؤں سے، اعیان کی طرف تبدیلی، اُن مابعد اصلاحِ کلیسا کی تبدیلیوں کے مشابہہ نظر آتی ہے، جو یورپ میں واقع ہوئیں، جہاں پارلیمانوں نے، بادشاہوں کو سرمایہ مہیا کرنے اور توسیع حکمرانی کرنے میں ایک بڑا کردار ادا کیا۔ پروٹسٹنٹ یورپ اور سلطنتِ عثمانیہ دونوں میں، حکمرانوں نے محاصل تک رسائی بڑھانے کیلئے اختیار کی قربانی دی۔ تاہم اعیان اور مغربی یورپ کی پارلیمانوں کے درمیان دو بنیادی اختلافات تھے۔ ایک بات یہ تھی کہ، اعیان ایک گروپ کے طور پر اجتماعی طور پر منظّم نہیں ہوتے تھے، لہٰذا وہ سلطان کے ساتھ سودا بازی نہیں کر سکتے تھے، نا ہی اُن پر پابندی عائد کر سکتے تھے۔ سترھویں صدی سے پہلے، سلطان کو مقامی اشراف کے ساتھ سودا بازی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، کیونکہ وہ محاصل اور صوبائی فوج کی حمایت، اُنہیں ٹیکس وصولی کے اجازت نامے اور مستقبل کی فتح کے وعدے دے کر، حاصل کر سکتا تھا۔ سلطان اور فوجی اشرافیہ کے درمیان تعلق کی بنیاد فرد تھا نہ کہ گروہ۔ فوجی اشرافیہ، اپنے ٹیکس وصولی کے اجازت ناموں کیلئے اجتماعی طور پر سودا بازی نہیں کرتے تھے..... سلطان ہر رُکن کو اُس کی اپنی جاگیر مہیا کر دیتا تھا۔ یورپی حکمرانوں

کے برعکس جو کبھی کبھار اپنی جائزیت کیلئے سنجیدہ دھمکیوں کا سامنا کرتے تھے، جو اُنہیں اشراف کے ساتھ بطور گروپ کے سودا بازی کرنے پر مجبور کر دیتی تھیں، عثمانیوں کو 1453 میں قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد اپنی جائزیت کیلئے ایسا کوئی سنجیدہ خطرہ درپیش نہ ہوا(47)۔لہٰذا سلطانوں نے، اپنے مغربی یورپ مثیلوں کی حد تک معاشی اشرافیہ کو مراعات کی قربانی کبھی نہ دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب سترھویں صدی میں فتوحات رُک جانے کے بعد عثمانیوں کی مالی حالت انحطاط پذیر ہوئی، تو سلطان کے ساتھ سودا بازی کیلئے اشرافیاؤں کا کوئی ادارہ جاتی مجموعہ نہیں تھا۔ لہٰذا سلطانوں نے اعیان کی طرف رُخ کیا۔ جو وہ واحد لوگ تھے، جو بغیر فوجی طاقت کے ٹیکس وصول کر سکتے تھے، کیونکہ وہ ایک سماجی درجہ رکھتے تھے۔

نظری طور پر اعیان، سلطان کے ساتھ اجتماعی طور پر سودا بازی کرنے کیلئے اکٹھے ہو کر جتھا بنا سکتے تھے۔ مثال کے طور پر وہ اپنے ٹیکس کے حلقوں کو متحد کر کے بڑے حلقے بنا سکتے تھے، جو سلطان کے مقابلے میں اُن کے مفادات کو متحد کر دیتے۔ ایلیانا بالا اور نویل جانسن (2009) (Eliana Balla and Nocl Johnson) یہ تحریر کرتے ہیں کہ سترھویں صدی میں فرانس کے ٹیکس وصول کنندگان نے ایسا کیا اور اس طرح بادشاہ پر پابندی لگانے کا اختیار حاصل کر لیا۔ اپنے اپنے ٹیکس کے حلقوں کو ایک بڑی شراکت میں مجتمع کر کے، جسے کمپنی آف جنرل فارمز کہا جاتا تھا، فرانسیسی ٹیکس وصول کنندگان مشترکہ طور پر بادشاہ کے محاصل کو روک سکتے تھے، اگر بادشاہ اُن کی خواہشات کے خلاف عمل کرتا۔ دوسری طرف عثمانی ٹیکس وصول کنندگان، اسی طرح اجتماعی طور پر عمل کرنے کا جذبۂ محرکہ کم ہی پاتے تھے۔ ایک بات یہ ہے کہ اسلامی قانون ایسی شراکت کے جذبۂ محرکہ کو روکتا تھا۔ اسلامی قانون جائیداد کو ایک پہلے سے طے شدہ کلیے کے مطابق، تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور کوئی بھی وارث حاصل ہونے والے کسی حصے کی شراکت کو تحلیل کر سکتا تھا (48) لہٰذا، مختلف مقامات میں تعلق رکھنے والے ایسے ٹیکس وصول کنندگان کی شراکت جو ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں، ایک بہت زیادہ نقصان کے خطرے سے دوچار ہوتی، کیونکہ کسی رُکن کی وفات پر کوئی وارث شراکت کو تحلیل کر سکتا تھا۔

پھر بھی، خواہ اسلامی قانون بڑی شراکتوں کے حق میں بھی ہوتا، تو بھی سلطنتِ عثمانیہ کے اعیان کے ہاں اجتماعی طور پر عمل کرنے کا جذبۂ محرکہ اس سے کم تر ہوتا، جتنا یورپی ٹیکس کنندگان



کے ہاں تھا۔ اعیان کو اپنے خاندانی شجرہ کی وجہ سے مقامی آبادی پر اثر و رسوخ حاصل تھا...... وہ اکثر اوقات سلطان کے وفادار دستے کے ارکان کی اولاد تھے......لہٰذا وہ سلطان کے مقابلے میں اُس کی نسبت بہت زیادہ سودا بازی کی پوزیشن میں تھے۔ جتنا افرادی طور پر یورپی ٹیکس وصول کنندگان بادشاہ کے مقابلے میں تھے۔ اگر سلطان اعیان کے حقوق سے تجاوز کرتا یا بہت زیادہ جبری وصولیوں کیلئے کہتا، تو اعیان اُس کو بالکل نظر انداز کر سکتے تھے، جبکہ وہ اپنے علاقے پر کنٹرول قائم رکھ سکتے ایسا درحقیقت عام طور پر ہوتا تھا۔ اعیان اکثر اوقات اپنے ٹیکس کے حلقوں کو اپنے وارثین کو منتقل کر دیتے تھے، بجائے اُنہیں ریاست کو واپس کرنے کے اور اس طرح سلطان کو ان حلقوں سے محاصل وصول کرنے سے معذور کر دیتے تھے۔ بعض اعیان محاصل کو سلطان کے پاس بھیجنا بالکل ہی بند کر دیتے تھے۔ (49) اس سے ریاست کے محاصل خاصی حد تک کم ہو جاتے تھے......عثمانیوں کے ٹیکس کے محاصل سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں گزشتہ صدیوں کی نسبت بہت کم ہو گئے تھے......اور اس نے آخر کار ''مارکانہ'' نظام کو ناکام بنا دیا، جسے عثمانیوں نے، معاشی اصلاحات کے ایک وسیع تر سلسلے کے طور پر 1840 کی دہائی میں بتدریج ترک کر دیا۔(50)

اعیان اور مغربی یورپی پارلیمانوں کے ارکان کے درمیان ایک اور اہم فرق تھا: اعیان کو شاذ ہی کاروباری سرگرمیوں سے کوئی غرض ہوتی تھی...... کچھ کاروباری زراعت میں مشغول تھے، لیکن وہ اعیان بنیادی طور پر نقد آور فصلوں کو، عیسائی تاجروں کو استعمال کرتے ہوئے یورپ میں فروخت کر دیتے تھے۔ کچھ دوسرے اعیان بھی تجارت میں مشغول تھے۔ لیکن یہ نسبتاً کم عام تھی۔ اعیان عام طور پر اپنے مناسب انتظامی عہدیداروں کے ذریعے یا خاندان اور قبائلی تعلقات کے ذریعے حاصل کرتے تھے...... تاکہ معاشی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے۔ بلاشبہ، عثمانیوں کے ٹیکس وصولی کے انتظامات کی غیر مرتکز نوعیت، اور ٹیکس وصولی کے حلقوں پر کمزور حقوقِ ملکیت نے خراب محرکات پیدا کئے۔ اُجرت پر ٹیکس وصولی، زراعت، تجارت یا صنعت میں سرمایہ کاری کرنے کی نسبت زیادہ نفع بخش تھی۔ کیونکہ ٹیکس وصولی کے حلقوں پر حقوقِ ملکیت غیر محفوظ تھے......اٹھارویں صدی میں سلطان اکثر اوقات ٹیکس وصولی کے حلقوں کو ضبط کر لیتا تھا......لہٰذا اعیان عام طور پر کاروبار کی قیمت پر جبری طور پر ٹیکس کے محاصل جمع کرنے پر توجہ مرکوز کرتے تھے۔ اگرچہ زیادہ کاروباری سرگرمی کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں زیادہ ٹیکس وصول ہوں گے،

لیکن ٹیکس وصولی کنندگان کو اس بات کا یقین نہیں ہوتا تھا کہ سلطان کامیاب ترین ٹیکس وصولی کے حلقوں کے اثاثہ جات کو ضبط کرنے سے باز رہے گا۔(51)

نتیجے کے طور پر، تاجروں، صنعتکاروں اور صرافوں کو حکومت میں کبھی وہ اہمیت حاصل نہ ہوئی جو مقامی معاشی مسائل پر اُن کے اختیار سے قریبی مشابہت رکھتی، اور یقیناً اُن کے اندر اپنے یورپی مثیلوں کی نسبت پالیسی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت کم تھی۔(52) خلاصہ یہ کہ پالیسیاں معاشی اشرافیہ کی قیمت پر ریاست اور اعیان کے حق میں ہوتی تھیں۔ نجی سرمایے کے اجتماع کو روکنے اور ریاست کی زمین اور دیگر جائیداد کی ملکیت کو فروغ دینے کی پالیسیاں سلطنت کی 600 سالہ تاریخ میں زیادہ تر عرصے تک قائم رہیں .....حقوق ملکیت انتہائی بے قاعدہ تھے اور سلطان ضرورت کے وقت اُنہیں واپس لے سکتا تھا۔ مثال کے طور پر محمد ثانی (عہد 1444-1446 اور 1481-1451) نے اپنے عہد کے دوران متعدد مرتبہ نجی مالکان اور اوقاف دونوں کی ملکیتی زمینوں کو ضبط کیا۔(53) ''محمد فاتح'' ایسے تجاوزات میں اس لئے کامیاب ہوجاتا تھا، کیونکہ وہ اپنے ''فاتحِ قسطنطنیہ'' کے اعزاز کی وجہ سے تاریخ عثمانیہ میں سب سے زیادہ جائزیت کے حامل حکمرانوں میں سے ایک تھا۔ لیکن ایسی ضبطیاں اُن بہت سے حلقوں میں جنہیں ان کی وجہ سے نقصان پہنچا، انتہائی غیر مقبول تھیں؛ اُن کے حجم نے مذہبی حاکمیت کو بھی چوکنا کردیا۔ اس چیز نے محمد ثانی کے بیٹے اور جانشین بایزید ثانی (عہد 1512-1481) کیلئے ایک مسئلہ پیدا کردیا، جسے اپنے والد کی جائزیت بذریعہ ذاتی کردار حاصل نہ تھی، اور اُسے اپنے اقتدار کو توسیع دینے کیلئے ان گروپوں کی ضرورت تھی۔ بایزید ثانی نے اُن کے ساتھ مفاہمت کی اور اپنے والد کی بہت سی ضبطیوں کو واپس کردیا(54) کئی صدیاں بعد، جب علاقائی توسیع سے زائد محصولات حاصل کرنے کا امکان ایک قصہ پارینہ بن گیا، تو سلطان حقوق ملکیت میں تجاوز کرنے کی طرف واپس رجوع کرنے لگے۔ مثال کے طور پر 1714 میں، سلطان نے بہت سے صوبوں میں ٹیکس وصولی کے بہت سے معاہدوں کا دوبارہ پیچھے کی طرف کھوج لگایا اور صرف تین سال بعد اُنہیں اُن کی اصلی بولی کے پچاس فیصد پر دوبارہ بحال کردیا۔ اٹھارویں صدی کے اواخر تک، ٹیکس وصولی کے حلقوں کی ضبطی ایک عام معاملہ بن گئی۔(55)

یہ صورتِ حال، مغربی یورپ کی اور خصوصاً پروٹسٹنٹ یورپ کی صورتحال سے بنیادی طور پر



مختلف تھی، جہاں حکمرانوں کی نسبتاً کمزور پوزیشن، اُن سے معاشی طور پر مضبوط تمام فریقوں سے سودا بازی کرنے کا تقاضا کرتی تھی: اشرافیہ، کلیسا اور معاشی اشرافیہ، اگر بیروٹسٹنٹ حکمران اور ذرا کم تر حد تک کیتھولک حکمران بھی، ان تینوں دھڑوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرتے۔ تو اُنہیں نہ صرف ٹیکس محصولات سے محروم ہونا پڑتا، بلکہ اس سے زیادہ بغاوت کے خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑتا، تاہم سپین کے معاملے میں دیکھی جانے والی ستم ظریفی عثمانیوں کے ہاں اور بھی زیادہ واضح تھی: سلطان کی طاقت ٹھیک وہ چیز تھی، جس نے عثمانیوں کی طویل مدتی کمزوری میں سہولت کاری کی۔ اعیان پر بھروسہ کرکے، عثمانیوں نے ٹیکس کے دستیاب محاصل کو حاصل کرلیا، جبکہ ممکنہ بغاوت کے امکان کو بھی محدود کرلیا۔(56) یقیناً، سلطان معاشی اشرافیہ کو حلقے میں لاکر ٹیکس محاصل کو اور بھی بڑھا سکتا تھا، لیکن یہ چیز اپنے حقوق اور سودا بازی کی طاقت سے دستبردار ہونے کی قیمت پر حاصل ہوسکتی تھی۔ اُن کا نفع نقصان کا حساب کتاب اُس سے مختلف تھا جس کا سامنا پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو تھا۔ جبکہ اس حساب کتاب سے پروٹسٹنٹ حکمرانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے ٹیکس کے محاصل کو بڑھانے اور اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کے لئے معاشی اشرافیہ کی مراعات دیں، وہیں پر ایسا کرنے سے عثمانیوں کو حاصل ہونے والے کم تر مفادات ان مراعات کے اہم نقصانات کے برابر نہ ہوتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، سلطان کی اشرافیاؤں کے بالمقابل طاقت نے اُن پالیسیوں کو اپنانے سے روکا، جو بالآخر ریاست کو امیر کردیتیں۔

سلطنت عثمانیہ اور پروٹسٹنٹ اقوام کے درمیان ان اختلافات نے دو خطوں میں مدوّن ہونے والی پالیسیوں کو متاثر کیا۔ کیونکہ عثمانیوں نے معاشی اشرافیہ سے گفت وشنید نہ کی، لہٰذا ایسی ترغیب کبھی پیدا نہ ہوئی کہ شریعت میں مدوّن والے کاروباری قانون کو اسی طرح تبدیل کیا جائے کہ وہ تاجروں اور صرّافوں کی بدلتی ہوئی ضروریات کی عکاسی کرے۔ ایسا کرنا مذہبی اشرفیہ کے لئے خطرے کا باعث بنا، جو مذہبی قانون کے کلّی شارح تھے۔ اور لہٰذا اُس کاروباری قانون کے بھی کلّی شارح تھے جیسا کہ وہ اسلامی اصول میں مدوّن کیا گیا ہے۔ سلطان مذہبی علماء کے طبقے کو کیوں نقصان پہنچاتا۔ اپنی جواز بخشی اقتدار کے بنیادی ذریعے کو.....معاشی اشرافیہ کے فائدے کے لئے، جو کہ ایک ایسا گروپ تھا جس کی سودا بازی کی میز پر کوئی نشست نہیں تھی؟ عثمانیوں کے لئے، بدلتے ہوئے معاشی حالات کے جواب میں کاروباری قوانین کو تبدیل کرنے کے لئے قطعاً

www.MashalBooks.org

کوئی ترغیب نہیں تھی، کیونکہ وہ معاشی اشرافیہ کے لئے کچھ زیادہ چھوڑے بغیر ٹیکس محصولات حاصل کر سکتے تھے۔ یہی منطق اس بات کی توضیح کرنے میں بھی مدد دیتی ہے کہ معاشی اشرافیہ کی طرف سے کاروباری قانون میں تبدیلی کا کوئی مطالبہ نہیں تھا، جیسا کہ تیمور کُران (Timur Kuran) کی بہت سی تصانیف میں بیان کیا گیا ہے۔ اگر سلطان کا کسی طرح بھی ایسی تبدیلیوں کی اجازت دینے کا کوئی امکان نہیں تھا، تو کوئی کیوں قوانین سے گریز کرتا یا براہِ راست سلطان کو اپیل کرتا، جبکہ ایسا کرنا مذہبی اور سیاسی اشرافیہ دونوں کی طرف سے پُرزور پابندیوں کو دعوت دینے کے مترادف تھا؟ ایسی ''دوہری لاگت'' نے جیسا کہ بات دوم میں بیان کیا گیا، معاشی اشرافیہ کا کروباری قوانین میں تبدیلیوں کا تقاضا کرنے کی ترغیب کو ختم کیا۔ (57)

تاہم، عثمانیوں نے بعض قوانین میں فوری طور پر ترمیم کر دی۔ کیونکہ شریعہ کا قانون زیادہ تر ایک مثالی قانون تھا اور ہمیشہ قابلِ عمل نہیں تھا، لہٰذا ''قانون'' (سلطنت کا قانون) مثالی قانون میں ایسے قوانین کا اضافہ کرتا تھا، جو ریاست کی روزمرّہ کی ضروریات کی حمایت کریں، خاص طور پر فواجداری اور مالی قانون میں۔ ''قانون'' اور شریعہ ہمیشہ باہمی طور پر ہم آہنگ نہیں تھے، اور جب اُن میں تصادم ہوتا تو مذہبی حاکمیت عام طور پر سلطان کی خواہشات کو اسلامی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے پردے میں چھپانے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتے تھے۔ عثمانیہ قانونی ضابطے کی پہلی بڑی اصلاح ایک مثال پیش کرتی ہے۔ محمد ثانی کے قسطنطنیہ فتح کرنے کے جلد ہی بعد اُس نے اپنا پہلا قانونی ضابطہ تیار کیا، جس نے معاشرے کے تمام حصوں میں ٹیکس وصولی کو منظّم کیا۔ (58) اُس کے عہد کے بعد، عثمانیوں نے ٹیکس کے معاملات میں سیکولر قانون لاگو کیا، اور اس طرح سلطان کو اسلامی احکامات سے گریز کرنے کی اجازت دی۔ جہاں ٹیکس کا قانون اسلامی قانون کے خلاف جاتا، تو سلطان اُس قانون کو توسیع دے کر اپنے حق میں کرنے پر فوری آمادہ ہوتا تھا۔ (59) کیونکہ عثمانی، ٹیکس محصولات پر انفرادی طور پر فوج سے اور بالآخر اعیان سے گفت وشنید کرتے تھے، لہٰذا ٹیکس کے قانون اور زمین پر قبضے کی شرائط سے متعلقہ لچک سے اُنہیں بہت فائدہ حاصل ہوتا تدھا۔ کاروباری قانون میں لچک سے بہت کم فائدہ حاصل ہوتا تھا، لہٰذا عثمانیوں نے بڑی حد تک اس کو مذہبی حاکمیت کے دائرہ کار میں رہنے دیا۔

کاروباری قانون پر مذہبی حکام کے دائرہ کار کو قائم رہنے دینے نے عثمانیوں کی



کاروباری اور مالی پالیسیوں، اور ساتھ ہی ساتھ، عثمانیہ معاشی اشرافیہ کی طرف سے استعمال کئے جانے والے معاشی اداروں اور مالی دستاویزات کی نوعیت کو بھی متاثر کیا۔ مثال کے طور پر، باب چہارم میں یہ بیان کیا گیا کہ اگرچہ تاجر اور قرضخواہ، سود لینے پر اسلامی پابندیوں سے آسانی سے احتراز کرنے کے قابل تھے، لیکن اُنہوں نے ایسا، اپنے اوپر سود کے نقصانات کو لے کر کیا، جس نے بینکوں کے بڑے پیمانے کے قرضخواہ اداروں کے ارتقا کو ختم کر کے رکھ دیا۔ نتیجتاً قرض دینا نسبتاً چھوٹے پیمانے پر رہا، اور بنیادی طور پر جانے پہنچانے تعلقداروں میں چلتا رہا۔ یہ 1856ء تک نہ تھا کہ پہلا پہلا کامیاب بینک کھُلتا، اور اس بینک کی پشت پر بھی بنیادی طور پر برطانوی اور فرانسیسی تھے۔

تیمور کران نے سلسلہ وار مضامین اور کتابوں میں ایسے دوسرے طریقے وضاحت سے بیان کئے ہیں، جن سے، کاروباری سودوں میں عثمانیوں کے اسلامی قانون پر انحصار نے معاشی ترقی کا گلا گھونٹ دیا۔ اُس کی اہم مثالوں میں سے ایک اوقاف یا مقدس اوقاف کے عوامی فلاح کا سامان مہیا کرنے کے وسیع تر استعمال پر محیط ہے۔ وقت انگلیسی ٹرسٹ کی طرح کام کرتا تھا، لیکن ایک ایسے مشن کے ساتھ جو دائمی طور پر متعین تھا۔ اوقاف عام طور پر کسی فوارے یا اسکول جیسی عوامی فلاح کی غیر منقولہ چیزوں کے لئے رقوم مہیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ایک وقف کا بانی یہ حکم دیتا کہ وقف کسی مدرسہ کو رقم مہیا کرے، تو پھر اُس وقف سے پیدا ہونے والی رقوم صرف اُس مدرسے کے اخراجات کو پورا کریں گی۔ اوقاف کی مذہبی جہتیں بھی تھیں: وقف کے قیام کو ایک نیکی کا عمل سمجھا جاتا تھا، اور وقف کے بانیوں کو عموماً سماجی عزّت حاصل ہو جاتی تھی۔ وقف کے قوانین کا ایک غیر ارادی نتیجہ یہ تھا کہ دولت مند مسلمان وقف وراثت کے قوانین سے بچنے کے لئے ایک ذریعے کے طور پر قائم کرتے تھے۔ کیونکہ ایک وقف ایک دائمی وجود ہوتا تھا، لہٰذا ایک شخص وقف قائم کر کے ایک وارث کو اس کو چلانے کے لئے ایک معقول رقم دے سکتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ وقف دولت مند مسلمانوں کو، اسلامی قانون کے تقاضے کے مطابق اثاثہ جات کی تقسیم سے بچنے کا ایک ذریعہ مہیا کرتا تھا۔ کُران یہ استدلال کرتا ہے۔ (2001, 2005-6) (2011 کہ لہٰذا اوقاف نے اُن وسائل کو جذب کر لیا جو پیداواری مقاصد میں سرمایہ کاری کرنے کے لئے استعمال ہو سکتے تھے، یا کم از کم ایسی سرمایہ کاریوں میں جن کا مقصد متعین نہ ہوتا۔

کُران (2005, 2011) یہ بھی استدلال کرتا ہے کہ اسلامی قانون وراثت وہ بنیاد وجہ تھی، جس سے شراکت داریاں اسلامی تاریخ کے زیادہ تر حصے میں نسبتاً سادہ رہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ اور سلطنتِ عثمانیہ، دونوں میں شراکت دریاں وہ بنیاد ذریعہ تشکیل دیتی تھیں جو سرمائے اور مہارت کو اکٹھا کرتا تھا۔ اس طرح، وہ درجہ بندی اور تکمیلی صورت ہائے حالات کی معیشتوں کی گنجائش پیدا کرتی تھیں، جو بصورت دیگر غیر دستیاب ہوتیں۔ درجہ بندی کی ایسی معیشتیں اُس وقت اور بھی زیادہ ترقی کرتی گئیں، جب شراکتیں وسیع ہو کر بہت سے ارکان کو شامل کرتی گئیں، اس قسم کی بڑھوتری یورپ میں اُس وقت واقع ہوئی جب بنیادی شراکتیں (Commenda) بڑھ کر خاندانی فرموں، مشترک سرمائے کی کمپنیوں، اور بالآخر کارپوریشنوں میں تبدیل ہو گئیں۔ ایسی ہی ترقی سلطنت عثمانیہ یا واسیع تر اسلامی دُنیا میں کبھی واقع نہ ہوتی۔ بلاشبہ، اسلامی شراکتیں حجم میں چھوٹی اور وقت کے لحاظ سے محدود رہیں۔ کُران اسلام کے وراثتی قوانین اور شراکتوں کے بارے میں قوانین کی طرف مشترکہ ذمہ داروں کے طور پر اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ اسلامی قانونِ وراثت نے، وراثتوں کو پہلے سے طے شدہ قرآنی احکام کے مطابق، متعدد وارثوں میں تقسیم کر دیا، جبکہ شراکتیں کسی بھی رُکن کی وفات پر فوری طور پر تحلیل ہو جاتی تھیں۔ اگرچہ کسی مرحوم شراکت دار کے وارثین فوری طور پر تحلیل شدہ شراکت کو دوبارہ قائم کر سکتے تھے۔ لیکن تمام وارثین کے تعاون کی ضرورت ہوتی تھی۔ واضح بات ہے کہ اس چیز نے بہت سے ارکان کے ساتھ شراکت داریاں تشکیل دینے کے جذبۂ محرکہ کو سُست کر دیا، یا کسی خاندان کے ساتھ طویل عرصے کی شراکت داریوں کو بھی، جیسا کہ اواخر قرونِ وسطیٰ کے اٹلی میں، جب کبھی کوئی رُکن فوت ہوتا، تو بہت سے وارثین اپنی شراکت کے حصے کو تقسیم کر لیتے، جن میں سے کوئی بھی شراکت کو اپنی حالت میں جاری رہنے کو روک سکتا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی بھی وارث مالی مجبوری میں ہوتا، تو شراکت کے تحلیل ہونے کا امکان ہوتا تھا۔ تحلیل شراکت کی کاروائیوں اور تمام مشمولہ لوگوں کی قسمتوں کو بھی شدید دھچکا لگاتی تھی۔ یہ، رقومات کی کمی کی وجہ سے اصل شراکت داروں کو پہلے سے طے شدہ معاہدات سے انکار کرنے، ناقابل تقسیم اشیاء کو فروخت کرنے پر مجبور کر سکتی تھی، یا شراکت کے پنپنے کے لئے انتہائی اہم کاروائیوں کو کالعدم کرنے پر مجبور کر سکتی تھی، جیا کہ جہازوں کے ذریعے اشیا کی ترسیل اور بڑی بڑی خریداریوں کو۔ اس انجام سے بچنے کا



آسان طریقہ یہ تھا کہ بہت زیادہ ارکان والی شراکتوں سے ہی بچا جائے، کیونکہ ہر زائد رُکن اس امکان کو بڑھا دیتا تھا کہ شراکت غیر متوقع طور پر تحلیل ہو جائے گی۔ یہ طویل مدتی سُودوں میں ملوث شراکتوں کی بھی حوصلہ شکنی کرتی تھی، کیونکہ جتنا زیادہ ذمہ داری کا عرصہ ہوگا، اُتنا ہی زیادہ اس چیز کا امکان ہوگا کہ ارکان میں سے کوئی غیر متوقع طور پر وفات پا جائے گا۔ (60)

عثمانی قانون دان اگر چاہتے تو مذکورہ بالا مسئلے کا حل نکال سکتے تھے۔ لیکن وراثت یا شراکت کے قوانین میں تبدیلیاں اسلامی قانون کی تعبیر نو کا تقاضا کرتیں۔ جو مذہبی حاکمیت کے لئے مہنگی ہوتیں، کیونکہ اُن کے اثر ورسوخ کا ایک بنیادی ذریعہ۔ جو چیز اُنہیں اشرافیہ بناتی تھی۔ ابدی قوانین کی تشریح پر اُن کی اجارہ داری تھی۔ (دیکھئے باب دوم) کیونکہ ایسی تعبیر نو مہنگی تھی، لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی کرنے سے ایک انمول صلہ بھی ملتا۔ لیکن ایسے صلے کبھی پیدا نہ ہوتے، اور پہلے پیش کی گئی دلیل اس بات کی توضیح کرتی ہے کہ ایسا کیوں تھا۔ ایک ایسا توافق پیدا ہوا، جس میں سلطان مذہبی حاکمیت کو کاروباری قانون کا دائرہ اختیار سپرد کر کے خوش تھا: اس کے بدلے میں مذہبی حاکمیت نے سلطان کو اقتدار کا جواز بخشا، اور معاسی اشرافیہ نسبتاً بے اختیار رہی۔ اگر سلطان زیادہ غیر محفوظ پوزیشن میں ہوتا، یا محصولات کے لئے معاشی اشرافیہ پر انحصار کرتا، تو وہ تبدیل ہوتی ہوئی ضروریات کے لئے کاروباری قانون میں ترمیم کرتا۔ تاہم، معاشی اشرافیہ کے اندر بڑی اور طویل مدتی شراکتوں کے لئے زیادہ مفید قانونی تبدیلیوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ اُن دونوں فریقوں کا، جنہوں نے قانون کی تشریح اور اُس کا نفاذ کیا، اس طرح قانون تشریح کرنے میں کوئی مفاد نہ تھا۔

یورپ میں اور خاص طور پر انگلستان میں ایک مختلف عمل ارتقا پذیر ہوا، جہاں منظّم اداروں کی ایک شکل پیدا ہوئی، جزوی طور پر ٹرسٹوں کے غلبے کی وجہ سے، جو کہ وقف کا قریب ترین مغربی مترادف تھا۔ استمتاعات کا قانون (1535) نے انگلیسی زمینداروں کو اپنی جائیداد ایسے ٹرسٹوں میں رکھنے پر اُکسایا، جسے مالکان تقریباً کسی بھی مطلوبہ طریقے سے استعمال کر سکتے تھے۔ جو چیز کہ اسلامی وقف کے قانون سے واضح طور پر مختلف تھی۔ (دیکھئے باب 7)۔ وصیتوں کے قانون (1540) نے زمین کو وصیت کے ذریعے ترکے میں چھوڑے جانے کے قابل بنا دیا، جس نے زمینداروں کو، زمین کو کسی بھی شخص کی وراثت میں دینے کی اجازت دے دی ہے وہ چاہتے، ایک

www.MashalBooks.org

وصیت نامہ لکھ کر، یہ چیز بھی اسلام کے وراثت کے قانون سے واضح طور پر مختلف تھی، جو وراثت کی پہلے سے طے شدہ تقسیم کو لازمی قرار دیتا ہے۔ ان دو انگلیسی قوانین نے دولت کے ارتکاز کی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے کاروباروں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کی۔ دوسری طرف، اسلام کے وراثت کے سخت اور پیچیدہ ضابطے نے، دولتمند عثمانی رعایا کو اپنی دولت کو اوقاف میں لگانے کی ترغیب دی۔ اوقاف میں ابدی زندگی کا مفاد تھا، جبکہ یہ ساتھ ہی ساتھ سرمائے کے اجتماع کی گنجائش بھی پیدا کرتا تھا۔ لیکن جونہی معاشی حالات تبدیل ہوتے، یہ چیز وقف کے مالکان کے لئے جامدین کی قیمت پر منتج ہوتی۔ عثمانی، اُس قسم کی وصیتوں اور لچکدار ٹرسٹوں سے جو بعد از اصلاح کلیسا کے انگلستان میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس قسم کے مسائل سے بچ سکتے تھے، وصیتیں، وراثتوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کو روکنے میں مدد دیتی ہیں، جبکہ لچکدار ٹرسٹ وارثین کو اپنے اثانوں کی کامیاب سرمایہ کاری کو ممکن بناتے ہیں۔ تاہم ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز اسلامی قانون سے منسوب نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ سلطان کے لئے مذہبی حاکمیت کے کاروباری قانون پر سے اختیار کو ختم کرنے کے لئے کوئی ترغیب نہیں تھی، لہٰذا اشراکتیں نسبتاً سادہ رہیں، سرمایہ کا تبادلہ نسبتاً شخصی رہا، اور اداروں کی منظّم شکل مقامی طور پر کبھی پیدا نہ ہوگی۔

معاشی اشرافیہ کی طرف سے کسی قسم کی پابندی سے آزاد، مالی بحرانوں کے اوقات میں بہت سے طریقے سلطان کے ہاتھ میں تھے۔ سولھویں صدی کے اواخر میں پہلے سنجیدہ مالی بحران کے آغاز پر ایک ایسا استعمال کیا جانے والا طریقہ، کرنسی کی قیمت کم کرنا تھا۔ کرنسی کی قیمتوں میں ایک بڑی کمی 1589 میں واقع ہوئی۔ جو ینی چری (سلطان کی وفادار فوج) میں بغاوت کا سبب بنی، سلطان نے فوجی دستے کو برائے نام طے شدہ معاوضہ جات ادا کئے، لہٰذا قیمتوں میں کمی نے اُن کے معاوضہ جات کی قوت خرید کو کم کر دیا، اس کے بعد قیمتوں میں بہت سی کمیاں واقع ہوئیں، اور 1640 کی دہائی میں، یورپی سکّوں نے عثمانی سکوں کی جگہ لے لی، جو گردش سے غائب ہو گئے۔ (61) بلاشبہ، سیوکٹ پامک (2000) یہ استدلال کرتا ہے کہ کرنسی کی قیمتوں میں یہ کمیاں، پوری عثمانی تاریخ میں قیمتوں کی سطحوں کے بلند ہونے کی بنیادی وجہ تھی۔ معاشی اشرافیہ اور مزدوروں نے قیمتوں میں کمی کو ناپسند کیا، کیونکہ بظاہر یہ آمدنی اور دولت پر ایک اضافی ٹیکس تھا۔ (62)



عثمانی وہ واحد بڑی طاقت نہیں تھے، جنہوں نے جدید دور کے آغاز میں اپنی کرنسی کی قیمت کم کی۔ ہنری ہشتم نے 1542 میں جنگ کے بڑھتے ہوئے مالی بوجھ کی ادائیگی کرنے کے لئے انگلستان کی ''قیمتوں میں عظیم کمی'' تشکیل دی، اور 1542 اور 1551 کے درمیان انگلستان کی سکّے کی قدر ڈرامائی طور پر کم ہوگئی۔ لیکن انگلستان اور عثمانی قیمتوں میں کمی کے درمیان اختلاف کے دو اہم نکتے تھے۔ اوّل، ہنری ہشتم نے سکّے کی قدر ٹھیک اس وجہ سے کم کی کیونکہ تحریک اصلاح کلیسا کے ساتھ پارلیمان کی طاقت میں ابھی ابھی اضافہ ہوتا تھا۔ کرنسی کی قدر کی کمی، اُن چند مالی پالیسیوں میں سے تھی، جو انگلیسی تاج کے اختیار میں تھی، جسے پارلیمان کی منظوری کی ضرورت نہ تھی۔ دوم، انگلیسی تاج کرنسی کی قیمت کی کمی سے پیدا ہونے والے مالی دباؤ سے بالکل مامون تھا۔ ایڈورڈ ہشتم کی حکومت نے 1551 میں کرنسی کی قیمت دوبارہ بحال کرنے کے لئے اصلاحات کا ایک سیٹ متعارف کروایا، جو بالآخر 1560 میں ایلزبیتھن سکے کی قدر کی بحالی پر منتج ہوئی۔ (63)

ایک عمدہ کارکردگی والی مشیت کی ایک اور خصوصیت، جس کی سلطنت عثمانیہ میں کمی تھی، ایک غیر جانبدار عدالتی نظام تھا۔ سترھویں صدی کے استنبول سے حاصل ہونے والے عدالتی رجسٹروں کا تجزیہ کرتے ہوئے، تیمور کُران اور سکاٹ لسٹگ (Scott Lustig) (2012) نے یہ دیکھا کہ اسلامی عدالتیں غیر مسلموں کے خلاف اور سرکاری اہلکاروں کے حق میں تعصب کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے حق میں تعصّبات تقریباً اسلام کے قانونی تقاضے سے پیدا ہوتے تھے جس کے مطابق مسلمانوں پر مقدمہ چلانے کے لئے تو بہت اعلیٰ درجے کی شہادت کی ضرورت ہوتی تھی، لیکن غیر مسلموں پر مقدمہ چلانے کے لئے نہیں۔ جہاں تک حکومتی اہلکاروں کے حق میں تعصّبات کا تعلق ہے، وہ ممکنہ طور پر اس حقیقت کی وجہ سے تھے کہ عدالتی تعیناتیاں سلطان کی طرف سے کی جاتی تھیں، وہ جج جو اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوتے تھے، اُن مقدمہ بازوں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے جو براہِ راست سلطان کے لئے کام کر رہے ہوتے تھے۔ (64)

ایسی عدالتوں تک رسائی، جو جُرم کا فیصلہ دستیاب شہادت کی بنا پر کریں نہ کہ سیاسی یا سماجی طاقت کی بنا پر، کسی معاشرے میں کاروباری سودوں کے حجم کا ایک بنیادی تعین کار ہے۔ کوئی بھی تاجر کسی دوسرے فریق سے اُس وقت تک ممکنہ طور پر کوئی معاہدہ نہیں کرتا، اگر وہ جانتا ہو کہ اُس کا

ساتھی معاہدے سے بغیر سزا پائے مکر سکتا ہے۔ لہٰذا، ایک جانبدار عدالتی نظام اُن باہمی فائدہ مند سودوں کی تعداد کو کم کر دیتا ہے جو واقع ہو سکتے ہیں۔ مغربی یورپیوں نے قرونِ وسطیٰ کے اواخر میں اس مسئلے کو ایسے اداروں کے ساتھ حل کر لیا، جیسا کہ تاجروں کے گلڈ اور برادری کے ذمہ داری کے نظام سے، جن میں سے دونوں نے حکمرانوں کو غیر جانبدارانہ نظامِ انصاف مہیا کرنے کی ترغیب دی۔ (65) لیکن ان مسائل کو سلطنتِ عثمانیہ میں حل نہ کیا گیا، کم از کم اُس وقت تک جب تک کہ اُنیسویں صدی میں اصلاحات کا بیڑا اُٹھایا گیا۔ تیمور کُران اور میں (کُران بعد رُوہن 2017) نے متعصب عدالتوں کا ایک مزید نتیجہ بھی دریافت کیا، مراعات یافتہ عثمانی رعایا (مرد، مسلمان، اور اشرافیہ) غیر مراعات یافتہ رعایا کی نسبت قرضوں پر زیادہ شرح سود ادا کرتے تھے۔ یہ چیز، اُس کے بالکل برعکس ہے جو آدمی جدید تناظر میں توقع کرتا ہے، جہاں مراعات یافتہ کم شرح سود ادا کرتے ہیں، کیونکہ اُن کا نادہندگی کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ میں مراعات یافتہ قرضداروں کا مکر کر بچ جانے کا امکان زیادہ ہوتا تھا، لہٰذا قرضخواہ، اُس خطرے کی کمی کو پورا کرنے کے لئے جو قرض دینے کے ساتھ وابستہ ہوتی تھی، اُن پر زائد مطالبات عائد کرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ سترھویں اور اٹھارویں صدیوں میں، مرد مسلمان اور اشراف، اپنے قرضوں پر تین سے چار فیصد درجے زیادہ سود ادا کرتے تھے، جو کہ تمام قرضوں پر ادا کئے جانے والے سود کا تقریباً چھ فیصد ہوتا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کی قرضوں کی مارکیٹوں کے اس پہلو نے امکانی طور پر عثمانی اور مغربی یورپی معیشتوں کے درمیان فرق کو اور بھی بڑھایا۔ کیونکہ طویل مدتی معاشی ترقی کا دارومدار بڑی حد تک سرمائے میں سرمایہ کاری پر ہوتا ہے، جو بذاتِ خود بڑی حد تک رقومات کے آزادانہ بہاؤ پر منحصر ہوتی ہے، لہٰذا یہ حقیقت کہ مراعات یافتہ سود کی زیادہ شرح ادا کرتے تھے، اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ لوگ جو سرمایہ کاری کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے۔ ایسا کرنے کی سب سے زیادہ قیمت ادا کرتے تھے۔ اس کا جدید سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی دور میں سرمایہ کے ارتقا پر منفی اثر پڑا ہوگا۔

اُس طریق کار (آخری سانحہ)، جس میں عثمانیوں نے اپنے اقتدار کو توسیع دی، آخری سانحہ یہ تھا کہ عثمانیہ شرح خواندگی پورے ابتدائی جدید دور میں پست رہی۔ اتنی دیر سے جتنی کہ اُنیسویں صدی، عثمانیہ شرحِ خواندگی 2- 3 فیصد کے لگ بھگ تھی۔ جبکہ 1700 تک یہ انگلستان



اور نیدر لینڈز میں 50 فیصد سے بھی زیادہ تھی، اور باقیماندہ یورپ میں 1800 تک کم از کم 20 فیصد تک پہنچ گئی تھی۔ عثمانی شرحِ خواندگی دو اسباب کی بنا پر نمایاں طور پر کم رہی، کتابوں کی کم دستیابی، اور خواندگی کی کم طلب۔ ان دونوں عوامل کو اُس طریقے سے منسوب کیا جا سکتا ہے، جس میں عثمانیوں نے اپنے اقتدار کو وسعت دی۔ کتابوں کی کم رسد براہ راست چھاپہ خانوں پر عربی رسم الخط میں کتابوں کی طباعت پر پابندیوں کا نتیجہ تھی، جو جوابی طور پر عثمانیوں کے مذہبی جوازِ اقتدار پر انحصار کا نتیجہ تھیں۔ (دیکھئے باب 5) خواندگی کی کم طلب بھی اُن بہت سے عوامل کا نتیجہ تھی جو اس کتاب میں بیان کئے گئے ہیں۔ جب تک تاجر بنیادی طور پر ذاتی تبادلے مین مشغول رہے، تو نہ خواندگی اور نہ ہی حساب دانی، کاروبار کرنے کے لئے لازمی تھیں۔ اُس وقت تک جب تک تعلیم اور قانونی اور مذہبی فکر پر مذہبی حاکمیت کی اجارہ داری تھی، اُن کے لئے طاقتور معترضین کی تعداد کو محدود کرنے کی ایک ترغیب موجود تھی۔ اور اُن کے اندر، مدرسوں تک رسائی کو محدود کر کے، مدرسوں کا نصاب متعین کر کے، اور جب ضروری ہو سلطان سے اپنے حق میں قوانین اور پالیسیوں کا تقاضا کر کے، ایسا کرنے کی صلاحیت تھی۔ مزید برآں، جب عثمانی کارکنوں کے معاوضہ جات اُن کے مغربی یورپی مشنیوں کی نسبت پیچھے رہنے لگے، تو خواندگی رجعت آگے پیچھے اختلاف کا شکار ہوئی۔ خواندگی میں بین العلاقائی اختلافات جو جدید دور کے آغاز میں پیدا ہوئے، عثمانی اضافی زوال کی وجہ نہیں بنے، بلکہ وہ اُن گہری خصوصیات کا نتیجہ تھے، جو اس اختلاف کی ذمہ دار تھیں۔

www.MashalBooks.org

# یہ چیز اہمیت رکھتی ہے کہ اقتدار کو کون توسیع دیتا ہے

اب تک پچھلے دو ابواب کا مرکزی نکتہ واضح ہو جانا چاہئے: یہ چیز اہمیت رکھتی ہے کہ سیاسی اقتدار کو کون توسیع دیتا ہے۔ سپین اور سلطنت عثمانیہ میں مذہبی حکام، اقتدار کے مقامی دلال، اور عسکری اشرافیہ کا ملغوبہ اقتدار کو توسیع دیتا تھا، اور اس طرح حکمرانوں کے لئے معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنے کی کوئی ترغیب باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ انگلستان اور ڈچ جمہوریہ میں، تحریک اصلاح کلیسا نے، بطور ایک ایسے کارندے کے جو مذہبی طور پر اقتدار کو جواز بخشتا تھا، کلیسا کی موت کا اعلان کر دیا، بعد (انگلستان میں) تاج کو معاشی اشرافیہ کے ساتھ گفت وشنید کرنے پر مجبور کر دیا، یا ڈچ جمہوریہ میں معاشی اشرافیہ کو آگے دھکیل کر سیاسی طاقت کی پوزیشن میں کھڑا کر دیا۔ ان ادارہ جاتی اختلافات کے طویل مدتی اثرات واضح ہیں۔ انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں تحریک اصلاح کلیسا کے بعد، حکمرانوں اور پارلیمانوں نے معاشی خوشحالی میں مددگار قوانین اور پالیسیاں بنائیں۔ ان میں شامل تھیں! زیادہ مضبوط اور زیادہ واضح حقوق ملکیت، عوامی فلاح و بہبود مہیا کرنے کے لئے ادارے، غریبوں کی مدد، اور ذرائع نقل وحمل کے نظاموں میں سرمایہ کاری۔ ہسپانوی اور عثمانی حکمرانوں نے ایسی اصلاحات کا بیڑہ نہ اُٹھایا۔ اُن کی پالیسیوں نے اُن کے شہریوں کو پیداواری مشاغل میں سرمایہ کاری کرنے کی ترغیب نہ دی، اور مستقل معاشی ترقی کی بنیادیں بہت حد تک ناپید تھیں۔

اقتدار کو توسیع دینے والے ادارے شفّاف ہوا سے پیدا نہیں ہو گئے تھے۔ ابواب 3 تا 6 یہ کہتے ہیں کہ یہ ادارے صدیوں میں جا کر ارتقا پذیر ہوئے، اور ادارہ جاتی اختلافات کا کھوج اسلام اور عیسائیت کی ابتداؤں میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ کتاب دو اہم اور باہمی طور پر مربوط سوالوں کا جزوی جواب مہیا کرتی ہے:



''ایک معاشرے معاشی خوشحالی حاصل کرنے کے لئے کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟''

اور ''کوئی معاشرہ خوشحالی کے ثمرات کو کس طرح لمبے عرصے تک قائم رکھ سکتا ہے؟'' پہلا سوال ایک جامد قسم کا سوال ہے۔ وقت کے کسی نقطے پر، یہ مشاہدہ کرنا ممکن ہوتا ہے کہ حکمران کس طرح اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے ہیں، اور یہ تجزیہ کرنا کہ قوانین اور پالیسیوں کی اُن اقسام کے لئے جو اس کی حکومت اختیار کرتی ہے اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ دوسرا سوال اپنی نوعیت میں تاریخی اور متحرک ہے۔ مستقل معاشی ترقی کے لئے ''صحیح'' اداروں کو قائم کرنا، ایک اندر سے پھوٹنے والا تاریخی عمل ہوتا ہے۔ ''صحیح'' اداروں کو حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ بہت سی ''صحیح'' ادارہ جاتی شکلیں ہیں۔ مثال کے طور پر، انگلستان اور زیریں ممالک کی معاشی اور سیاسی تواریخ کئی لحاظ سے مختلف ہیں، لیکن بالآخر دونوں ایک ایسی صورتِ حال پر منتج ہوئیں، جو ترقی کے لئے فائدہ مند تھی۔ طویل مدتی معاشی خوشحالی کے لئے کوئی ہمہ گیر نسخہ نہیں ہے۔ لیکن جب ایک مرتبہ ''ٹھیک'' عناصر اپنی اپنی جگہ پر، ایک ایسے طریقے سے ایک دوسرے کو تقویت پہنچاتے ہیں کہ جو معاشی ترقی کو مزید دوام بخشتا ہے، کیونکہ یہ بات بنیادی کھلاڑیوں کے مفاد میں ہوتی ہے کہ یہ نتیجہ برآمد ہو۔ جب غلط عناصر اس میں فِٹ ہو جائیں، تو اس کے برعکس واقع ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں، طاقتور گروپ اور افراد طویل مدتی معاشی ترقی کی قیمت پر اپنی طاقت اور دولت کو دوام بخشتے ہیں، اور اس کا نتیجہ جمود ہوتا ہے۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

# (9)

# نتیجہ

اُس درجے کا تعین، جس میں مشرق وسطیٰ، اور بڑی حد تک اسلامی دنیا مغربی یورپ سے پیچھے تھی، بیسویں صدی کے اوائل میں دونوں خطوں کے سیاسی نقشے پر ایک نگاہ ڈالنے سے کیا جا سکتا ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے موقع پر۔ وہ جنگ جو طویل عرصے سے بیمار سلطنت عثمانیہ کے لئے موت کی آخری گھنٹی بجانے والی تھی۔ اسلامی دنیا کا ایک بڑا حصّہ یورپی طاقتوں کے کنٹرول میں تھا (دیکھئے شکل 9.1) فرانس، اٹلی، اور انگلستان کا اقتدار شمالی افریقہ پر تقسیم شدہ تھا، اور انگلستان کا کنٹرول جنوبی جزیرہ نمائے عرب پر تھا، جس میں اسکی بطور بحر احمر اور خلیج فارس کے دربان کے ایک اہم تزویراتی حیثیت تھی۔ اسلامی دُنیا میں دوسری جگہوں پر، انگلستان کی جنوبی ایشیا کے بڑے حصے پر حکومت تھی، اور وسطی ایشیا کے بڑے بڑے خطّے روس کی حکومت کے ماتحت تھے۔ سلطنت عثمانیہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھی، اور جزیرہ نمائے عرب میں قبائلی جنگ جاری تھی۔

**شکل 9.1:** جنگ عظیم اوّل کے موقع پر مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ ذرائع۔ بُو کے نیشنل آرکائیوز میں دستیاب نقشے سے اخذ شدہ اعداد و شمار۔
www.nationalarchives.gov.uk/cabinetpapers/themes/maps-interactive/maps-in-time.htm



مشرق وسطیٰ کے جمود کے آثار جنگِ عظیم اوّل سے بہت پہلے سے واضح تھے۔ یہاں تک کہ اُنیسویں صدی کے آغاز تک ہی مشرق وسطی کی معاشی، ٹیکنولوجیاتی اور فوجی طاقت واضح طور پر مغربی یورپ سے بہت پیچھے تھی۔ سلطنتِ عثمانیہ اُنیسویں صدی کے اوائل میں زیادہ سے زیادہ ایک مضافاتی معاشی طاقت تھی، اور یہ مغربی یورپ کے لئے کوئی سنجیدہ فوجی خطرہ پیش نہیں کرتی تھی۔ اس کے نسبتاً معاشی زوال کا ایک واضح نشان، عثمانی حکومت کی طرف سے، یورپی طاقتوں کو اپنے ہی تاجروں کی قیمت پر پیش کیا جانے والا رعایتی تجارتی دستور تھا۔ کاروباری معاہدات کی بنیادوں میں سے اُٹھنے والے، معاشی نقصانات، اُس بہت وسیع مقدروں کے پلٹے کی علامت تھے، جو صدیوں سے پک رہا تھا۔

اس کتاب کا مرکزی مقدمہ یہ ہے، اُن حالات نے جن کے تحت عیسائیت اور اسلام پیدا ہوئے، ایسے اداروں کو جنم دیا، جن کے مغرب کی ترقی اور مشرق وسطی کے جمود کے طویل مدتی ناقابل پیش بینی، نتائج تھے۔ یہ مقدمہ بالکل سیدھا سادا نہیں ہے، اُس زنجیر میں جو ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے بعد اسلام اور عیسائیت کی پیدائشوں کو معاشی نتائج کے ساتھ جوڑتی ہے، بہت سی کڑیاں ہیں۔ اس استدلال کا خلاصہ، پہلی کڑی سے آغاز کر کے درج ذیل ہے:

اس کتاب میں کھوج لگایا گیا، مغربی یورپ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان بنیادی اختلاف۔ اور اسلام اور عیسائیت کے درمیان وہ واحد اصولی اختلاف، جو زیرِ نظر استدلال کے لئے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ہے کہ اسلامی اصول حکمرانی کو جواز بخشنے کے لئے، عیسائی اصول کی نسبت زیادہ مددگار تھا۔ اس اصولی اختلاف کی وجہ، وہ حالات تھے، جن میں دونوں مذاہب نے جنم لیا، عیسائیت نے سلطنتِ روما میں جنم لیا جس کے ہاں، خوب فعال قانونی اور سیاسی ادارے تھے۔ مزید برآں، ابتدائی دور کے عیسائی کسی طرح بھی رومی شہنشاہ کو اقتدار کا جواز دینے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ دوسری طرف اسلام نے ابتدائی طور پر محمد ﷺ کے تحت سیاسی ریاست کی توسیع کے ساتھ ساتھ تشکیل پائی۔ اسلامی قانون کا ذخیرہ پہلے چار خلفا اور اُمویوں جو کہ اُس وقت دنیا کی عظیم ترین ریاستیں تھیں۔ کے تحت مزید بڑھا۔ اس ہم ارتقا کا فطری نتیجہ۔ خاص طور پر اُس مذہبی کردار کے پیشِ نظر جو ابتدائی خلفاء نے ادا کیا۔ اُس اسلامی اصول کی تشکیل تھا، جس نے اسلام کی طرف سے اقتدار کی جواز بخشی کی حمایت کی۔ اس طرح بعد میں آنے والے حکمرانوں کو یہ

www.MashalBooks.org

اہلیت مل گئی کہ وہ اسلام کے متحد کنندہ نظریے سے اقتدار کی جائزیت اخذ کریں۔ ایک نسبتاً یکساں اسلامی ڈھانچے کے پھیلاؤ نے اس نظریے کو پروان چڑھانے میں مدد دی، جو مختلف قبائلی مفادات کو اپنے اندر سموسکتا تھا۔ اس چیز کے مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ اور جزیرہ نمائے آئبیریا کے لئے متعدد نفع بخش نتائج تھے۔ اسلام کے سیاسی اقتدار کے پھیلاؤ نے، تاجروں کے لئے زیادہ محفوظ، ایک مشترکہ سماجی اور مذہبی نظام، ایک مشترکہ سکّہ، ایک مشترکہ زبان، اور مشترک مالی دستاویزات مہیا کر کے، تجارت کو ترقی دینے میں مدد دی۔

مشرق وسطیٰ کی معیشتوں کے مغربی یورپ کی معیشتوں کے مقابلے میں زوال کی کسی بھی توجیہ کو، اس بات کی تشریح بھی لازماً کرنی چاہئے کہ مشرق وسطیٰ اتنے طویل عرصہ تک اتنا آگے کیسے رہا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، کہ ایک ہی خصوصیت مشرقِ وسطیٰ کی معاشی ترقی اور انحطاط دونوں کی توجیہہ کرتی ہے: اوائل دور کے مسلمان حکمرانوں کی مضبوطی، جو بڑی حد تک اسلام سے اُن کی جواز بخشی حاصل کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے تھی، نے مسلم حکومتوں کے تحت ریاستوں نے تجارت کو اس طریقے سے تقویت دی، جو قبل از اسلام کے مشرقِ وسطیٰ اور بعد از روم کے یورپ کی زیادہ غیر مرتکز ریاستوں سے حاصل نہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ طاقت آخر کار کمزوری بن گئی۔ جوں جوں تجارت ترقی کرتی گئی، تو مزید توسیع کے لئے نئے قوانین اور پالیسیوں کی ضرورت تھی، جن میں سے کوئی بھی سترھویں صدی کی معیشت کے تناظر میں ناقابل تصور تھیں۔ تاہم مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کے اندر ایسے قوانین اور پالیسیوں کو اختیار کرنے کے لئے نہ ہونے کے برابر ترغیب تھی، ایسا کرنے سے مذہبی اشرافیہ کی جڑیں کٹ جاتیں، جو کہ تجارتی قانون کے ابتدائی شارحین اور حکمرانوں کی مضبوطی کے لئے سب سے پہلے بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔

اس نتیجے کے بارے میں کوئی بھی چیز پہلے سے طے شدہ نہ تھی۔ بلاشبہ یہ بات بمشکل قابل تصور تھی کہ سن 1000 کے لگ بھگ مسلمان حکمران اسلامی قانون کی اصلاح اس طریق پر کریں گے، جو معاشی اشرافیہ کو فائدہ پہنچائے گا۔ اس کتاب نے دو تاریخی عمل مہیا کئے ہیں۔ ایک جامد اور ایک متحرک۔ جو ایسا کرنے میں اُن کی ناکامی کی توجیہہ کرتے ہیں۔ جامد عمل اُس ''کھیل'' پر مشتمل ہے جو ایک حکمران یہ متعین کرنے کے لئے کھیلتا ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو کس طرح توسیع دے۔ وہ توسیع اقتدار کی مختلف شکلوں کے نفع نقصان پر غور کرتا ہے۔ ن میں سے دونوں اُن اداروں سے



ابھرتی ہیں جنہوں نے تاریخی ماضی میں تشکیل پائی۔ اور توسیع کار کارندوں کے ایسے مرکب کو چُنا ہے، جو اقتدار میں اُس کے قیام کے سلسلے میں بہترین طور پر مددگار ہو سکتے ہیں۔ ان انتخابات کے طویل مدتی متحرک نتائج ہوتے ہیں جن میں سے زیادہ تر ناقابل پیش بینی ہوتے ہیں، یا مستقبل میں اتنی دُور واقع ہوتے ہیں، کہ وہ حال میں حکمران کے لئے کوئی زیادہ فکر کا باعث نہیں ہوتے۔ یہ نتائج اس حقیقت سے اُبھرتے ہیں کہ توسیعی کارندے حکمران کی حمایت مفت میں نہیں کرتے۔ وہ اُس کے صلے میں قوانین اور پالیسیوں میں کچھ عمل دخل چاہتے ہیں۔ اُن کے انتخابات کے مستقبل کے حکمرانوں کے لئے غیر ارادی، ''راستے پر منحصر'' نتائج ہو سکتے ہیں۔

ان ''راستے پر منحصر'' عملوں کی زنجیر میں ہر کڑی علیحدہ طور پر اپنا مفہوم رکھتی ہے، لیکن یہ چیز شاذ ہی واضح ہوتی ہے کہ آخری کڑی پہلی کڑی سے کس طرح سے ملتی ہے۔ اس طرح یہ تجزیہ فطری طور پر تاریخی ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل زنجیر کی ہر کڑی کی شناخت کرتا ہے، آخری نتیجے تک، یہ ڈھانچہ نہ صرف یہ کہ اس بات کی تشریح کر سکتا ہی کہ سن 1000 کے لگ بھگ مشرق وسطیٰ کے حکمرانوں کے لئے کاروبار درست اصلاحات کے لئے کیوں کوئی ترغیب نہ تھی بلکہ یہ اس بات کی بھی توضیح کر سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ ترغیبات کیوں ختم ہوتی گئیں، مزید برآں، یہ اس بات کا مفہوم بھی بیان کرتا ہے کہ مغربی یورپی حکمران بالآخر ایسا کرنے کے لئے کیوں زیادہ جذبہ محرکہ رکھتے تھے، خاص طور پر تحریک اصلاحِ کلیسا کے بعد، اہم بات یہ ہے کہ اس استدلال میں کوئی بھی چیز اس دقیانوسی، آسانی سے رد کئے جانے والے دلائل پر تکیہ نہیں کرتی کہ اسلام کاروبار کا مخالف تھا، یا یہ کہ یہ فطری طور پر عیسائیت کی نسبت زیادہ قدامت پسند تھا۔ بلاشبہ اس ڈھانچے میں کوئی بھی چیز اسلام اور عیسائیت کے کسی اصول پر انحصار نہیں کرتی، سوائے اس کی کہ اسلامی اصول سیاسی اقتدار کو جائزیت بخشنے میں زیادہ مددگار ہے۔

یہ کتاب پہلے، عیسائی حکمرانون کی مذہبی جواز اقتدار حاصل کرنے کی کمزور تر اہلیت کے جامد نتائج پر غور کرتی ہے اس کا مطلب ہے کہ مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے حکمران، یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اپنے اقتدار کو کس طرح توسیع دیں، مختلف تر غیبات رکھتے تھے۔ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران مذہبی جواز بخشی اقتدار سے زیادہ مفادات اُٹھاتے تھے۔ لہٰذا وہ سودا بازی کی میز پر مذہبی اشرافیہ کو ایک اہم نشست دیتے تھے۔ مختصر عرصے کے لئے، دونوں خطوں کے حکمران مختلف

قوانین اور پالیسیوں کی پیروی کرتے تھے، خاص طور پر کاروبار کے معاملے میں۔ دسویں صدی کے آواخر میں مغربی یورپ میں کاروبار کے احیا کے شروع ہونے کے بعد، تاجر ایسے قوانین اور پالیسیوں سے عائد کردہ پابندیوں کی جکڑ میں آ گئے، جو کاروباری معیشت کے لئے ناموزوں تھے۔ یورپی حکمرانوں نے بالآخر معاشی اشرافیہ کو سودا بازی کی بساط پر نشست دے دی۔ کلیسا کی قیمت پر اور بعض اوقات کلیسا سے سرکشی کرتے ہوئے۔ کیونکہ ایسا کرنے کے فوائد، کلیسا کی طرف سے کم توسیع اقتدار دینے کے نقصانات کی نسبت زیادہ تھے۔ مسلمان حکمرانوں کو ایسے قوانین اور پالیسیوں کی تدوین سے جن کی مخالفت مذہبی اشرافیہ کرتی، نفع نقصان کے مختلف سیٹ کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک طرف، معاشی اشرافیہ کے مفادات کے لئے اپنے مفادات سے دستبرداری، قرونِ وسطیٰ کے بہت سے عرصے کے لئے، مغربی یورپ کی نسبت مشرقِ وسطیٰ کی معیشتوں کے لئے زیادہ فائدہ مند تھی۔ کیونکہ مشرقِ وسطیٰ کی معیشتیں مغربی یورپ کی معیشتوں سے آگے تھیں، لیکن مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے لئے مذہبی انتظامیہ کو اُلٹ دینے کے نقصانات بھی بہت زیادہ تھے، کیونکہ اپنی جواز بخشی کے لئے مذہبی علما پر بہت شدت سے انحصار کرتے تھے۔

ان جامد فیصلوں، جو مغربی یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کے لئے، کے متحرک اور ناقابل پیش بینی نتائج تھے۔ اوّل، مغربی یورپی حکمرانوں کی طرف سے کئے گئے فیصلوں نے کلیسا کو مایوس کن صورت حال میں ڈال دیا: یا تو اسے تبدیل ہوتی ہوئی کاروباری ضروریات کی عکاسی کرنے کے لئے اپنے اصول کو جدید بنانا ہوگا (بعد ایک ''ابدی'' اصول کے حامل ہونے کے دعوے کو ترک کرنے کا خطرہ مول لینا ہوگا)، یا یہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کے سامنے ثابت قدمی سے کھڑا ہونا ہوگا (اور اپنی اخلاقی سند کے کھونے کا خطرہ مول لینا ہوگا)۔ دونوں صورتوں میں کلیسا کا اپنی رعایا پر، اور خاص طور پر معاشی اشرافیہ پر اثر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتا گیا۔ دوم، کاروبار کی حمایت کرنے والے قوانین اور پالیسیوں کے، مزید معاشی اور مالی جدّت طرازی کو مہمیز دینے کے غیر ارادی نتائج تھے، سودی مالی دستاویزات کے وسیع پیمانے پر استعمال، جیسا کہ تمسکات ادائیگی نے شراکتوں کے ڈھانچے میں جدّت طرازیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ جوابی طور پر، ان جدّت طرازیوں نے بالآخر بینکنگ نظام کے ظہور اور غیر شخصی تبادلے کے ظہور کی طرف رہنمائی کی۔ یہ نتائج اُس کاروباری انقلاب کے سینکڑوں سال بعد وقوع پذیر



ہوئے، جس نے قوانین اور پالیسیوں میں ابتدائی تبدیلیوں کی جوت جگائی، اور وہ غیر ارادی اور ناقابل پیش بینی تھیں۔ تاہم ایک ایسی دنیا کا تصور کرنا مشکل ہے جہاں ''مغرب کا عروج'' جب اور جہاں بھی یہ واقع ہوا، ان ابتدائی تبدیلیوں کے بغیر واقع ہو جاتا۔ اسی اثنا میں، مشرقِ وسطیٰ میں، حکمرانوں نے شاذ ہی ایسے قوانین بنائے، جو مذہبی حکام کی خواہشات سے کُھلے بندوں تجاوز کرتے، اور اسلامی مذہبی حکام نے کبھی اُس مایوس کُن صورتِ حال کا سامنا نہ کیا، جو اُن کے کیتھولک مشنیوں نے کیا تھا۔ لہٰذا مذہبی جواز بخشی اقتدار، توسیعی دستور کا ایک اہم حصہ رہی، نتیجتاً، وہ اختلافات جو اُس طریقِ کار میں جس میں مشرق وسطیٰ اور مغربی یورپ کے حکمران اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے تھے، ایک وقت میں نسبتاً چھوٹے اختلافات تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے اختلافات بن گئے۔

حکمرانی کی توسیع کاری میں ایک اور اہم ''راستے پر منحصر'' نتیجہ، چھاپے خانے کے پھیلاؤ کے بارے میں مختلف ردِّعملوں کو محیط ہے۔ جامد نقطۂ نگاہ سے، عثمانیوں اور مغربی یورپیوں کے ردِّعمل، اُن کے انتخابات کے نفع نقصان کے تناظر میں قابلِ فہم ہیں۔ چھاپہ خانہ اسلامی مذہبی حکام کے لئے ایک خطرہ پیش کرتا تھا: نا صرف یہ اُن کے معلومات پر کنٹرول اور اُن کے اسلامی فکر کی تخلیق کے لئے اونچی رُکاوٹوں کا خطرہ پیش کرتا تھا، مغربی یورپ میں رونما ہونے والے واقعات یہ ظاہر کرتے تھے کہ چھاپہ خانہ کتنی جلدی ایک خطرے کی زد میں آئی ہوئی مذہبی حاکمیت کو ختم کر سکتا تھا۔ سلطان اپنے اقتدار کو، مذہبی جواز بخشی اور فوجی طاقت کے امتزاج کو استعمال کرتے ہوئے، توسیع دیتا تھا، مذہبی حاکمیت کی تائید کے بغیر اقتدار پر اُس کی گرفت بہت کمزور ہو جاتی۔ لہٰذا عثمانی سلطان کے لئے چھاپہ کا خانے کو روکنے کے لئے ایک ترغیب موجود تھی۔ مغربی یورپ میں ایک مختلف صورتِ حال ارتقا پذیر ہوئی، جہاں چھاپہ خانہ 1450 میں اپنی ایجاد کے بعد تیزی سے پھیلا۔ کلیسا اگر چاہتا بھی تو وہ اس کے پھیلاؤ کو نہ روک سکتا، کیونکہ سیکولر حکمرانوں پر اُس کا اثر نسبتاً محدود تھا۔

طباعت کے طاقتور، ناقابلِ پیش بینی نتائج اور بھی زیادہ اہم تھے۔ ان نتائج میں سے سب سے اہم نتیجہ یہ تھا کہ چھاپہ خانے نے تحریک اصلاحِ کلیسا کے پھیلاؤ کو آسان بنانے میں بہت مدد کی۔ تجربی آزمائشیں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ 1500 سے پہلے چھاپہ خانے کی موجودگی

نے اس بات کے امکان کو 52.1 فیصد درجوں تک بڑھا دیا کہ کوئی شہر 1530 تک پروٹسٹنٹ بن جائے گا، جہاں اصلاح کی سابقہ کوششیں ناکام ہوگئی تھیں، وہاں اصلاح کار اس لئے کامیاب ہو گئے کہ وہ پوپ مخالف شکایات کو تیزی سے پھیلا سکتے تھے، اس سے پہلے کہ کلیسا اُنہیں دبا دیتا۔ اسی اثنا میں، سلطنتِ عثمانیہ میں، خواہ اُسی طرح کی مذہبی علما کے خلاف شکایات ہوتیں جیسی کہ پروٹسٹنٹ اصلاح کاروں کی طرف سے ظاہر کی گئیں، تو بھی مذہبی حاکمیت کے خلاف کوئی بھی تحریک پھیلنے کا امکان کم رکھتی تھی، اور لہٰذا اُس کے عثمانی سلطان کی طرف سے دبا دیئے جانے کا امکان بہت تھا، جو اپنی جواز بخشی کے لئے مذہبی علما پر انحصار کرتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں، وہ چیز جو مذہبی حاکمیت کو کمزور کرسکتی تھی۔ چھاپہ خانہ۔ سلطنت عثمانیہ میں ٹھیک اس وجہ سے نہ پھیل سکا، کہ مذہبی جواز بخشی اقتدار اس قدر اہم تھی۔

اس کتاب میں پیش کئے گئے نقشے کی زنجیر میں آخری کڑی، پروٹسٹزم اور معاشی اثرات کے درمیان تعلق کی ہے۔ اس استدلال کی ایک سرسری قرأت شاید یہ رائے پیش کرے کہ پروٹسٹزم معاشی نتائج کے لئے کیتھولیزم سے ''بہتر'' ہے، یا پھر خود اسلام سے بہتر ہے۔ جہاں تک ان قراتوں کے مفہوم کا تعلق ہے، اُن کا مذاہب کے مواد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مذہب اور معاشی نتائج کے درمیان تعلق، مذہبی اشرافیہ کے، سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے کی صلاحیت کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تعلق اسلام میں کیتھولیزم سے زیادہ تھا اور پروٹسٹزم میں کم سے کم تھا۔ لہٰذا تحریک اصلاحِ کلیسا کے بارے میں جو بات اہم تھی، وہ یہ نہیں تھی کہ اس نے کلیسا کے بعض معمولات کی درستی پر سوال اُٹھایا تھا، یا بلکہ اس کی مذہبی نوعیت کے بارے میں بھی نہیں، اس کی بجائے، اس کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے حکمرانوں اور اُن لوگوں کے درمیان تعلق کو تبدیل کرکے رکھ دیا، جو اس کے اقتدار کو توسیع دیتے ہیں۔ کتاب کے اس بنیادی نکتے کا بطور کل مذہب سے، یا اس حوالے سے، عمومی ثقافت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ لہٰذا، یہ استدلال رچرڈ ٹانے (Richard Tawney) کے (1926) کے، ویبر کو اُس کے ''پروٹسٹنٹ اخلاقیات'' (Protestent Ethic) کے کلاسیکی جواب کے جذبے میں ہے، جو یہ کہتا ہے کہ تحریک اصلاحِ کلیسا کا اہم ترین نتیجہ قانون کی سیکولر سازی سیاسی معیشت تھا۔ ٹانے کی تنقید میں یہ رائے پیش کی گئی کہ کلیسا کے وجود میں ایک کاروبار مخالف فلسفہ پنہاں تھا، اور سرمایہ دارانہ رُجحانات صرف اُس وقت پھیلے جب تحریکِ



اصلاحِ کلیسا نے، مارکیٹ پر کلیسا کے شکنجے کو توڑا۔ یہاں پیش کیا گیا استدلال، ٹانے کے استدلال سے ہم آہنگ ہے، لیکن ایک اہم خم کے ساتھ۔ اس بات پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے کہ کلیسا نے کس طرح قرون وسطیٰ کی سیاسی اور معاشی ثقافت کو متاثر کیا، یا اس بات پر کہ ثقافت کس طرح تحریک اصلاحِ کلیسا کے ساتھ تبدیل ہوئی، میں اُس راستے پر روشنی ڈالتا ہوں، جس کے ذریعے سیاسی اقتدار کی جواز بخشی نے معاشی نتائج کو متاثر کیا۔ اس عمل میں، میں نے اس بات کا جواب دیا ہے کہ اوّل مذہبی اشرافیہ کو حکمرانوں کی طرف سے کئے گئے فیصلوں پر اثر انداز ہونے کی طاقت کیوں حاصل تھی، اور یہ طاقت پالیسی میں کس طرح اپنا اظہار کرتی تھی۔

ابواب 7 اور 8 میں تجزیہ کی گئی تاریخی مثالیں اس تصور کی تائید کرتی ہیں۔ 1600 تک وہ طریقہ جس سے اقتدار کو وسیع دی جاتی تھی، پروٹسٹنٹ شمال مغربی یورپ میں بڑی حد تک اُس طریقے سے مختلف تھا جو کیتھولک یورپ میں اپنایا جاتا تھا، اور اُس طریقے سے اور بھی زیادہ مختلف تھا جو مشرقِ وسطیٰ میں اپنایا جاتا تھا۔ پروٹسٹنٹ انگلستان اور جمہوریہ ڈچ میں، تحریکِ اصلاحِ کلیسا نے کلیسا کی اقتدار کو توسیع بخشنے کی اہلیت کو ختم کردیا۔ اس کے ردِّعمل کے طور پر، حکمرانوں نے اپنے اقتدار کو توسیع دینے اور ٹیکس کے محصولات مہیا کرنے کے لئے، پارلیمانوں کا رُخ کیا، جو زیادہ تر معاشی اشرافیہ پر مشتمل تھیں۔ اس طرح معاشی اشرافیہ نے سودا بازی کی میز پر نشست حاصل کرلی، جسے انہوں نے ایسے قوانین اور پالیسیاں مرتب کرنے کے لئے استعمال کیا جو ان کے مفادات کو پورا کرتی تھیں۔ اور معاشی اشرافیہ کے مفادات عمومی طور پر اُن قوانین اور پالیسیوں کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے جو کلاں معاشی خوشحالی کے ساتھ لگا کھاتی تھیں۔ انگلستان میں، تاج اور پارلیمان نے نئے قوانین منظور کرکے حقوق ملکیت کو وضاحت مہیا کی۔ سودی قوانین کو نرم کیا، اور غریبوں کی مدد میں بہتری پیدا کی۔ جمہوریہ ڈچ میں، معاشی اشرافیہ نے عوامی بہبود کی چیزوں کی فراہمی جیسا کہ وسیع پیمانے پر ترقی یافتہ نقل و حمل کے نظام اور زمین کی بحالی کے لئے گفت وشنید کی۔ اسی اثنا میں کیتھولک ہسپانوی بادشاہ نے کلیسا سے جوازِ اقتدار حاصل کرنا جاری رکھا، پوپ نے فرڈیننڈ اور ازابیلا کو، ''اسلام کے خلاف جنگ'' میں اُن کے کردار کے بدلے میں ''کیتھولک شاہان'' کا تاج پہنایا۔ جواز اقتدار کے اس ذریعے نے، امریکاؤں سے دھڑا دھڑ آنے والے سونے اور چاندی کے پہاڑوں کے ساتھ مل کر، ہسپانوی بادشاہ کے لئے،

www.MashalBooks.org

اپنی معاشی اشرافیہ کو یکسر نظر انداز کرنے کو ممکن بنایا۔ لہٰذا ہسپانوی بادشاہ نے ایسی پالیسیوں کو اپنایا، جنہوں نے دوسرے اہم طرفداروں کے حلقے کی قیمت پر معاشی مفادات کو نقصان پہنچایا، اس کی مثالوں میں شامل ہیں، مقدس سلطنت رُوما میں جنگیں، یہودیوں اور مسلمانوں کی عقوبتیں، بھیڑوں کے مالکان کے گلڈ کا تحفظ، کسانوں اور شہریوں پر بہت زیادہ ٹیکس، اور بنیادی اشیاء پر برآمدی محصولات، سلطنتِ عثمانیہ میں، اسلامی مذہبی حکام کے پاس جواز بخشی اقتدار کی اس سے بھی زیادہ اہلیت تھی، اور سلطان کے لئے معاشی اشرافیہ کو سودا بازی کی میز پر لانے کی ترغیب نہ ہونے کے برابر تھی، یہ بات سلطنتِ عثمانیہ کے توسیع کے عہد سے لے کر سولھویں صدی تک خاص طور پر صحیح تھی، جب فوجی اشرافیہ بھی سلطان کو اقتدار کی توسیع دے رہی تھی۔ عثمانی تاجروں، صنعتکاروں اور صرافوں کا حکمرانی میں کبھی کوئی عمل دخل نہیں تھا، اور عثمانی پالیسی اس کی عکاسی کرتی تھی۔ حقوق ملکیت نسبتاً غیر محفوظ تھے۔ اسلامی عدالتیں کاروباری معاملات کے فیصلے کرتی تھیں، اور عثمانی اکثر اوقات اپنی کرنسی کی قیمتیں کم کرتے تھے۔

دوسرے لفظوں میں، عیسائی اور مسلمان مذہبی حکام کی اقتدار کی جواز بخشی کی صلاحیتوں کے، جو دونوں مذاہب کی پیدائشوں کے وقت کے حالات کی وجہ سے پیدا ہوئیں، اہم طویل مدتی معاشی نتائج تھے۔ مشرق وسطیٰ میں، یہ تعلق خود کو تقویت پہنچانے والا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران مضبوط تھے۔ اور اُسی چیز نے جس نے انہیں مضبوط رکھا۔ مذہبی جواز بخشیِ اقتدار۔ دوسرے اہم توسیعی کارندوں سے گفت وشنید سے باز رکھا، یا ایسے قوانین اور پالیسیوں کی اجازت دینے سے باز رکھا، جو مذہبی حاکمیت کو کمزور کرنے کی اہلیت رکھتیں۔ دوسری طرف، مغربی یورپی حکمرانوں کی مقابلتہً کمزوری نے انہیں معاشی اشرافیہ کے ساتھ زیادہ مہنگے مذاکرات میں شامل ہونے پر اُکسایا۔ ان مذاکرات کے غیر ارادی، ''راستے پر منحصر'' نتائج نے، کلیسا کی اقتدار کی جواز بخشی کی اہلیت کو مزید کمزور کیا، خاص طور پر تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد۔ اس نے مغربی یورپی حکمرانوں کو معاشی اشرافیہ کے ساتھ مذاکرات کرنے پر مزید اُکسایا۔ نتیجتاً اُنہوں نے ایسے قوانین اور پالیسیاں وضع کیں جو معیشت کے لئے زیادہ فائدہ مند تھیں۔

☆☆☆



# مُمکنہ غلط فہمیاں

پوری کتاب کے دوران، میں نے اُن چار غلط فہمیوں کے دُور کرنے کی کوشش کی ہے، جو کوئی شکی مزاج قاری اس کے دلائل کے ساتھ منسوب کر سکتا ہے۔ ان پر باری باری سے نظر ثانی کرنا اہم ہے۔

**غلط فہمی نمبر 1:** معاشی اشرافیہ کی سیاسی طاقت میں اضافہ کرنا، طویل معاشی ترقی کے لئے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

تاریخی استدلال کا ایک اہم حصہ یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ شمال مغربی یورپ، تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد طویل مدتی معاشی کامیابی کے لئے تیار تھا، کیونکہ کلیسا نے اپنا توسیع اقتدار کا کردار پارلیمان میں معاشی اشرافیہ کے حق میں ترک کر دیا تھا۔ ایک غیر محتاط قاری اس دلیل کا آسانی سے یہ مطلب اخذ کر سکتا ہے۔

**دو معاشی اشرافیہ:** اچھی، مذہبی اشرافیہ = بُری'' ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ نکتہ محض یہ ہے کہ، مذہبی اشرافیہ کی طرح معاشی اشرافیہ اپنے مفادات کی نگرانی کرتی ہے۔ ہوتا اس طرح ہے کہ اُن کے ذاتی مفادات، اکثر اوقات اُنہیں ایسے قوانین اور پالیسیاں بنانے پر اُکساتے ہیں، جو پوری معیشت کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ لیکن معاشی اشرافیہ کے محرکات ''ہمیشہ'' اُن قوانین اور پالیسیوں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے، جو معاشی کامیابی کی نوید سنائیں، کرایہ لینا، جو کہ تمام معیشتوں میں موجود ہے، اس کی ایک مثال پیش کرتا ہے۔ طاقتور معاشی اشرافیہ اکثر اوقات اپنی طاقت کو اجارہ داری کی مالی امدادوں، حکومتی رعایتوں، اور فائدہ مند ٹیکس کی پالیسی کے ذریعے اپنی جیبوں کو مضبوط کر سکتی ہے۔ ایسی مراعات جیت کاروں سے شکست خوردہ زیادہ پیدا کرتی ہیں، اور انجام کار دولت کو اُن لوگوں میں دوبارہ تقسیم کرنے پر ختم ہوتی ہیں، جو پہلے ہی دولت مند ہوتے ہیں، بلاشبہ، اس کے بارے میں، اٹھارویں صدی کی ڈچ جمہوریہ کے جائزے میں گفتگو کی گئی تھی

(دیکھئے باب 7)۔ڈچ لوگ سترھویں صدی میں ایک ایسی معیشت کے ذریعے عروج میں آئے، جو صنعت، تجارت اور حد درجے کی پیداواری زراعت پر مبنی تھی، معاشی اشرافیہ نے جمہوریہ کی حکمرانی میں ایک اہم کردار ادا کیا، اور وہ ان میدانوں میں مفادات کی حامی پالیسیوں اور قوانین کے لئے بڑی حد تک ذمہ دار تھے۔لیکن معاشی کامیابی کے ساتھ خصوصی مفادات آئے۔1670 کی دہائی کے بعد، یہ مفادات ڈچ سیاست پر غالب آ گئے، ایسے صنعتی ضوابط کے لئے دباؤ ڈالتے ہوئے، جو نو واردوں کی قیمت پر ان کے اپنے مفادات کی حمایت کریں، ایسے ٹیکسوں کے لئے جو معاشرے کے ایک چھوٹے سے طبقے کی غیر متناسب طور پر خدمت کریں، اور دوسرے بہت سے اقدامات کے لئے، جو بہت سے لوگوں کی قیمت پر چند لوگوں کو فائدہ پہنچائیں۔

پس، اس کتاب میں کوئی ایسا اشارہ نہیں، کہ معاشی اشرافیہ کو زیادہ سیاسی طاقت دینا ہمیشہ معیشت کو بہتر بناتا ہے۔ جو بات صحیح ہے، وہ یہ ہے کہ معاشی اشرافیہ کو صفر سیاسی طاقت دینا، یقیناً معاشی ترقی کے لئے نقصان دہ ہے کیونکہ دوسرے توسیعی کارندے ممکنہ طور پر معاشی ترقی کے لئے مفید دلچسپیاں نہیں رکھتے، لہٰذا ایسی دلچسپیوں کو ایک معاشرے کے فیصلوں میں زیادہ عمل دخل دینا، ایسے قوانین اور پالیسیوں پر منتج ہوگا، جو معاشی ترقی کے لئے کم فائدہ مند ہوں گے۔ معاشیات کی اصطلاحات میں معاشی اشرافیہ کے لئے طاقت کے حصے کے لئے ایک ''اندرونی مناسب ترین صورتِ حال'' ہوتی ہے۔ بہترین کسر صفر نہیں ہے نہ ہی یہ ایک ہے۔ جس طرح معاشی اشرافیہ کی سیاسی بے اختیاری نے جدید سپین اور سلطنت عثمانیہ کے ابتدائی طویل مدتی معاشی مقدروں کو نقصان پہنچایا۔ اُسی طرح ایک ایسی حیثیت بھی جو کلی طور پر کارپوریشنوں اور دولت مند طاقت کے دلالوں کی طرف سے چلائی جائے، معاشرے کی وسیع اکثریت کے لئے تباہ کُن ہوسکتی ہے۔

**غلط فہمی نمبر 2:** ایک ایسی دلیل جو اس بات سے نمٹتی ہے کہ مشرق وسطیٰ کی معیشتیں کیوں مغربی یورپی معیشتوں سے پیچھے رہ گئیں، اسلام کی پہلی چند صدیوں کے دوران مشرقِ وسطیٰ کی یورپ پر برتری کی توجیہہ نہیں کرسکتی۔

یہ غالباً سب سے زیادہ پریشان کُن غلط فہمی ہے، کیونکہ میں نے یہ وضاحت کرنے کے لئے بہت محنت کی ہے، اسلامی مشرقِ وسطیٰ کی ابتدائی بڑھوتری، اس کے بعد والے جمود کے ساتھ کس



طرح قابل تطابق ہے۔ یہ بھی قارئین کی غلط فہمی ہے، جو یہ بھی پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کتاب اسلام کی مثبت چیزوں کے بارے میں کیوں کچھ نہیں بولتی۔ مجھے اس بات کی طرف توجہ دلانے سے آغاز کرنے دیجئے کہ یہ کتاب عیسائیت پر بھی کوئی مثبت روشنی نہیں ڈالتی۔ تاہم یہ کوئی سنجیدہ تنقید نہیں ہے۔ ایک اچھا مفروضہ وہ ہوتا ہے جس کی بنیاد تجربی ہو، نا کہ وہ جو متنازع بات سے پہلو بچا کر چلے، یا لوگوں کو محض وہ کچھ بتائے جو کچھ وہ سننا چاہتے ہیں۔

یہ کتاب بیان کرتی ہے کہ قبل جدید معاشی ماحول میں کہ اسلام کے اتحاد بخش نظریے نے تجارت کے لئے، اُس سے زیادہ سازگار ماحول مہیا کیا، جو مشرقِ وسطیٰ میں ہر طرف پھیلی ہوئی پارہ پارہ حکومتوں نے، اور سلطنت روما کے سقوط کے بعد مغربی یورپ نے کیا۔ اسلام کی اقتدار کی جواز بخشی کے لئے سازگاریت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمرانوں کو اسلامی قانون کے اُبھرتے ہوئے ذخیرے کو لاگو کرنے کی حوصلہ افزائی ملی، جو کاروبار کا احاطہ کرتا تھا، اور قبل جدید دور کے معاشی جھگڑوں کے فیصلے کرنے کے لئے بھی موزوں تھا۔ وہ سوال جس کا جواب یہ کتاب دینے کا آغاز کرتی ہے یہ ہے، کہ مشرقِ وسطیٰ اس قرونِ وسطیٰ کے توازن میں کیوں ''پھنس کر رہ گیا'' جس کا مطلب ہے کہ ایسے قوانین اور پالیسیاں بمشکل پیدا ہو سکے جو تاجروں اور دوسرے معاشی اداروں کی تبدیل ہوتی ہوئی ضروریات کو پورا کر سکتے، اُن ضروریات کو جن کی غالباً پہلی چار اسلامی صدیوں میں، پیش بینی نہ کی جاسکی لیکن اس کا یہ مطلب لینا غلط ہوگا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں کتاب کا استدلال شروع ہوتا ہے۔ اگر مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپ کے درمیان اضافہ ''مقدروں کے پلٹے'' جیسے اور صفحات بھی مختص کئے گئے ہیں، لیکن یہ کتاب ایک ایسی توضیح پر توجہ مرکوز کرتی ہے، جو مشرقِ وسطیٰ کے ابتدائی عروج کی بھی توجیہہ کرتی ہے۔

**غلط فہمی نمبر 3:** مذہب نقصان دہ ہے۔

مذہب پر لکھنا خطرناک ہے، اور اُس میں ہمیشہ ناراض کرنے کا امکان رہتا ہے، یہ بات خاص طور پر اس وقت صحیح ہوتی ہے جبکہ بنیادی مفروضہ یہ ہو کہ ''پروٹسٹنٹ مغرب کا عروج، جزوی طور پر مذہبی حکام سیاسی طاقت کی کمی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس استدلال میں کوئی بھی چیز، کسی بھی اسلامی یا عیسائی احکام کے مواد پر تکیہ نہیں کرتی، سوائے اُن کے جو سیاسی جواز بخشی کی سہولت کاری کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں، یہ استدلال مذہب کے روز

www.MashalBooks.org

مرّہ زندگی میں کردار کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں کہتا، مذہب نیکی کا ایک طاقتور ذریعہ ہو سکتا ہے، اور یہ بُرائی کا بھی طاقتور ذریعہ ہوسکتا ہے، خاص طور پر اُس وقت جب اسے قابل مذمت اعمال کا جواز بنانے کے لئے استعمال کیا جائے۔ میرے خیال میں، مذہب دنیا کے لئے انجام کار خیر مہیا کرتا ہے۔ وہ فوائد جو یہ افراد اور معاشروں کو بہم پہنچاتا ہے، اس کے اخراجات سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن میرے ذاتی خیالات اس استدلال سے لاتعلق ہیں، کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ مذہب اچھائی اور بُرائی دونوں کا ذریعہ ہوسکتا ہے۔ وہ سب جو اہمیت رکھتا ہے یہ ہے کہ مذہب اقتدار کو توسیع دے سکتا ہے۔

یہ کتاب یہ استدلال ضرور کرتی ہے کہ اقتدار کی مذہب کی طرف سے توسیع، طویل مدتی معاشی خوشحالی کے لئے، اقتدار کی معاشی اشرافیہ کی طرف سے توسیع کی نسبت خراب تر ہوتی ہے۔ یہ ایک قابل تکذیب، مثبت بیان ہے۔ یہ اس بارے میں ہے کہ دُنیا کیسی ''ہے'' نا کہ اس بارے میں کہ دُنیا کیسی ہونی چاہئے۔'' یہ استدلال اس بارے میں کہ آیا معاشی خوشحالی ایک معاشرے کے لئے اچھا نصب العین ہے یا نہیں، کوئی معیاراتی دعویٰ نہیں کرتا۔ اس کتاب کا مقصد یہ سمجھنا ہے کہ مغرب کیوں امیر ہوگیا اور مشرق وسطیٰ نہ ہوا۔ یہ خوشحالی کی اخلاقیات کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتی۔ یہ ایک بالکل ہی مختلف مطالعے کا موضوع ہے۔

یہ بات بار بار واضح کی گئی ہے کہ مذہبی توسیع اقتدار میں کوئی چیز منفرد طور پر بُری نہیں ہے۔ بلاشبہ فوج یا پولیس کے جبر سے اقتدار میں توسیع بھی ممکنہ طور پر اُس کے برابر، اگر اُس سے بھی زیادہ شدید نہیں، معاشی ترقی پر پسماندگی کا اثر ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ سادہ ہے۔ توسیعی کارندے اپنے ذاتی مفاد کو مدِّنظر رکھتے ہیں۔ یہ بات مذہبی اشرافیہ کے بارے مین بھی اُتنی ہی صحیح ہے جتنی معاشی یا فوجی اشرافیہ کے بارے میں ہے۔ اور اگرچہ مذہبی اشرافیہ کے کچھ ایسے مفادات ضرور ہیں جو معاشی کامیابی سے لگا کھاتے ہیں، جیسا کہ غریبوں کی مدد کے ذریعے سماجی نظم وضبط کو قائم رکھنا، لیکن اُن کے بہت سے دوسرے مفادات ہیں جو اس سے لگا نہیں کھاتے، جیسا کہ سود لینے پر پابندیاں۔ اسی طرح فوج کے بھی کچھ مفادات معاشی کامیابی سے مطابقت رکھتے ہیں، اور دوسرے مفادات اس سے مطابقت نہیں رکھتے۔ فوجی ذرائع میں اضافہ کرنا غیر ملکی حملے کے خلاف تحفظ مہیا کرتا ہے، یا سماجی بے چینی کو ختم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ متبادل طور پر، یہ عوام کو دہشت زدہ کرسکتا



ہے، یا کسی غیر مقبول حکمران کو اقتدار میں رکھ سکتا ہے۔ مرکزی نکتہ صرف یہ ہے کہ معاشی اشرافیہ کی مطلوبہ پالیسیاں، جو ان کے اپنے مفاد پر مبنی ہوتی ہیں، اُن پالیسیوں کے ساتھ، جو معاشی کامیابی کو آگے بڑھاتی ہیں، مذہبی اشرافیہ کی پالیسیوں کی نسبت زیادہ مطابقت رکھتی ہیں۔

**غلط فہمی نمبر 4:** مشرقِ وسطیٰ مغربی یورپ سے، اُس کردار کی وجہ سے پیچھے رہ گیا جو اسلام سیاست میں ادا کرتا ہے۔

اس کتاب میں پیش کئے گئے استدلال میں کوئی بھی چیز جبری نہیں ہے۔ تاریخ مقدر نہیں ہے، اور یہ نتیجہ اخذ کرنا ایک بہت بڑی غلط تعبیر ہے۔ اُس کی بجائے یہ ڈھانچہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اداکاروں کو بعض خاص اوقات میں بعض خاص فیصلے کرنے کی ترغیب کس چیز نے دی، اور اس طرف بھی کہ ان فیصلوں سے مستقبل کے فیصلہ سازوں کی ترغیبات کو کس طرح متاثر کیا۔ اس استدلال میں کوئی چیز جبری نہیں ہے، اور کوئی چیز اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ مغربی یورپ اور مشرقِ وسطی کے معاشی راستوں کو اس انداز سے جُدا ہونا ہی تھا، جس طرح کہ مشاہدہ کیا گیا، اُس کی بجائے اس کا مطلب محض یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ اور مغربی یورپی حکمرانوں کے اقدامات کے، اُن ترغیبات پر جو مستقبل کے حکمرانوں کے سامنے تھیں، غیر ارادی اور ناقابلِ پیش بینی نتائج تھے، جنہوں نے خود ایسے اقدامات کئے جن کے مزید مستقبل کے حکمرانوں کے لئے ناقابلِ پیش بینی نتائج تھے۔

بیان کردہ ''راستے پر منحصر'' سلسلے میں، ہر قدم نے خوشحالی کو پروٹسٹنٹ مغربی یورپ میں زیادہ امکانی بنایا اور مشرقِ وسطیٰ میں نہیں۔ عثمانیوں کا چھاپہ خانے کو روکنے کا معاملہ، ان ''راستے پر منحصر'' طریقِ ہائے عمل میں جبریت کی موجودگی کو واضح کرتا ہے۔ یہ بات بلاشبہ ممکن ہے کہ کوئی روشن خیال سلطان، چھاپہ خانے کی اجازت دے کر اور اس کے پھیلاؤ کی حوصلہ افزائی کر کے معاشی تاریخ کے دھارے کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیتا۔ لیکن صدیوں تک کسی سلطان کے ہاں صحیح ترغیبات نہ تھیں۔ اگرچہ یہ بات کسی طرح بھی خود سے واضح نہیں ہے، کہ طویل مدتی معاشی رجحانات اُلٹائے جانے کے قابل تھے اگر عثمانیوں نے چھاپہ خانے کی اجازت دے دی ہوتی، لیکن یہ خلافِ امر واقعہ تاریخ وضع کرنے کا ایک دلچسپ موقع ضرور فراہم کرتی ہے۔ عثمانی

www.MashalBooks.org

طباعت کا سب سے براہِ راست نتیجہ مذہبی حاکمیت کے، اس کی جواز بخشی اقتدار کی طاقت کی مخالفت کا سامنا کرنے کی شکل میں ہوتا۔ یہ مخالفت عوام کی طرف سے، ینی چری کور کی طرف سے، یا اعیان کی طرح کے مقامی اقتدار کے دلالوں کی طرف سے آ سکتی تھی، چھاپہ خانے کے ذریعے سے مذہبی علماء کے خلاف پیغام کو پھیلانا نسبتاً آسان ہوتا۔ ایک کمزور مذہبی انتظامیہ کے ساتھ، جو جوازِ اقتدار مہیا کرنے کی کم اہل ہوتی، عثمانی اپنے اقتدار کو توسیع دینے اور اطمینان بخش ٹیکس کی وصولی کرنے کی خاطر، تمام معاشی طور پر طاقتور فریقوں کو مذاکرات کی میز پر لانے کی ترغیب محسوس کرتے۔ اس میں غالباً فوج، اعیان اور معاشی اشرافیہ شامل ہوتی۔ اگر عثمانی اپنے اقتدار کو اس طریقے سے توسیع دیتے، تو پھر، حقوقِ ملکیت، جدّت طرازی، تحقیق اور معاشی بڑھوتری کی حوصلہ افزائی کرنے والے قوانین ممکنہ طور پر اُبھرتے۔ یہ خلافِ امرِ، واقعات کا سلسلہ واضح ہے کہ واقع نہ ہوا۔ لیکن ادارہ جاتی تبدیلی کا یہ فقدان، کچھ عارضی اقدامات یا ثقافتی رجعت پسندی کی وجہ سے واقع نہیں ہوا۔ یہ اُن طریق ہائے کار سے پیدا ہوا، جو اگرچہ ناگزیر طور پر نہیں، لیکن گہرے طور پر تاریخی ماضی میں پیوست تھا۔

☆☆☆



# مغرب کے عروج کے ضمنی مفاہیم

اس کتاب میں پیش کئے گئے دلائل کے ''مغرب کے عروج کو سمجھنے کے لئے ہمارے لئے ضمنی مفاہیم ہیں۔ لیکن ایک ضمنی مفہوم ایسا ہے جسے قارئین کو زیادہ لمبا نہیں کھینچنا چاہتے: یہاں اُن خصوصی میگانیوں کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے جو صنعتکاری پر منتج ہوئے۔ بلاشبہ اس کتاب کے بنیادی دلائل صرف مغربی (اور شمال مغربی) یورپ اور مشرقِ وسطیٰ کے درمیان سترھویں صدی کے آغاز تک زیادہ بڑے اختلافات کی توضیح کرنے کی کوشش کرنے میں بعروف معاشی مورخین جیسا کہ جوئیل موکائر (Koel Mokyr) اور رابرٹ ایلن (Robert Allen) کی طرف سے پیش کردہ دلچسپ انگلستان کی صنعتی عروج کے دلچسپ احوال، اُن عوامل کا بہت کہرائی تک کھوج لگاتے ہیں، جنہوں نے اٹھارویں صدی میں صنعت کاری کے آغاز کو ممکن بنایا، اور میرا ارادہ ان دلائل کی مخالفت کرنے کا نہیں ہے۔

اس کتاب نے، صنعتکاری کی طرف سے لائے گئے معاشی انقلاب کی پیشگی شرائط کی شناخت کرنے کو اپنا ہدف بنایا ہے، اور اس بات کی توضیح کو کہ 1600 تک شمال مغربی یورپ ایسے انقلاب کے لئے ایک ممکنہ اُمیدوار تھا۔ یہ اس انقلاب کی جڑوں کا کھوج اُن سیاسی تبدیلیوں میں لگاتی ہے جو تحریکِ اصلاح کلیسا کے بعد واقع ہوئیں۔ لیکن میرا استدلال یہ نہیں ہے کہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا ایک علیحدہ باہر سے پیدا ہونے والا واقعہ تھا۔ جس نے الل ٹپ بعض خوش قسمت قوموں کو اپنا ہدف بنایا۔ بلکہ تحریکِ اصلاحِ کلیسا تو ''راستے پر منحصر'' واقعات کے ایک لمبے سلسلے کا نقطہ عروج تھا۔ جن میں سے ہر ایک واقعہ قابل توجیہہ ہے، اگر راستے کے ہر گزشتہ قدم کو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ادارہ جاتی ماحول کو مدِّنظر رکھا جائے۔ اور اگرچہ یہ کتاب اس راستے کا کھوج پیچھے کی طرف تمام راستہ طے کرتے ہوئے عیسائیت اور اسلام کی پیدائشوں تک لگاتی ہے، لیکن زیادہ تر کارروائی وسطی دور کے نصف آخر میں واقع ہوتی ہے (1517 - 1000)

www.MashalBooks.org

یہ اُسی وقت تھا کہ کاروباری انقلاب نے مغربی یورپ میں کلیسا اور ریاست کے درمیان جواز بخشی اقتدار کو کمزور کرنے میں سہولت پیدا کی۔ یہ بھی اُسی وقت تھا کہ اسلامی دُنیا میں ایک گہری بنیادوں والا مختلف قوتوں کے درمیان توازن پیدا ہوا، جس نے مذہبی حکام نے سیاسی اقتدار کے جواز دہندہ ہونے کے اپنے کردار کی وجہ سے سیاسی سودا بازی کی میز پر اپنا اختیار حاصل کر لیا۔ آخری بات، یہ دور وسطی کے آخیر پر ہی تھا کہ چھاپہ خانہ مغربی یورپ میں پھیلا، جبکہ عثمانیوں نے اس کو دبا دیا، اُن اسباب کی بنا پر جو کلیتہً اُس طریقہ سے مطابقت رکھتے تھے، جس پر دونوں خطوں کے حکمران اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے تھے۔

یہ وہ پیشگی حالات تھے، جنہوں نے تحریکِ اصلاحِ کلیسا کو مغربی یورپ کے بعض حصوں میں قدم جمانے کے قابل بنایا، جبکہ اسی طرح کی مذہبی انتظامیہ کی کمزوری کا مشرق وسطیٰ میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ کتاب ان لوگوں کی کتابوں سے مطابقت رکھتی ہے، رابرٹ لوپیز (Robert Lopez) ڈگلس نارتھ (Douglass North)، ایونر گریف (Auner Greif) تیمور کُران (Timur Kuran)، ڈیرڈرمیکلوسکی (Dierdre Medosky) اور جین لوٹین وین زینڈن (Jan Luiten Van Zanden) جن میں سے سب کے سب جدید معیشت کی جڑوں کی تلاش قرون وسطیٰ میں کرتے ہیں۔ جہاں میں ان علما سے اختلاف کرتا ہوں، وہ ہے میرا فوکس اس طریقے پر جس پر حکمران اپنے اقتدار کو توسیع دیتے ہیں۔ سودا بازی کی میز پر کھلاڑی مغربی یورپ میں اور مشرقِ وسطیٰ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اور وہ بالآخر پروٹسٹنٹ اور کیتھولک یورپ میں بھی مختلف تھے۔

وہ طریقِ کار جس کے ذریعے یہ واقع ہوا فطری طور پر تاریخی تھا۔ دوسرے لفظوں میں، یہ پہلے سے طے شدہ ہرگز نہ تھا۔ اُن میکانیوں کو سمجھنا جن کے ذریعے یہ واقع ہوا، اہم ہے، اور محض تاریخی، معلومات کی غرض سے نہیں ہے۔ جدید دولت کی چابیاں اب بھی صرف دنیا کی ایک قلیل آبادی کو میسّر ہیں، لہٰذا یہ جاننا کہ حقیقت میں انگلستان میں کیا واقع ہوا۔ اور بالآخر یورپ شمالی امریکہ، اور بہت بعد میں مشرقی ایشیاء میں اس کے پیروکاروں میں..... اُس ایک راستے کی مثال مہیا کرتا ہے جو کامیاب رہا۔

کیا یہ راستہ قابلِ اعادہ ہے؟ مختصر جواب یہ ہے کہ ''نہیں'' ''راستے پر منحصر'' طریق ہائے



عمل کی نوعیت یہ ہے کہ ایک واقعہ دوسرے پر تعمیر ہوتا ہے، اور بے قاعدہ، نا قابل کنٹرول واقعات حقیقی خط مستدیر بناتے ہیں، کیا ہنری ہشتم تحریکِ اصلاحِ کلیسا کو انگلستان لے آیا ہوتا اگر ایرے گون کی کیتھرین نے اُس کے لئے ایک بیٹے کو جنم دیا ہوتا، یا پوپ نے اسے طلاق کی اجازت دے دی ہوتی؟ ہم کبھی نہیں جان سکیں گے۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہنری ہشتم کے فیصلے کے نا قابل پیش بینی نتائج دُنیا کو تبدیل کرنے والے تھے۔ کیا ڈچ لوگوں کے پاس سولھویں اور سترھویں صدیوں میں دُنیا کی سرکردہ معیشت ہوتی، اگر ہسپانیہ نے ڈچ بغاوت کو اس کے ابتدائی مراحل میں ہی کچل دیا ہوتا (جو تقریباً متعدد مرتبہ ہوا)؟ غالباً نہیں: ڈچ سودا بازی کی میز بہت مختلف نظر آتی، اگر معاشی اشرافیہ کا قوانین اور پالیسیوں میں بہت کم عمل دخل ہوتا۔

اس کے باوجود، انگلیسی اور ڈچ مثالیں مطالعہ کرنے کے قابل ہیں۔ اگرچہ وہ مکمل طور پر قابل اعادہ نہیں ہیں تمام اقدامات اپنے راستوں کے ساتھ بے قاعدہ نہیں تھے، جن کی اہمیت اُس وقت واضح ہوتی ہے جب اُن کا موازنہ مشرق وسطیٰ کے اداروں کے ساتھ کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک عمومی دعویٰ کر دیا جائے کہ ''ادارے اہمیت رکھتے ہیں'' بلکہ اس سے بہت زیادہ تحقیقی دعویٰ کیا جائے کہ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ اقتدار کو کون توسیع دیتا ہے۔ انگریز، ڈچ..... اور آخر کار دوسری یورپی اقوام اور ریاست ہائے متحدہ اس نقطے تک کیسے پہنچے جہاں ایک ''خاصا اچھا'' توسیع اقتدار کا دستور اپنی جگہ پر تھا، یقیناً کہانی کا بنیادی حصہ ہے۔ یکساں طور پر ان نتائج کا سمجھنا بھی اہم ہے، جو اُس وقت سامنے آتے جب ایک مرتبہ یہ دستور اپنی جگہ پر آ گئے۔ جو خر الذکر معاملہ ہم عصر مسائل کے ساتھ ایک مناسبت رکھتا ہے۔

☆☆☆

www.MashalBooks.org

# اکیسویں صدی اور اُس سے آگے کے لئے مضمرات

دُنیا کی تقریباً نصف آبادی 2 ڈالر یومیہ سے کم پر گزارہ کرتی ہے، اور تقریباً پانچواں حصہ 1 ڈالر یومیہ سے بھی کم پر۔ واضح بات ہے کہ جدید معیشت کے ثمرات زیادہ دور تک نہیں پہنچے۔ اس وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی غربت کا ایک نہایت پریشان کن پہلو یہ ہے کہ یہ غیر ضروری ہے۔ مثال کے طور پر آج سے پانچ سو سال پہلے کے برعکس، انسانوں کے پاس اتنی تکنیکی صلاحیت ہے کہ وہ دُنیا کی تمام آبادی کو ایک آرام دہ اندازِ زیست مہیا کر سکیں، پھر، ان کے زیادہ لوگ کیوں ابھی تک ذلت کا آمیز غربت میں زندگی بسر کرتے ہیں؟

بلاشبہ اس سوال کے بہت سے جواب ہیں اور تناظر واضح طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ زیریں صحارائی افریقہ کی غربت کے اسباب جنوبی یا وسطی ایشیا کی غربت کے اسباب سے مختلف ہیں، اور عالمی غربت کے لئے کوئی ایک اکسیر موجود نہیں ہے۔ لیکن ایک چیز جو زیادہ تر غربت زدہ علاقوں..... ساتھ ہی ساتھ بہت سے زیادہ دولتمند لیکن ''ترقی'' سے دور علاقوں..... میں مشترک ہے، وہ ہے خراب حکمرانی، خاص طور پر معاشی مسائل کے حوالے سے۔

یہ کتاب اس بات کی کہ، معاشی ثمرات کے جھکے ہوئے ہونے کے باوجود، خراب حکمرانی کیوں موجود ہے، پہلے درجے کی وجہ فراہم کرتی ہے۔ زیادہ تر حالات میں یہ اُس طریقے کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں اقتدار کو توسیع دی جاتی ہے۔ اکیسویں صدی میں بُری حکمرانی کو عموماً فوج یا رضا کار فوج کی طرف سے حکمرانی کی توسیع کاری سے منسوب کیا جاتا ہے۔ وہ سودا بازی کی میز پر ایک نشست کے بدلے، بصورتِ دیگر غیر مقبول حکمرانوں کو اقتدار میں رکھتے ہیں۔ عمومی طور پر یہ بالآخر اس انجام پر پہنچتے ہیں کہ اُن کی جیبیں خوب بھری ہوئی ہوتی ہیں۔ مذہبی توسیع اقتدار کو بھی بعض اوقات بُری حکمرانی کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ افغانستان اور سعودی عرب بطور دو قوموں کے نمایاں ہیں، جن کے قائدین مذہبی حکام کی حمایت پر اس قدر زیادہ انحصار کرتے ہیں،



جو عوام کی معاشی خوشحالی کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

ایک مشکک پوچھ سکتا ہے: کیا کچھ امیر ترین ممالک (فی کس آمدنی کے مفہوم میں) عرب ممالک نہیں ہیں، جن کے قائدین مذہبی جواز بخشی اقتدار پر بھروسہ کرتے ہیں؟ بلاشبہ، قطر، کویت، اور متحدہ عرب امارات تمام ممالک کی فی کس آمدنیاں ایک اور ای سی ڈی (Organization for Economic Cooperation and Development) ''معاشی تعاون اور ترقی کی تنظیم'' کے اوسط ملک کی نسبت زیادہ ہیں۔ لیکن ایک استثنا کے ساتھ۔ مشرقِ وسطی کے تمام دولتمند ممالک اپنی زیادہ تر دولت تیل سے حاصل کرتے ہیں، سوائے ترکی کے، جو ایک اوسط آمدنی والا ملک ہے۔

یہ بات قطعاً واضح نہیں ہے کہ مشرقِ وسطی کے تیل پیدا کرنے والے ممالک معاشی ترقی کے لئے تیار ہیں۔ جب تک تیل بہہ رہا ہے اُن کی حکومتیں آسانی سے اس میں تیر رہی ہیں، اگرچہ انہیں تیل کی دولت کو ایک طریقے سے تقسیم کرنا پڑے گا کہ وہ بے اطمینانی کو روک سکیں۔ لیکن جب تیل خشک ہونا شروع ہو جائے گا تو وہ کیا کریں گے؟ یا اُس وقت کیا واقع ہوگا جب ایک متبادل، زیادہ صاف ایندھن زیادہ نفع بخش ہو جاتا ہے۔ اس طرح طلب کو کم کر دیتا ہے، اور لہٰذا تیل کی قیمت کو بھی؟ اسی طرح اُس وقت کیا ہوگا جب تیل کی قیمت زیادہ رسد کی وجہ سے گر جائے گی؟

یہ کتاب، اکیسویں صدی میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کو درپیش معاملے کے بہت مشابہ ایک تاریخی مثال پیش کرتی ہے۔ سولھویں صدی کا سپین۔ حقائق پر غور کریں ہسپانوی تاج امریکاؤں سے آنے والے سونے اور چاندی سے دولت کی زبردست فراوانی حاصل ہو رہی تھی، اور وہ اپنا جواز اقتدار کلیسا سے حاصل کر رہا تھا۔ اس بنیاد پر یہ معاشی اشرافیہ کو نظر انداز کر سکتا تھا اور جس طرح کی پالیسی چاہتا، بنا سکتا تھا۔ نتیجتاً ایسے بہت کم قوانین اور پالیسیاں بنائی گئیں جو حقوقِ ملکیت کو تحفظ دیتے، سرمایے کے اجتماع کی حوصلہ افزائی کرتے، عوامی بہبود کی اشیا مہیا کرتے یا ملکی سرمایے کی حمایت کرتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہسپانوی معیشت مزید سے مزید گرتی گئی اور اضافی اور مطلق دونوں مفاہیم میں اپنے یورپی مثنیوں سے بہت پیچھے رہ گئی۔ ایک اوسط ہسپانوی انیسویں صدی میں سولھویں صدی کی نسبت غریب تر تھا۔

www.MashalBooks.org

اچھی خبر یہ ہے کہ تیل پیدا کرنے والے ممالک ہسپانیہ کے انجام سے بچ سکتے ہیں۔ اس کی کُنجی یہ ہوگی کہ معاشی مفادات کے ایک وسیع تر حصے کو سودا بازی کی میز پر لایا جائے۔ نا صرف تیل پیدا کرنے والوں کو، بلکہ، سرمایہ، تجارت، سیاحت، زراعت، صنعت اور دوسری خدمات کے متخصصین کو۔ یہ سعودی عرب جیسے بڑے تیل پیدا کرنے والے ممالک کے لئے جن کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ وہ صنعتی تنوع کو قابلِ عمل بنا سکتے ہیں، اور بھی زیادہ اہم ہے۔ متحدہ عرب امارات نے تیل سے ہٹ کر تنوع پیدا کرنا شروع کر دیا ہے، لیکن تقریباً تمام ''متنوع'' کام غیر ملکیوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے، جو اگر تیل کے محصولات ختم ہو گئے تو واپس چلے جائیں گے۔

میں پُر امید نہیں ہوں کہ بڑی تیل پیدا کرنے والی اقوام اس انجام سے بچ جائیں گی۔ ان کی حکمران انتہائی آمریت پسند ہیں، اور اپنے شہریوں کی آزادی پر بہت زیادہ پابندی لگاتے ہیں، وہ اس طرح کامیابی سے حکومت کر سکتے ہیں۔ کم از کم وقتی طور پر۔ اُسی وجہ سے جس سے سولھویں صدی کے ہسپانوی بادشاہوں نے ایسا کیا: اُن کے پاس دولت کے ''آزاد ذرائع ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مذہبی جواز بخشی'' اقتدار تک رسائی بھی۔ وہ تیل سے مہیا کردہ مختصر مدت کے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی معیشتیں تعمیر کر کے جو طویل مدتی خوشحالی کی اہل ہوں۔ طویل مدتی جمود سے بچ گئے۔ آیا وہ ایسا کرتے ہیں، ابھی دیکھنا باقی ہے لیکن تاریخ ایسی کسی رجائیت کی وجہ کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔

اس مسئلے کی شناخت کرنا، کہ مذہبی اشرافیہ، معاشی اشرافیہ کی نسبت حکمرانی میں زیدہ کردار ادا کرتی ہے، ایک چیز ہے۔ یہ بالکل ایک دوسری چیز ہے کہ کسی معاشرے کے اداروں کو اس حد تک تبدیل کیا جائے کہ حکمرانوں کو یہ ترغیب ملے کہ وہ اپنی حکمرانی کو توسیع دینے کے لئے معاشی اشرافیہ کو مذہبی اشرافیہ سے اوپر لے آئیں، یہ کتاب صرف مسئلے کی تشخیص کرتی ہے، یہ حل پیش نہیں کرتی۔ تاہم یہ ایسے تاریخی اسباق ضرور پیش کرتی ہے جو حل کو شکل دینے میں مدد کر سکیں۔

جمہوریت ہی حکمرانی کے لئے سب سے واضح ہم عصر حل ہے، جو معاشی اشرافیہ کی آواز پر غور کرتی ہے، جبکہ ساتھ ہی ساتھ یہ یقین دہانی بھی کرواتی ہے کہ اُن کی طاقت کو اس حد تک قابو میں رکھا جائے کہ اُن کے محدود مفادات باقیماندہ معاشرے پر فوقیت حاصل نہ کر جائیں۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ کم از کم پچھلی ایک یا دو صدیوں سے، توسیع حکمرانی کے ''اچھے'' انتظامات



عام طور پر جمہورتیوں میں حکمرانی کی توسیع کے ''بُرے'' انتظامات غیر جمہوری حکومتوں میں دیکھے گئے جبکہ ''اچھے'' اور ''بُرے'' کے الفاظ اُن کے معاشی نتائج کے ساتھ وابستگی کے حوالے سے استعمال کئے گئے ہیں۔ بلاشبہ، تمام جمہورتیں ٹھیک کام نہیں کر رہی ہیں، ہندوستان ایک ایسی جمہوریت کی مثال ہے جس میں واضح طور پر ناقص انضباطی اور قانونی نظام ہیں۔ اور معاشی ترقی بلاشبہ غیر جمہوری معاشروں میں بھی واقع ہو سکتی ہے، چین 1978 کی مارکیٹ دوست اصلاحات کے بعد سے، اس کی ایک اہم مثال پیش کرتا ہے۔

لیکن کیا اس کا مطلب محض یہ ہے کہ غیر جمہوری ممالک اپنے اوپر جمہوریت کو لاگو کریں اور اس کے بعد راوی چین ہی چین لکھے گا؟ یقیناً نہیں۔ کوئی بھی شخص کسی ملک پر، بلالحاظ اس کے تناظر کے جمہوریت لاگو نہیں کر سکتا اور اُس کی کامیابی کی توقع نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی بنیادی نکتہ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ وہ نکتہ تھا جس پر 2000 کی دہائی کے آغاز میں، ریاستہائے متحدہ عراق میں توجہ نہ دینے میں ناکام رہا۔ لیکن کسی معاشرے پر جمہوریت کیوں لاگو نہیں کی جا سکتی اور اُس کی کامیابی توقع نہیں کی جا سکتی۔ ایک کامیاب جمہوریت میں تبدیلی کے راستے ہیں کیا مشکلات ہوتی ہیں؟ یہ کتاب اس کا کچھ ادراک پیش کرتی ہے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ باہر سے لاگو کی جانے والی جمہوریت صرف ایک ایسی ریاست میں کام کر سکتی ہے، جیس مین ایسے ادارے ہوں جو اُس حکمرانی کے لئے مددگار ہوں جو جمہوری انتخابات کے ذریعے تقویت حاصل کرے، اگر طاقتور حکمران، حکمرانی کی توسیع کے دوسرے ذرائع پر انحصار کر سکتے ہوں، تو جمہوریت کو آسانی سے کمزور کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی ریاست میں، کوئی بھی مہم جُو بیرونی شخص جسے مذہبی حاکمیت یا فوج کی حمایت حاصل ہو، جمہوری طور پر منتخب رہنماؤں کا تختہ اُلٹنے کے لئے لوگوں کو اُکسا سکتا ہے۔ اور جمہوری طور پر منتخب رہنما بھی اقتدار کو چھوڑنے کو مشکل محسوس کر سکتے ہیں اگر اُن کی دسترس میں ایسے توسیع کارندے ہوں جو انہیں اقتدار میں رکھ سکیں۔ اور کسی بھی چیز کی نسبت یہ وجہ زیادہ اغلب ہے کہ جمہوریت کو کیوں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں اتنے مشکل وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اکانومسٹ (Economist) کے 2014 کے جمہوریت کے اشارے میں جائزہ لئے گئے 167 ممالک میں، علاقے میں سے اونچے درجے میں رکھے جانے والے ملک تھے، تیونس (70 واں)۔ ستم ظریفانہ طور پر عرب بہار کی جائے پیدائش۔ اور ترکی (98 واں)۔ علاقے میں

بہت سے ممالک ''آمرانہ حکومت'' کے زُمرے میں آئیں (یعنی کم ترین جمہوری طرز کی حکومتیں)، مراکش (116واں)، الجزائر (117واں)، لیبیا (119واں) کویت (120واں)، اُردن (121واں)، قطر (136واں)، مصر (138واں)، اومان (139واں) بحرین (147واں)، یمن (149واں)، متحدہ عرب امارات (152واں)، ایران (158واں) سعودی عرب (161واں) اور شام (163واں)۔ ان تمام اقوام میں، بظاہر صرف تین قسم کے ممکنہ توسیع اقتدار کے انتظامات نظر آتے ہیں۔ ظالمانہ تحکمانہ حکومت جس کی توسیع طاقت کے ذریعے کی جاتی ہے (مثلاً شام اور لیبیا) تیل کی رقوم والی بادشاہتیں جن کی توسیع مذہبی انتظامیہ کی طرف سے کی جاتی ہے (مثلاً سعودی عرب، قطر، بحرین) یا دونوں کا کسی طرح کا ملغوبہ۔

یہ بات حیران کن نہیں ہے۔ اسلام حکمرانی کو توسیع دینے میں انتہائی مددگار رہے، اور اسلام اور اسلامی مذہبی حکام کو استعمال کرنے کی لاگت جمہوری انتخابات کو استعمال کرنے سے کہیں کم ہے۔ بلاشبہ بظاہر ایسے لگتا ہے کہ اسلامی دُنیا میں بغیر مذہب کو اپیل کئے، اقتدار کی حمایت کرنے کا واحد طریقہ، ظالمانہ طاقت ہے۔ مثالوں کے لئے، صدام حسین، معمر قذافی اور بشار الاسد کی حکومتوں سے ورے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان توسیعی انتظامات کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ کسی اسلامی ملک پر جمہوریت کو لاگو کرنا ایک احمقانہ اقدام ہوسکتا ہے، کم از کم اکیسویں صدی کے اوائل میں۔

کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام اور جمہوریت ایک دوسرے کے غیر موافق ہیں۔ دُنیا میں سب سے مسلم اکثریت والے ملک۔ انڈونیشیا میں 2004 سے لے کر براہِ راست صدارتی انتخابات ہوتے ہیں۔ یہاں جو نکتہ اٹھایا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سیاسی اسلام، سیاسی عیسائیت کی نسبت زیادہ توانا قوت ہے۔ اسی لحاظ سے، جمہوریت عیسائی اکثریت والے ممالک میں، مسلم اکثریت والے ممالک کی نسبت مختلف انداز سے کام کرتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی حکام کے انتخاب اور حکمرانی کے عمل میں کسی بڑے کردار کے بغیر، جمہوریت کے کام کرنے کا تصور کرنا تقریباً محال ہے۔

اس بات کا اندازہ لگانا اور بھی مشکل ہے کہ، جمہوریت کی طرف تبدیلی کا عمل۔ یا کسی بھی اور طرز حکومت کی طرف، جو معاشی اشرافیہ کو زیادہ اختیارات دینا۔ مشرقِ وسطیٰ میں اُس وقت تک



مقامی طور پر اُبھرنا کس قدر مشکل تھا، جب تک کہ مذہبی اشرافیہ حکمرانی میں ایک اہم کردار ادا نہ کرتی۔ یہ وہ نکتہ ہے جو نوحا فیلڈمین (Noah Feldman) کی باریک بین کتاب اسلامی ریاست کا عروج وزوال (The Fall and Rise of the Islamic State) میں بھی اُٹھایا گیا ہے۔ فیلڈ میں یہ استدلال کرتا ہے کہ اس چیز کی بنیادی وجہ کہ اسلامی دُنیا میں مذہبی جواز بخشی اقتدار تاریخی طور پر کیوں ضروری تھی، یہ تھی کہ یہ حکمرانوں کے آمرانہ رُجحانات پر روک لگاتی تھی۔ جب مغربی طرز ہائے حکمرانی کی نقالی کرنے کو ہدف بنانے والی، اُنیسویں صدی کی ناکام عثمانی اصلاحات کے ایک سلسلے نے ''روایتی'' اسلامی ریاست کو کمزور کر دیا، تو مذہبی انتظامیہ کی طرف سے مہیا کی گئی رُکاوٹ اس کے ساتھ ہی ختم ہوگئی، فیلڈمین کے مطابق یہ وجہ ہے کہ بیسویں صدی میں، شمالی افریقہ اور لیوانٹ میں سابقہ عثمانی ممالک میں، آمریت ایک معمول بن گیا تھا۔ فیلڈ مین آگے چل کر یہ استدلال کرتا ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی خراب حکمرانی کا ایک ممکنہ حل جمہوری طور پر منتخب اسلامی جماعتیں ہیں۔ یہ ادراکات اس کتاب کے دلائل سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثالی حالات میں، اسلامی جماعتیں، مذہبی انتظامیہ کو اپنے ساتھ شامل کرسکتی ہیں، جبکہ وہ مستقبل کے انتخابات جیتنے کے لئے معاشی اشرافیہ کو بھی سودا بازی کی میز پر لانے کی ضرورت محسوس کرسکتی ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنے آپ کو مذہبی انتہا پسندی سے علیحدہ کرسکتی ہیں۔

2016 سے، ایسا امکان پیدا نہیں ہوا، اور بلا حیرت، جمہوریت مشرقِ وسطیٰ میں نہیں پھلی پھولی۔ جمہوریت کے اس فقدان کا ایک سبب اور نتیجہ یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے زیادہ تر حکمران اُس سے کہیں زیادہ کمزور ہیں جتنے وہ تاریخی طور پر تھے۔ ہوسکتا ہے بظاہر ایسا نظر نہ آتا ہو، کیونکہ بیسویں صدی کے اواخر کے بہت سے حکمرانوں نے ایک آہنی ہاتھ کے ساتھ حکومت کی ہے۔ لیکن، جیسا کہ عرب بہار سے انکشاف ہوا ہے، کہ وہ آمر حکمران جو بنیادی طور پر فوجی توسیع اقتدار پر بھروسہ کرتے ہیں بغاوت کی زد میں ہوتے ہیں۔ اور تیل کی ریاستوں، کے حکمران تیل کی قیمتوں میں انحطاط کی زد میں ہیں۔ اس مقابلتہً کمزوری کا ایک نتیجہ اور ابواب 5 اور 6 میں پیش کئے گئے موضوعات میں سے ایک موضوع یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کے حکمران اکثر آزادیوں پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ خاص طور پر انٹرنیٹ پر معلومات تک رسائی پر۔ تاکہ اقتدار کو اپنے طاقتور حریفوں کی پہنچ سے باہر رکھیں۔ اُن ابواب نے یہ استدلال پیش کیا کہ معلومات پر اجارہ داری

www.MashalBooks.org

قائم کرنے کی کوشش جدید دور کے اوائل میں مشرق وسطیٰ میں اس وجہ سے کامیاب ہوئیں کیونکہ یہ حکمرانوں اور اُن کے توسیعی کارندوں کے مفاد میں تھا کہ معلومات کے پھیلاؤ پر پابندی ہو۔ اگر ٹیکنولوجی مخالف محرکات پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں موجود تھے، تو وہ اکیسویں صدی میں اُس سے بھی زیادہ نمایاں طریقے سے موجود ہیں، جہاں معلوماتی ٹیکنولوجی باغیانہ خیالات کو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پھیلنے کو ممکن بناتے ہیں۔

بلاشبہ، اسلامی دُنیا انٹرنیٹ کی سینسر شپ میں سب سے آگے رہی ہے۔ اگرچہ سنسر شپ بلاشبہ غیر مسلم، آمرانہ حکومتوں میں بھی موجود ہے (مثلاً چین اور شمالی کوریا میں) لیکن مسلم اکثریتی ممالک کی حکومتوں میں تو یہ خاص طور پر اس کا چلن ہے۔ 2015 تک ایران، شام، افغانستان، پاکستان، ترکمانستان، تاجکستان، لیبیا، بنگلہ دیش اور سوڈان کی حکومتوں نے یوٹیوب کو بند کر دیا۔ فیس بک ایران، سعودی عرب، ترکمانستان، اُزبکستان اور شام میں شدید طور پر سنسر کی جاتی ہے۔ ترکی میں ایردوگان کی حکومت نے ٹویٹر اور یوٹیوب پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ ان پابندیوں کی وجہ تمام صورتوں میں ایک جیسی ہے۔ حکمران سوشل میڈیا پر بالکل کنٹرول نہیں کر سکتے اور اُن کے اقتدار کو درپیش خطرات ان کے کنٹرول سے باہر ہو کر پھیل سکتے ہیں۔ عرب بہار اس بات کی بہت مضبوط مثال ہے کہ جب سنسر شپ کمزور ہو جائے تو کیا کچھ واقع ہو سکتا ہے وہ چیز جو محمد بوعزیزی۔ جو کہ ایک تیونسی گلیوں میں پھیری والا تھا، جو حکومت کی طرف سے اُس کی اشیا کی ضبطی سے تنگ آیا ہوا تھا، کی خودسوزی سے شروع ہوئی، پورے مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔

اگرچہ عرب بہار ہر اُس جگہ پر کامیاب نہ ہوئی جہاں جہاں یہ پھیلی۔ بحرین کی حکومت نے اسے دبا دیا، اس نے شام میں ایک وحشیانہ خانہ جنگی کو اُس نے مصر اور لیبیا میں طاقت کا خلا پیدا کر دیا۔ لیکن، سوشل میڈیا کی معلومات کو فوری طور پر پھیلانے کی طاقت کی وجہ سے اس کا اثر بہت بڑے حصے میں پھیل گیا۔ سوشل میڈیا شہریوں کو احتجاجوں میں ربط پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے، اور زیادہ اہم طور پر حکومتوں کے بالمقابل ایک دوسرے کی ترجیحات کے بارے میں معلومات میں ربط پیدا کرتا ہے۔ موخرالذکر قسم کی معلومات آمرانہ حکومتوں کو سب سے زیادہ خوفزدہ کرتی ہیں۔ اسلامی تاریخ کے بہت سے حصے ہیں، ہر قسم کے مسائل پر رائے میں ربط پیا



کرنے کی طاقت، عمومی طور پر مذہبی حکام کے دائرۂ اختیار میں تھی۔ یہی چیز تھی جو انہیں اس قدر طاقتور بناتی تھی، اور یہی چیز اُن اسباب میں سے ایک سبب تھی کہ حکمران انہیں سودا بازی کی میز پر لانے کے لئے کیوں اتنے بے تاب ہوتے تھے۔

کیا سوشل میڈیا اکیسویں صدی میں اسلامی دُنیا میں مذہبی حاکمیت کو اُسی طرح جڑ سے اُکھاڑ سکتا ہے، جس طرح چھاپہ خانے نے سولھویں صدی میں مغربی یورپ کے بہت بڑے حصے میں کلیسا کو جڑ سے اُکھاڑ دیا تھا؟ مشرق وسطیٰ میں رُکاوٹیں اُس سے زیادہ ہیں جتنی مغربی یورپ میں تھیں۔ لیکن اکیسویں صدی کی معلومات کی تیکنولوجی بھی اُس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے جتنی یہ سولھویں صدی میں تھی۔ تحریک اصلاحِ کلیسا کو پھیلنے میں کئی دہائیاں لگیں، اور اس سے کہیں زیادہ عرصہ توسیعی انتظامات کو بنیادی طور پر جڑ سے اُکھاڑنے میں لگا۔ اگر اکیسویں صدی کی معلوماتی ٹیکنولوجی، اسلامی دُنیا میں ویسا ہی اثر پیدا کرنے جا رہی ہے، تو اس بات کی توقع کرنا معقول ہے کہ یہ معاشرے کو بہت جلدی سے تبدیل کر دے گی۔ یہ بلاشبہ ایک بڑا ''اگر'' ہے۔ بہت سے طاقتور گروہوں، بشمول مذہبی حکام، کا مفاد جوں کی توں صورتِ حال کو برقرار رکھنے میں ہے۔ خواہ انقلابات جوں کی توں صورتِ حال کو توسیع دینے والے دستور کو ختم بھی کر دیں۔ تو بھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ طاقت کے خلا کو کون پُر کرے گا۔ مصری اور عراقی تجربات اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کچھ انتہا پسند اسلامی گروپ اس طاقت کی جنگ میں ایک اہم کردار ادا کریں گے۔ بہرحال، اُس طریقے میں ایک بنیادی تبدیلی، جس میں حکمران اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے ہیں۔ معلوماتی ٹیکنولوجی سے مہمیز حاصل کرتے ہوئے۔ مشرق وسطیٰ میں اُن اداروں کے ظہور کی ایک بنیادی اُمید لگتی ہے، جہاں معاشی اشرافیہ توسیع اقتدار میں کچھ کردار ادا کر سکے۔ آیا ایسا واقع ہوتا ہے یا نہیں، اکیسویں صدی میں مشرقِ وسطیٰ کے معاشی مقدر کے اہم ترین تعین کاروں میں سے ایک ہے۔

☆☆☆

www.KitaboSunnat.com

# اختتامی خیالات

اسلام کے بارے میں فی نفسہٖ ایسی کوئی چیز نہیں ہے جو مشرقِ وسطیٰ کے معاشی مود پر منتج ہوئی ہو، سوائے سیاسی اقتدار کو جواز بخشنے کی اس کی معاونت کے۔ اس کی وضاحت کر دی جائے کہ سیاسی حکمرانوں کی طرف سے اسلام کا یہ جائز استعمال، اس کے اُس ناجائز استعمال سے مختلف ہے، جو القاعدہ، طالبان، یا اسلامی ریاست کے اندر جہادیوں کے پُرتشدد اقدامات کا جواز پیش کرنے کے لئے کیا جائے۔ اسلام بھی غلط تعبیر اور غلط استعمال کے لئے اتنا ہی کھلا ہے، جتنا کہ اس کی ابراہیمی براوری، عیسائیت اور یہودیت۔ اسلام اس کے غلط طور پر مردم بیزار استعمال کیسے، خود نفس مذہب سے زیادہ قابلِ الزام نہیں ہے۔ طاقت کی چھینا جھپٹی کو جواز بخشنے کے لئے ہمیشہ کسی نہ قسم کا نظریہ دستیاب ہوتا ہے۔ دُنیا کے کچھ حصوں میں یہ اسلام ہے۔ بعض دوسرے حصوں میں کوئی اور مذہب یا سیکولر نظریہ ہے۔

بہت سارے اہلِ مغرب، جب اسلام کو دہشت گردی یا مغربیت کی مخالفت کے ساتھ مربوط کرتے ہیں، تو وہ باہمی تعلق کو سبب کے ساتھ گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔ اُن لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام منفرد طور پر کوئی پُرتشدد نظریہ پیش کرتا ہے، صرف عہد نامہ عتیق پڑھنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ان دعووں کی غلطی کو محسوس کر سکیں۔ خیال کا ایک سادہ سا تجربہ اس غلط فہمی کی مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ ایک ایسی دُنیا کا تصور کیجئے۔ فرض کریں ایک تصوراتی تیئیسویں صدی کا جس میں مشرق وسطیٰ دُنیا کی فوجی اور معاشی طاقت کا مرکز ہے، مشرقِ وسطیٰ کی حکومتیں مسلسل یورپی اور امریکی سیاست میں مداخلت کر رہی ہیں، جبکہ مشرق وسطیٰ کی فوجیں پورے مغرب میں ہر جگہ موجود ہیں۔ مغرب میں غربت عام ہے اور آمرانہ حکومتیں معمول کی بات ہے۔ کیا ''مشرق وسطیٰ کے شیطان'' پر مغربی جذبات کے مرتکز ہونے کا تصور کرنا کیا واقعی بہت مشکل ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح بیسویں اور اکیسویں صدیوں میں مشرق وسطیٰ کے جذبات کے



''امریکی شیطان'' پر توجہ مرکوز ہونے کا تصور ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ واقعی مشکل ہے۔ آخر کار، یہ تصوراتی دُنیا، اُس دُنیا سے بہت مختلف نہیں ہے جس کا سامنا یورپیوں کو صلیبی جنگوں کے دور کے آس پاس تھا، اگرچہ یہ گیارھویں صدی کی ٹیکنولوجی کے ساتھ تھا اور یورپیوں اور مشرقِ وسطیٰ کی ریاستوں کے درمیان براہِ راست تصادم نہیں تھا۔

اسلام کے اندر فی نفسہٖ کوئی چیز مغرب مخالف، جمہوریت مخالف یا معاشی ترقی مخالف نہیں ہے۔ مشرقِ وسطیٰ میں مغرب مخالف جذبات بنیادی طور پر سامراجی پالیسیوں، نوآبادیات سازی، ظالم آمروں کی مغربی حمایت، خونی یک طرفہ کشاکشوں، اور مغرب کی طرف سے وسائل کے استحصال کا نتیجہ ہیں، نہ کہ اسلام کا۔ اسلام ایسے جذبات کے لئے ایک عمدہ اور سادہ لبادہ ضرور مہیا کرتا ہے، لیکن اس کا ذریعہ نہیں۔ اس کی بجائے ان جذبات کے سرچشمے ان عوامل میں ہیں، جنہوں نے پہلے پہل مغرب کے اُبھرنے کی گنجائش پیدا کی۔ اس کتاب کا مقصد ان عوامل پر کچھ روشنی ڈالنا رہا ہے۔ اس عمل میں، اس نے اُمید افزا طور پر، ہماری اس فہم میں اضافہ کیا ہے کہ کونسے عوامل حقیقتاً معاشی جمود کے لئے اور سیاسی عدم استحکام کے لئے اہم ہیں، اور کونسے عوامل جمود اور عدم استحکام کی محض علامات ہیں۔

مشرقِ وسطیٰ اور وسیع طور پر اسلامی دُنیا کے مستقبل کے لئے ایک محتاط رجائیت کی گنجائش ہے، اور یہ رجائیت معاشی سرگرمی کے ساتھ قریبی ربط رکھتی ہے۔ جہاں مسلمانوں کے اندر بہت اعلیٰ معیار ہائے زیست کا، جدید معیشت کے ساتھ منسلک ذوق ہے، وہاں حکمرانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مضبوط معاشی انتظام توسیع اقتدار کا ایک طاقتور ذریعہ ہے، اور شہری ان کی مذہبی توثیقات کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ عالمی معیشت کے ساتھ مکمل انضمام آسان نہیں ہوگا اور بہت سے مضبوط مخصوص مفادات سودا بازی کی میز پر اپنی نشست کھونے کے خطرے سے دوچار ہو جاتے ہیں لیکن انضمام مشرقِ وسطیٰ کو ایک ''دائرہ خیر'' میں اچھالنے کے لئے، اب بھی ایک بہترین اُمید کے طور پر موجود ہے، جس میں حکمران اپنی حکمرانی کو توسیع دیتے ہیں، جو مزید خوشحالی کو جنم دیتا ہے اور علیٰ ہذا القیاس۔ اس کا مطلب ہے، تیل، اسلحہ اور مزید کچھ اشیاء کی تجارت کرنے سے کافی آگے انضمام۔ اس کا مطلب ہے مذہبی اشرافیہ کے سیاست میں کردار میں کمی، لیکن آمرانہ حکومت کے حق میں دستبردار ہونے کی قیمت پر نہیں۔ غالباً اس کا مطلب ہے جمہوریت یا کم از کم اُس کی کوئی دوغلی شکل۔ اہم ترین بات یہ کہ اس کا مطلب ہے معاشی

www.MashalBooks.org

اشرافیہ کے لئے کچھ سیاسی طاقت۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ آیا مشرق وسطیٰ کی اقوام اکیسویں صدی میں یہ راستہ اختیار کریں گی، بہت زیادہ نامعلوم مستقبل کے واقعات راستے کو کسی بھی سمت میں موڑ سکتے ہیں، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ تیل کی قیمت ہی اس راستے کی مشکل متعین کرنے میں کوئی کردار ادا کرے۔ تاریخ ہمیں قنوطیت اور رجائیت، دونوں کے لئے ایک وجہ مہیا کرتی ے۔ وقت بتائے گا کہ کونسا جذبہ ٹھیک ہے۔



# حواشی

## 1- تعارف

1 I use the term "Middle East" somewhat broadly throughout this book, comprising North Africa, the entire Arab world, Iran, Turkey, and Islamized Spain under Umayyad rule. Essentially, I use the term to represent the Islamic world west of South Asia. I apologize if this broad use of the term offends, but repeatedly using the term "Islamic world west of South Asia" would be an incredible nuisance, both for you and for me.

2 See Lewis (2002).

3 For more on the connection between urbanization and economic development, see de Vries (1984), Bairoch et al. (1988), and Bosker et al. (2013). Numerous works of economic history have employed city size as a proxy for premodern economic development; a few of these works include de Long and Shleifer (1993), Acemoglu, Johnson, and Robinson (2005), Dittmar (2011), and Cantoni (2015).

4 In 800, there are twenty-two cities, because four cities tie for nineteenth place on the list. I am extremely grateful to Maarten Bosker, Eltjo Buringh, and Jan Luiten van Zanden for sharing their data from their 2013 paper with me. These data were used to create the maps in Figures 1.1-1.4.

5 For more on these data, see Pamuk (2011).

6 Wages were comparable in Istanbul with parts of southern and central Europe. For more on European wage data, see Allen (2001). For more on Ottoman wage data, see Özmucur and Pamuk (2002).

7 For more on European and Asian wage data, see Allen et al. (2011). These wage data are broadly consistent with Angus Maddison's GDP data, updated in Bolt and van Zanden (2014). Allen et al. (2011) provide evidence, consistent with Maddison's evidence that real incomes of Chinese workers were well behind those of workers in northwest Europe in the eighteenth century.

8 Examples of these views are found in Weber (1922), Cromer (1908), von Grunebaum (1966), and Lewis (1982, 2002). For an overview of this literature, see Kuran (1997, pp. 49-53). For a classic criticism of this approach, see Said (1978).

9 This certainly does not mean that all economic arguments that depend on cultural explanations are wrong. Greif (1994a), Guiso, Sapienza, and Zingales (2006, 2009), and Tabellini (2010) are among a small set of good economic works that take culture seriously. Alston et al. (2016) provide an insightful example from Brazil in the late twentieth and early twenty-first centuries of how culture is endogenous to beliefs and institutions. Alesina and Giuliano (2015) provide a nice review of this literature.

10 Numerous scholars have challenged Weber's thesis since it was first proposed. The most damning criticism is that the "capitalist spirit" predated the Reformation - the Italian city-states of the late medieval period were highly capitalist, yet they did not spark modern economic growth. On this point, see in particular Sombart (1967 [1913]) and Tawney (1926 [1954]). For a more general overview of the literature from the last century on Weber's hypothesis, see Iannaccone (1998), Delacroix and Nielsen (2001), and Iyer (2016).

11 This book adds to works such as those of Robert Allen (2009), who argues that relatively high wages in London encouraged more investment in capital-saving technologies than in the rest of the world, and these technologies were at the heart of the Industrial Revolution. Allen's hypothesis is convincing on many fronts, although it is less strong on the reasons for high wages in London in the first place. An institutional story consistent with the one presented in this book may help set the stage where Allen's story begins.

12 van Zanden (2009, pp. 59-60) has a nice discussion of some alternative arguments for the presence of relatively weak family ties in medieval Europe.

13 Also see Greif, Iyigun, and Sasson (2012) and Greif and Iyigun (2013) for how differences in family structures encouraged different institutional responses for risk-sharing in England and

www.UrduBooks.org

China, and see Greif and Tabellini (2015) for how these differences affected inter- and intragroup cooperation in Europe and China.

14 This is not to say that Kuran ignores the supply side or that I ignore the demand side. Both sides enter into both of our arguments. I simply place more weight on the supply side, and Kuran places more weight on the demand side.

15 This theory gives a historical twist to endogenous growth theory - formulated by Paul Romer (1986) and Robert Lucas (1988) and extended by Oded Galor (2011) - which places human capital at the center of perpetual economic growth. Galor is the leader in the "unified growth theory" field, which argues in favor of the importance of prehistorical forces such as geography and endowments. Galor suggests that these forces affected demographic transitions, the evolution of technology, and the acquisition of human capital in ways that explain modern day development. Unlike the geography hypotheses explored in this section, unified growth theory can account for reversals of fortune, although it has a very hard time accounting for the timing of the reversals of fortune.

16 Besley and Persson (2009, 2010) and Acemoglu (2005) extend this argument, noting that investments in fiscal capacity arise endogenously because of common interests in the provision of public goods. Gennaioli and Voth (2015) take this argument one step further, noting that once fiscal and state capacity becomes important for war-making, a divergence arises between internally cohesive states and those without cohesion, with the latter set of states dropping out of existence. Bates (2001) takes a slightly different interpretation of the "war made the state" argument, suggesting that since European states invested in war, they could ultimately use their increased capacity to coerce for economically beneficial activities, such as the protection of property rights and the termination of feuds. Other important works in this literature, especially those of Dincecco (2009, 2011), stress the role that representative institutions played in generating fiscal capacity through increased taxation and lower sovereign credit risk. Also see Karaman and Pamuk (2013), who argue that the connection between representative institutions, war, and fiscal capacity is dependent on the economic structure of the regime. They suggest that the interests of representative assemblies align with the ruler with respect to war in urban settings, where the ruler and elites jointly govern, but not in rural settings, where local control over coercive power dominates.

17 These insights have spurred a large literature. For instance, Irigoin and Grafe (2013) argue that fiscal capacity is a function of coercive power and it follows an inverted-U shape; initial investments in coercion pay off well, but eventually diminishing returns kick in. If coercion is too great, the legitimacy of the ruler may be undermined. Dincecco, Fenske, and Onorato (2016) argue that the type of conflict matters for long-run fiscal capacity, as they find no correlation between historical warfare and per capita GDP in sub-Saharan Africa. Johnson and Koyama (2014) and Anderson, Johnson, and Koyama (2016) argue in a series of papers for an important - although nonobvious - effect of increased legal and fiscal capacity: it reduced persecution (of witches, minority religions, and so forth) in Europe in the early modern period.

18 One hypothesis in this literature that deserves special attention, because it focuses on the Western Europe-Middle East comparison, is Blaydes and Chaney (2013). They argue that European feudalism arose because of the weak fiscal capacity of rulers following the fall of the Roman Empire, and in this system economic elites were able to negotiate with rulers through parliaments. They also argue that such negotiating organizations never emerged in the Middle East because rulers relied on slave armies to extend their power and collect taxes and therefore did not need to negotiate with the elite. Both Blaydes and Chaney and I argue that the lack of constraint by the elite on Middle Eastern rulers relative to their European counterparts was a crucial piece of the long-run economic divergence between Western Europe and the Middle East, but we differ on the reasons why the elite did not constrain Middle Eastern rulers. For example, it is not completely clear within the Blaydes and Chaney framework why the Ottoman military elites in the provinces, who maintained relations with the central government under the timar system, could not have come together in a manner similar to European parliaments to constrain the sultan. My explanation is that European kings needed to negotiate with the elite to a greater degree than Ottoman sultans did because their position was weaker due to their weaker legitimacy. At the same time, my explanation does not address exactly why parliaments arose in Western Europe in the first place in the manner that they did, except to say that rulers were in a weaker position vis-à-vis the elite because of weaker legitimacy. Blaydes and Chaney shed light on this point, noting that parliaments arose after a long tradition of feudal relations slowly evolved into semi-organized bodies throughout Western Europe.

19 For more on this argument, also see Hoffman (2011, 2012). For a comprehensive account of the role that military might had on world economic history, see Findlay and O'Rourke (2007).

20 Numerous reasons have been given for the relative fractionalization of Europe, including the presence of outside threats (Alesina and Spolaore 2005; Ko, Koyama, and Sng 2016), trade patterns (Friedman 1977; Alesina and Spolaore 1997), and geography (Diamond 1997). Others



have noted that the presence of numerous independent city states helped foster the rise of a merchant class (Pirenne 1925; Jones 1981; Stasavage [2014] takes an alternative view, arguing that independent cities initially had higher growth rates but ultimately failed, possibly due to the stifling of trade by guilds), and that fractionalization encouraged technological discovery (Lagerlöf 2014).

21 In fairness to Jones and Mokyr, they are hesitant to make a causal claim connecting conservatism to bad outcomes. Goldstone (2000) presents an alternative take on Mokyr's argument, suggesting that the key technological advances - along with the acceptance of Newtonian science and the Glorious Revolution settlement - were "accidents" of history and are not explainable causally. While the present book acknowledges the importance of individual events and in no way suggests that history is deterministic, it argues that institutional environments make certain outcomes, including the important ones Goldstone studies, more likely to arise in certain places at certain times.

22 Cross-country regressions do suggest a possible connection between religion, especially Islam, and economic development. See Grier (1997), Barro and McCleary (2003), and Guiso, Sapienza, and Zingales (2003). For a different view, see Noland (2005). Yet, it is far from clear that these works are picking up anything more than a correlation - causation is a very different story. There are certainly aspects of religious belief that affect economic performance, however. In particular, religion may incentivize (or disincentivize) one to attain education (see, e.g., Berman 2000, Becker and Wößmann 2008, 2009; Botticini and Eckstein 2012; Chaudhary and Rubin 2011, 2016; Meyersson 2013). Such incentives have clearly played an important role in long-run economic outcomes, although they cannot account on their own for the "reversal of fortunes," the long-run rise of Europe, and intra-European differences. They are important contributing influences nonetheless.

23 Gregory Clark lists eighty reviews of his book on his website, a very large number for an academic book.

24 Some of Clark's comparisons rest on data from the revisionist literature spearheaded by Pomeranz (2000), who argues that China and Europe were economic equals as late as the eighteenth century. Allen et al. (2011) provide evidence that this was not the case, especially in the comparison between northwestern Europe and China.

25 Blaming Sykes-Picot is a common trope in the popular press, who reinvigorated the thesis when Islamic State declared the goal of creating a new map in the Middle East. For a sample of articles on this topic, see Osman (2013), Sazak (2014), Ignatius (2014), and Howorth (2014). Danforth (2013) presents this argument with a twist, suggesting that the "divide-and-rule" policies of the British and French are responsible for persistent violence. Academic contributions to the debate generally focus on the trade capitulations the Ottoman government gave to the European powers. For instance, see Ahmad (2000).

26 Of course, geography may affect the types of institutions a society has. For example, Michalopoulos, Naghavi, and Prarolo (2015) argue that numerous features of the Islamic economic system stem from the agricultural endowments and pre-Islamic trade routes of the Muslim world. Rodrik, Subramanian, and Trebbi (2004) test the role of geography versus the role of institutions and economic openness and find that institutions can account for most of the difference in worldwide economic outcomes. Kenneth Pomeranz (2000) also makes an argument in The Great Divergence that places importance on geography. Pomeranz is primarily concerned with the divergence between Europe and China. He makes the "revisionist" argument that Europe and China were on relatively equal economic footing in the eighteenth century, and that fortuitous circumstances allowed Europe to pull ahead (e.g., access to coal, discovery of the New World). There is convincing evidence suggesting that the timing of the divergence is not as Pomeranz suggests (see Allen et al. 2011), and Pomeranz's theory has difficulty explaining intra-European differences.

# حصہ اوّل

## حکمرانی کی توسیع: معاشی کامیابی اور جمود کا ایک نظریہ

### 2- حکمرانی کی توسیع

1 An example that has received significant attention from economists is the degree to which the law protects corporate investors from expropriation by corporate insiders. Such protections are important because they encourage investment. La Porta et al. (1997, 1998) show that these protections are more prevalent in countries with a legal tradition based in common law than in

civil law-based countries, and consequently financial development is much greater in common law countries. The legal origins literature has provided many nice insights (see, most prominently, La Porta et al. 1999, Glaeser and Shleifer 2002, Djankov et al. 2002, 2003, Glaeser et al. 2004, and La Porta et al. 2008). That literature seeks the specific effects of the transplantation of different strains of common and civil law. This is not the point of the present chapter, which seeks to understand how the content of specific laws emerges and persists.
2 See van Bavel et al. (2015).
3 Wintrobe (1998) provides a comprehensive overview of the constraints facing dictators and how these constraints affect the manner in which the dictator rules.
4 This definition of elite is similar to the one proposed in Wallis and North (2014).
5 My definition is similar to the definition of legitimacy proposed by Seymour Martin Lipset (1959, p. 86), who defined legitimacy as "the capacity of a political system to engender and maintain the belief that existing political institutions are the most appropriate or proper ones for the society." The definition proposed in this book is also similar to those suggested by Greif (2010) and Greif and Tadelis (2010), who define legitimacy of a political authority as "the extent to which people feel morally obliged to follow the authority." A more expansive definition would include beliefs about the beliefs of others. That is, people may view a rule-maker as legitimate if they believe that others believe the rule-maker has the right to make the rules. Since this aspect of legitimacy is not the focus of this book, I do not include it here.
6 This motivation of course does not fit all types of rulers. For example, Ronald Wintrobe (1998) analyzes "tinpot" rulers, like many dictators of sub-Saharan Africa, who aim to minimize the cost of staying in power so they can pocket excess rents produced by society. Yet, most goals that one might ascribe to a ruler - even growing wealthy - are not possible if the ruler is not in power. Similar points are made in Gill (1998, ch. 3; 2008, ch. 2).
7 This idea is similar to Wintrobe's (1998) insights on dictators, who maintain their rule by investing in repression and loyalty.
8 For an extended discussion on the concept of legitimizing agents, see Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a, 2012b) and Greif and Rubin (2015).
9 For a nice rational choice analysis of how and why religious authorities legitimize political rule, see Gill (1998, especially ch. 1, 3; 2008, ch. 2).
10 These examples and many more are in Masud et al. (1996).
11 Chaney is quoting Robert Irwin's 1986 book The Middle East in the Middle Ages (p. 50).
12 For more on the economic effects of the "Pax Mongolia", see Needham (1954) and Findlay and O'Rourke (2007). For more on the use of violence to promote economic good in general, see Bates (2001).
13 Avner Greif (2006b, p. 30) also proposes a definition of institutions favored in this book: "[institutions are] … a system of rules, beliefs, norms, and organizations, that together generate a regularity of (social) behavior … Each component of this system is social in being a man-made, nonphysical factor that is exogenous to each individual whose behavior it influences." Other important works discussing the nature and consequences of institutions include Greif (1993), North (1981), North, Wallis, and Weingast (2009), Williamson (1985, 2000), Ostrom (1990, 2005), Aoki (2001), Acemoglu, Johnson, and Robinson (2001, 2002, 2005), Acemoglu and Robinson (2006, 2012), David (1994), and Helpman (2004, ch. 7).
14 This idea is consistent with Greif's (2006b) insight that institutions can only persist when they are self-enforcing. Greif considers an institution to be self-enforcing if everyone who is affected by the institution has incentive to act in the manner the institution supports.
15 The intuition laid out in this section largely comes from Rubin (2011). It also incorporates insights from Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a, 2012b).
16 For more, see Gill (1998, ch. 3; 2008). Also see Co?gel and Miceli (2009), who argue that the trade-off between legitimacy concerns and the amount of religious goods provided by the religious establishment affects the relationship between church and state.
17 For more on this point, see Stark and Bainbridge (1985, ch. 22).
18 Another straightforward example of how institutionalized rules establish costs for propagating rule is how rulers recruited military elite in medieval Europe and the Middle East. Blaydes and Chaney (2013) argue that feudal institutions were the basis for military recruitment in medieval Europe, meaning that rulers had to concede numerous rights to feudal lords in return for military service. In the Middle East, Muslim sultans relied on slave armies for military service, meaning that local elites had relatively little bargaining power with the sultan, and thus their support was less expensive than their European counterparts.
19 Greif (2006b) calls such an institution self-reinforcing. His important insights provide the subtext for the ones elaborated in this chapter, but I attempt to confine as much jargon as possible to the footnotes.
20 For much more on this argument, see Kuran (1995).



21 Gill (1998, 53) makes a similar point: "[P]riests who consistently make poor political endorsements will discover that their followers will question not only their political judgment, but the spiritual guidance they offer as well." For more on this point, see Rodinson (1973), Noonan (1993, 2005), Ekelund et al. (1996), and Hallaq (2001).
22 Paul David (1985, p. 332) eloquently defined a path-dependent sequence of events as those in which "important influences upon the eventual outcome [are] exerted by temporally remote events, including happenings dominated by chance elements rather than systematic forces." His example of the QWERTY keyboard layout as a path dependent process is a classic example, even if it is with its detractors.

## 3- حکمرانی کی توسیع کی تاریخی بنیادیں

1 See Hallaq (2005, ch. 1).
2 This insight has a long tradition nicely overviewed in Ensminger (1997). Also see Udovitch (1970), Rodinson (1973), and Lewis (1993). Jha (2013) carries this argument one step further, noting how trade fostered interethnic and interreligious cooperation in South Asia, which fostered the creation of institutions that bolstered interethnic trust in the twentieth century.
3 See Lopez (1971).
4 See Michalopoulos, Naghavi, and Prarolo (2015).
5 For an in-depth account on this point, see Watson (1983). For a brief overview of trade in Islamic history, see Rubin (2012).
6 Quoted in Lewis (1995, p. 149). For more on the intersection of the religious and the legal in early Islam, see Lewis (1974, 1995, 2002), Hassan (1981), and Hallaq (2005). Razi (1990) argues that this intersection is in part responsible for the outsized importance of Islam in legitimating political rule in the present day. Platteau (2011) argues that Islamic political authorities were easily able to bring the religious establishment under their aegis from an early time, and only used Islam to legitimize their rule when there was a vacuum of centralized power. This argument is consistent with the one proposed in this book, although this book places a greater emphasis on the constraints that religious authorities were able to place on the actions of political authorities.
7 These insights, along with the associated Qur'anic verses, are from the website www.freeminds.org. All Qur'an quotes are from www.quran.com.
8 These passages are from www.sahih-bukhari.com.
9 For more on these points, see Goodenough (1931, pp. 37, 54), Jones (1964, p. 96), Gager (1975, pp. 94, 96) and Goody (1983, pp. 92-93). Stark (1996) argues that the poor were underrepresented, in proportion to the Roman population, in early Christianity. Even if this is true, most Christians were from the poorer to middling classes.
10 For an extensive overview of the early separation of church and state in Christianity, see Mann (1986, ch. 10), Tierney (1988), and Feldman (1997).
11 Quoted in Johnson (1976, p. 70).
12 For more on this point, see Hyma (1938, p. 14) and Feldman (1997, pp. 25-27). Gelasius I is quoted in Tierney (1988, p. 13).
13 It is possible that Constantine's acceptance of Christianity was a political expedient aimed at gaining Christian support in the midst of civil wars fought with Maximinus II and Licinius over who would rule the empire. But Constantine's embrace of Christianity cannot have been solely to legitimize his regime. Although the Christian population was growing rapidly in the late third and early fourth centuries, Christians still only made up around 10% of the Roman population around the time of the Edict of Milan. For more on Constantine's conversion to Christianity, see Jones (1949, ch. 6; 1964), Downey (1969, p. 21), and Stark (1996, ch. 1).
14 These numbers are from Stark (1996, p. 7). For more on this momentous period in Christian history, see Goodenough (1931, p. 53), Jones (1964, p. 96), Coleman-Norton (1966, pp. 85-86), Downey (1969, p. 34), Johnson (1976, p. 79), Goody (1983, p. 93), and Cameron (1993, pp. 71-72).
15 See Co?gel, Miceli, and Ahmed (2009).
16 See Crone and Hinds (1986, p. 1).
17 See Crone and Hinds (1986).
18 For more on this point, see Crone and Hinds (1986, chs. 4, 5).
19 For much more on the evolution of proto-kadis, see Hallaq (2005, ch. 2).
20 Hallaq (2005) notes that the Sunna was not complete in this period and there were actually multiple Sunna, including those of the first caliphs. Recognition of the Sunna of the Prophet as a source of law came later.

21 For much more on the early history of Sunna and hadith, see Hallaq (2005, ch. 5).
22 For more on the growth of the legal class in the first few Islamic centuries, see Masud et al. (1996), Berkey (2003), Hallaq (2005), and Co?gel, Miceli, and Ahmed (2009).
23 Quoted in Hallaq (2005, p. 184).
24 See Hallaq (2005, ch. 8).
25 See Hallaq (2005, ch. 8).
26 See Hallaq (2005, ch. 8).
27 See Hallaq (2005, p. 191).
28 For more on fatwas legitimizing actions by rulers or keeping their actions consistent with Islam, see Masud et al. (1996) and Fierro (1996).
29 For more, see Watt (1988, p. 28).
30 For more on the formation of the schools, see Hallaq (2005, ch. 7).
31 For more, see Schacht (1964, ch. 10), Coulson (1969), Weiss (1978), and Hallaq (2001, ch. 4).
32 Haim Gerber (1999, chs. 4-7) studied rulings by the important seventeenth-century Palestinian mufti Khayr al-Din al-Ramli in which numerous disagreements that remained unresolved in the classical and postclassical periods arose, necessitating an act of ijtihad. Wael Hallaq (1984, 2001) also notes numerous historical examples of ijtihad, suggesting that the "gate" never closed in theory or in practice. However, even if the "gate of ijtihad" were open, Hallaq's studies suggest that jurists indeed practiced ijtihad less frequently after the tenth century.
33 Chaney (2016) provides a complementary theory to the one proposed here. He argues that the rise and decline of Muslim science resulted from the incentives faced by the religious establishment. When the majority of the populations conquered by Islamic polities had converted to Islam, Chaney argues that studies in logic, philosophy, and science threatened to undermine the position of the religious elite.
34 See Tierney and Painter (1992, ch. 4).
35 Quoted in Tierney and Painter (1992, p. 73).
36 For more, see Tierney and Painter (1992, ch. 4).
37 See Berman (1983, ch. 1) and Tierney and Painter (1992, ch. 5).
38 For more on the economic consequences of these conditions, see Lopez (1971, chs. 1-2). For more of the effect of these conditions on the contractual forms found on manors, see North and Thomas (1971).
39 For more, see Goodenough (1931, p. 69) and Feldman (1997, p. 30).
40 See Tierney and Painter (1992, chs. 6, 7).
41 See Lopez (1971, chs. 2-3).
42 For more, see Greif, Milgrom, and Weingast (1994) and Greif (1994b). Putnam (1993), Guiso, Sapienza, and Zingales (2016), and Jacob (2010) contend that a key feature of medieval political institutions - the independence of certain cities in Northern Italy and the Holy Roman Empire - led to greater subsequent social capital and hence better subsequent economic outcomes.
43 For more on this point, see Lopez (1971), Jones (1997), and Greif (2006b).
44 For more, see North and Thomas (1971), Milgrom, North, and Weingast (1990), Greif, Milgrom, and Weingast (1994), Hunt and Murray (1999), and Greif (2004, 2006b).
45 See Berman (1983, p. 91).
46 Tierney (1988, pp. 33-95) gives an excellent overview of the Investiture Controversy, replete with translations of many of the important documents of the period.
47 For more on this period, see Berman (1983, ch. 2) and Tierney (1988, ch. 3).
48 On these last points, see Hyma (1938, pp. 30-32) and Feldman (1997, pp. 30-35).
49 See Berman (1983, ch. 7).
50 See Berman (1983) for an in-depth overview of the emergence of various types of law in this period.
51 See Berman (1983).
52 For an English translation and interpretation of this document, see Tierney (1988, ch. 3).
53 Quote from Berman (1983, p. 97).
54 See Tierney (1988, pp. 116-126).
55 See Tierney (1988, pp. 127-138).
56 See Tierney (1988, pp. 139-149).
57 Quoted in Tierney (1988, p. 171).
58 See van Zanden, Buringh, and Bosker (2012).



# حصہ دوم

## نظریے کا اطلاق: مغرب کیوں امیر ہوا اور مشرقِ وسطیٰ کیوں نہ ہوا

### 4- سود لینے پر پابندیاں

1 Cash waqfs were also an important source of capital in the late Ottoman period. However, they had important differences from banks described later in this chapter.
2 Kuran (2005a) argues that "Islamic economics" as a whole is largely a guise for a modern economic system cloaked in Islamic doctrine.
3 Quoted in Kindleberger (1980). For more on this flavor of argument, see Labib (1969), Rodinson (1973), Udovitch (1975), Le Goff (1979), Jones (1988), and Pamuk (2004b). For arguments in favor of an impact of interest restrictions on economic and political outcomes, see de Roover (1948), Noonan (1957), Kuran (1986), Ekelund et al. (1996), Reed and Bekar (2003), Munro (2003, 2008), Rubin (2010, 2011), and Koyama (2010).
4 For more on interest restrictions in a premodern context, see Brenner (1983), Glaeser and Scheinkman (1998), and Rubin (2009).
5 See Rahman (1964) and Schacht (1995).
6 For more on hiyal, see Khan (1929), Schacht (1964, 2006), Coulson (1969), Grice-Hutchinson (1978), and Ray (1997).
7 Jahiz, an Arab writer living in Basra in the ninth century CE, documented a specific account of a double sale. He cited two Persian Gulf merchants who bought back for cash the same articles they had just sold on fixed term. Jahiz's account reveals that such transactions were commonplace for Muslims in this period. For more on this account, see Ça?atay (1970, p. 57) and Rodinson (1973, pp. 38-40).
8 See Rodinson (1973, p. 39).
9 The scholars Abu Yusuf (d. 798) and Shaybani (d. 805) wrote two famous treatises.
10 In a detailed study of the early twelfth-century Cairo Geniza, Shelomo D. Goitein (1967, p. 170) observes that although credit and commerce flourished in Egypt, "even a cursory examination of the Geniza material reveals that lending money for interest was not only shunned religiously, but was also of limited significance economically … therefore, the economic role of financial investment today was then fulfilled by various forms of partnerships." Also see Udovitch (1979), Goitein (1967), and Gerber (1999, pp. 129, 141).
11 See Imber (1997, p. 146).
12 For more on isti?lal, see Gerber (1988, ch. 7).
13 On waqfs, see Imber (1997). On cash waqfs, see Çizakça (1995).
14 For more on the lack of banking, see Udovitch (1979) and Kuran (2004b, p. 73; 2011). Partnerships most frequently took the form of mudaraba (sleeping partnership) or 'inan, in which both partners invested some capital. For an extended analysis of partnerships in the medieval Islamic world, see Udovitch (1970). For more, also see Goitein (1967) and Labib (1969).
15 This excludes cases involving waqfs.
16 For more, see Mandaville (1979), Çizakça (2000, ch. 3), and Kuran (2005c, pp. 606-8).
17 See Çizakça (2004, p. 10).
18 For more on the resolution to this controversy, see Mandaville (1979, pp. 297-8) and Imber (1997, pp. 144-5).
19 See Mandaville (1979, p. 292). Çizakça (2000, pp. 51-2) shows that the amount of capital injected into the economy by the cash waqfs was nearly ten times the amount withdrawn by the state through the tax farm of the silk press. On the other hand, Gerber (1988, pp. 132-40) provides data showing that the waqf's role in providing credit in Bursa was relatively minor, and only 11% of all entries concerning credit were provided by waqfs in Jennings's (1973, p. 176) study of Kayseri sicils.
20 The approval of cash waqfs varied between schools of Sunni Islam. The Hanafi position (which was taken by the Ottomans) was relatively lenient, allowing them subject to custom. The Shafi'i, Maliki, and Hanbali schools also allowed the cash waqf, but only under certain conditions, with the Maliki school being the least rigid. For more, see Mandaville (1979, p. 293) and Çizakça (2000, pp. 27-40).
21 A few of the early Church fathers spoke out against interest, but modern scholars generally agree that these scattered early references to the evils of interest do not imply that taking interest was forbidden in the first three Christian centuries (Dow 1922; Divine 1959; Frierson 1969). The lack of anti-interest doctrine in this period is not attributable simply to the absence of a centralized

www.Mashalbooks.org

Church. Numerous local synods met before the fourth century and would have been the primary forums to espouse anti-interest sentiments, as they were in the fourth century, but interest was not a topic that was widely discussed, if it was discussed at all (Hefele [1894] 1973).

22 See Hefele ([1894] 1973) and Maloney (1973). Elvira and Carthage explicitly extended the prohibition to laymen. Canons ten and thirteen of the Synod of Carthage of 345-348 stated, "As the taking of any kind of usury is condemned in laymen, much more is it condemned in clergymen" (Hefele [1894] 1973, vol. 2, pp. 186, 468).

23 Rubin (2009) provides a theory of interest restrictions that is consistent with this early history of the Church, arguing that once the Church gained wealth under Constantine in the early fourth century, it suddenly faced a problem whereby its commitment to provide aid to everyone in need encouraged risky behavior associated with taking loans at high interest. One way to mitigate this problem while remaining consistent with Old Testament doctrine was to ban interest. For other views on the emergence of interest restrictions in premodern economies, see Posner (1980), Brenner (1983), Glaeser and Scheinkman (1998), and Reed and Bekar (2003).

24 See Lopez (1971, p. 72).

25 See Le Goff (1979) and Munro (2003, 2008).

26 For more on these papal decrees, see Noonan (1957, pp. 19-22, 80-1; 1966, p. 63) and Munro (2003, 2008).

27 See Munro (2003), Lane (1966, ch. 6), and Mueller (1997, ch. 10-14).

28 See Pirenne (1937, pp. 133-4) and de Roover (1948, p. 104).

29 See Pirenne (1937, pp. 133-4), de Roover (1942, pp. 57-8; 1948, pp. 104-6, 161), Gilchrist (1969, p. 114), and Grice-Hutchinson (1978, ch. 1).

30 See Noonan (1957, ch. 7), Gelpi and Julien-Labruyère (2000, p. 32), and Munro (2003, 2008).

31 See Homer and Sylla (1991, ch. 5-6, p. 138).

32 Quote from Noonan (1957, p. 161, ch. 7). Also see Munro (2008).

33 See Noonan (1957, ch. 5, 12), Divine (1959), and Gilchrist (1969).

34 See Gilchrist (1969, p. 115) and Gelpi and Julien-Labruyère (2000, pp. 42-3).

35 By the sixteenth century, the interest ban was more or less a dead letter, although it was still the official position of the Church. The Protestant Reformation sped up the Church's relaxation of interest doctrine, but it is clear that the forces underlying the relaxation of the ban were in motion well before the Reformation. For more on the early Protestant views on interest, see Noonan (1957, ch. 18), Gelpi and Julien-Labruyère (2000, ch. 4-5), and Kerridge (2002). The ban was officially lifted in a series of decisions between 1822 and 1836 in which the Holy Office publicly declared moderate interest legal to everyone. In 1917, the Church offered the Codex iuris canonici, which replaced all earlier collections of canon law and allowed a legal title to interest.

36 Quoted in Hunt and Murray (1999, p. 65).

37 See Hunt and Murray (1999, p. 64) and Kohn (1999).

38 See Einzig (1970, p. 67).

39 See Hunt and Murray (1999). The operations of the Florentine Covoni family, who between 1336 and 1340 registered 443 exchange transactions, exemplifies the use of bills of exchange as a financial instrument: 70 were trade-related and 373 were financial (Mueller 1997, p. 317-18). Bills of exchange evolved further in the late sixteenth and seventeenth centuries when they became negotiable and endorsable (the first use of endorsement occurred in the 1570s). As endorsable instruments, bills were similar to convertible money (Kohn 1999).

40 Merchants eventually adopted bills quoted in fictitious units of stable value in order to escape changes in exchange rates resulting from currency debasement and speculation, but their adoption of this measure instead of discounting suggests that currency exchange maintained its important role in the exchange transaction (Einzig 1970). Another way that bills simulated interest-bearing loans was through non-repayment by the payer. In this case, it was tacitly understood by all parties that a dishonored bill would be protested in court (for appearances) and returned to its place of issue, after which the taker was obligated to pay the deliverer back at the current rate of rechange, which acted as an interest payment (Einzig 1970).

41 If lenders could use differences in exchange rates to make an arbitrage-like profit, why did markets not eventually clear and exchange rates equalize? Raymond de Roover (1944) suggests that differences in exchange rates reflected a built-in interest payment, and hence such differences had to exist for an equilibrium to hold. If no differences in exchange rates existed, then there would not have been incentive for the capital-wealthy to lend. Meanwhile, some merchants were willing to pay a premium to have access to this capital. For instance, sellers of bills in London were often merchants who needed access to cash to pay for cloth, which they expected to sell in the Low Countries. One way of gaining access to this credit was by selling a bill in London and honored in Antwerp or Amsterdam. See de Roover (1944).

42 The sakk and ruq'a acted like checks, and merchants employed them primarily in short-distance trade for relatively small sums (Goitein 1967, pp. 240-1; Udovitch 1975).



43 See Lieber (1968) and Udovitch (1979). Though it is certain that the suftaja predates the European bill of exchange, there is considerable debate concerning the Middle Eastern origins of the European bill. Early twentieth-century scholars such as Usher (1914) believed Western bills to be of Italian origin, while later "Orientalist" scholars such as Schacht (1964) and Lieber (1968) believe that European bills owe a great deal to the Islamic world. Ashtor (1973) reconciles the two viewpoints, noting that while Europeans were aware of suftaja and even dealt in them, the difference in the economic setting in which they emerged, which (as emphasized in this chapter) permitted an exchange transaction to be included in the European but not the Islamic bill, suggests that the European bill was a fundamentally different and unique credit instrument.

44 In a study of early safatij, Eliahu Ashtor (1973, p. 562) notes that "studying the texts referring to the suftadjas drawn up in Iraq and Egypt at the time of the Abbasid caliphs, we note that the sums sent to another city or another country had to be collected in the same type of money in which the loan was made" (italics added). The lack of a currency exchange associated with the suftaja extends well beyond the Abbasid period and is a salient feature of transactions registered in the Geniza in the twelfth and thirteenth centuries. Also see Udovitch (1975, 1979).

45 See Lieber (1968, p. 233), Ashtor (1973, pp. 556-7), Ray (1997, p. 71), and Pamuk (2004b).

46 Quoted in Goitein (1967, p. 243). Similarly, a characteristic "blank" suftaja read: "Give ____ all that he may demand, obtain a receipt from him, and debit the sum to me" (see Mez 1937, p. 476).

47 See Goitein (1967, p. 243).

48 The Hanafi permitted safatij.

49 An alternative hypothesis for the absence of an exchange transaction associated with the suftaja is that there were fewer opportunities to trade currencies, perhaps stemming from less fragmentation in the Middle East relative to Europe, and thus less scope to use currency exchange. Historical evidence indicating that numerous types of currencies, such as different types of dinars and dirhams, were available in the Middle East contradicts such a theory, however. Ashtor (1973, p. 560) notes that a "rich variety of money, that is to say the ease with which foreign monies could be obtained in the big cities, was a typical phenomenon of the monetary life of the Muslim countries at the time of the Abbasid caliphs and at that of the Crusades, distinguishing them signally, in this respect, from the countries of Western Europe." Moreover, the fact that differences in exchange rates in Europe were essential to bills being profitable does not mean that such differences could not have emerged in the Middle East, if they indeed did not exist. Once financiers used European bills of exchange as instruments of finance, differences in exchange rates emerged endogenously as interest payments. It thus follows that had Middle Eastern lenders been able to include an exchange transaction with the suftaja, differences in exchange rates in different Middle Eastern cities may have followed.

50 A lender could buy a suftaja in place A, have an agent turn in the suftaja in place B for the same currency, have the agent exchange the currency for a different currency in place B, buy another suftaja in place B with the new currency, turn in that suftaja in place A in the new currency, and finally exchange the currency in place A for the original currency.

51 Two schools of Sunni Islam (Maliki and Shafi'i) explicitly forbade safatij, though the Malikites permitted their use in cases of extreme danger to the traveling merchant. The Hanbali school permitted them as long as no fee was charged. They were disapproved of, though permitted, by the Hanafi school (Dien 1995). The Hanafites, however, insisted that the suftaja was only permissible when there was no agreement to pay elsewhere and where the sums paid and repaid were equal (Ashtor 1973).

52 The enforceability of fines for late repayment suggests another possible mechanism that lenders could have secured a profit via safatij. The lender and borrower could have had a tacit agreement that the agent in the distant land would be late in repayment with the fee paid serving as interest. Indeed, Western Europeans employed this type of agreement. It is unlikely that Muslim lenders used this tactic for a variety of reasons, all of which are consistent with the theory presented in this chapter. First and foremost, this would have been a clear violation of Islamic law. While Muslim lenders used numerous hiyal that were consistent with the letter but not the spirit of the law, any implicit understanding between parties would have made the contract voidable under Islamic law. Thus, the essential difference between the two regions is that a dishonored bill would have been enforceable in Western European courts regardless of the intent of the parties. Indeed, the Church considered such an arrangement usurious (in fraudem usurarum, see Munro [2003]) but had little power to impose secular sanctions after its power waned in the late thirteenth century, whereas such a bill would not have been enforced in Islamic courts if it were obvious that the intent was to circumvent interest restrictions. Moreover, even if such a practice became widespread, it is unclear how it would have facilitated impersonal lending. The set of potential sanctions that could enforce this type of contract were personal or social.

53 See Einzig (1970).

54 See de Roover (1946b, 1963). The Medici house operated in a similar manner to its rival controlled by Francesco Datini. The Medici enterprise differed from the "super-company" organizations of the fourteenth century (such as the Peruzzi, Bardi, and Acciaiuoli companies), which were centralized under one partnership that controlled foreign branches.
55 See de Roover (1963, p. 87).
56 See de Roover (1946a, 1963).
57 See Goitein (1967, pp. 244-5) and Udovitch (1975).
58 Theoretically, Middle Eastern lenders could have extended their networks in order to increase their confidence in the partner on the other end of the transaction, who would have been a part of the same "business." This would have encouraged the writing of larger safatij at greater fees. Yet, in this case the incidence of personal exchange is even greater, as both the borrower and his agent are part of an even closer network. It is also possible that Middle Eastern lenders could have learned the potential benefits of adding exchange to the suftaja through contact with Christian minorities. Indeed, the Pact of Umar permitted Christian minorities (dhimmis) in Islamic lands to utilize Christian courts in transactions involving non-Muslims. Yet, it is unlikely that European bills of exchange could have been commonly employed as financial instruments in Muslim lands for two reasons: (1) bills of exchange were enforceable only by merchant law in Europe, which was not available in Islamic law; and (2) the viability of bills of exchange as financial instruments depended on the existence of a critical mass of (in this case, Christian) borrowers and lenders in more than one region. In fact, Christian minorities generally abided by Islamic law until the eighteenth century, by which time much more advanced financial instruments were available to European lenders. For more on these points, see Kuran (2004a, 2011).
59 See Mokyr (1990). For more on the importance of historical events and path dependence on the evolution of institutions, see David (1994), Kuran (2005a, 2011), and Greif (2006b, chs. 5, 7).

## 5- چھاپہ خانے پر پابندیاں

1 I am only concerned here with the invention of the movable-type printing press in Europe. The Chinese knew of printing since the eleventh century, but it was not introduced to Europe until the 1450s.
2 See McCusker (2005) and Chilosi and Volckart (2010).
3 The actual number spans the period 500-1450, but it is almost certain that the number of manuscripts produced from 450 to 1450 was smaller than in the half-century following the invention of the press.
4 See Febvre and Martin (1958, p. 218).
5 See Spitz (1985) and Buringh and van Zanden (2009).
6 See Buringh and van Zanden (2009).
7 See Febvre and Martin (1958).
8 See Dittmar (2011).
9 See Eisenstein (1979).
10 See Febvre and Martin (1958, p. 249).
11 See Febvre and Martin (1958) and Eisenstein (1979).
12 See Swetz (1987).
13 Quoted in Swetz (1987, p. 25).
14 See Kertcher and Margalit (2006).
15 For more, see Febvre and Martin (1958), Eisenstein (1979), Love (1993), Johns (1998), and Kertcher and Margalit (2006).
16 Much of the next two sections are in Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a). I thank Metin and Tom for their work and their permission to let me use the ideas we formulated together in this chapter. And I especially thank Metin for letting me use the Turkish works he translated.
17 Mystakidis (1911, p. 324) mentioned the presence of such an edict in the first volume of Türk Tarih Encümeni Dergisi, but the validity of this claim was challenged by Efdaleddin Tekiner (1916) in the same publication five years later on the grounds that Ottoman archives do not house edicts issued prior to 1553 and thus Mystakidis could not possibly have seen it. Despite this correction and the fact that no such edicts have since been uncovered, the secondary literature has for the most part accepted the presence of the edict as a matter of established fact. See, for example, Pedersen (1984, p. 133), Finkel (2005, p. 366) and Savage-Smith (2003, p. 656). I thank Metin Co?gel for the insights and translations on Mystakidis and Tekiner.
18 English translation from Göçek (1987, p. 112).
19 See Finkel (2005, p. 366).
20 For more see Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a) and Frazee (1983).
21 See Pedersen (1984, p. 135).



22 See Finkel (2005, p. 366).
23 See Atiyeh (1995, p. 285).
24 See Göçek (1987, p. 110).
25 For more, see Pedersen (1984), Robinson (1993, p. 233), Sardar (1993), and Atiyeh (1995, p. 283).
26 On the Ottoman Empire, see Quataert (2000, p. 167). On Europe, see Baten and van Zanden (2008).
27 See Özmucur and Pamuk (2002).
28 See Sardar (1993, pp. 47-51).
29 See Sardar (1993, pp. 47-51).
30 See ?nalc?k (1973, p. 99) and Dale (2010).
31 See Hourani (1991, ch. 13), Imber (1997), and Dale (2010).
32 This process is described in Hourani (1991, p. 199) and Robinson (1993, p. 235).
33 See Sardar (1993, p. 50).
34 See Sardar (1993, pp. 45-6).
35 See Robinson (1993, p. 237).
36 Quoted in Robinson (1993, p. 237).
37 See Sardar (1993, pp. 52-3).
38 Chaney (2016) puts forth a similar argument. He argues that the fall of Muslim science was due to the fact that Islamic religious authorities faced little competition in the realm of ideas and hoped to keep it that way.
39 See Göçek (1987, p. 109).
40 See Buringh and van Zanden (2009).
41 See Tierney (1988).
42 See Schachner (1962).
43 See Schachner (1962, p. 50).
44 See Christ et al. (1984, pp. 297-310) and Febvre and Martin (1958, pp. 22-5).
45 See Haskins (1957, pp. 38-53), Schachner (1962), and Christ et al. (1984, pp. 237-8).
46 To be clear, the Ottoman suppression of printing in the Arabic script was not the result of idiosyncratic decisions made by a few sultans in the fifteenth and sixteenth centuries. If this were the case, it is likely that the long hand of history would have caught up with the Ottomans and pushed toward the adoption of printing. Instead, as this chapter suggests, the Ottoman blocking of printing was a calculated decision resulting from very deeply entrenched, institutionally imposed incentives faced by the sultan. The Ottoman non-adoption of the press was a self-enforcing equilibrium outcome, not a choice made by a few foolish sultans.

## 6- طباعت اور تحریکِ اصلاحِ کلیسا

1 Spenkuch (2016) provides possible support for Weber's hypothesis. He finds that Protestantism induces people to work longer hours - leading to higher earnings - and that human capital or institutional differences cannot account for these results. This leaves many possible causal channels open, including the one proposed by Weber.
2 Becker and Wößmann (2008, 2009) propose that the causal pathway connecting Protestantism to long-run economic success is education. They argue that Luther encouraged reading the Bible, which in turn gave Protestants an early start on acquiring literacy. Arruñada (2010) argues that Protestants did not have a unique work ethic, but instead had a "social ethic" that favored market transactions. Young (2009) overviews a number of possible, non-mutually exclusive reasons that Protestant regions had better long-run outcomes than Catholic regions. Guiso et al. (2003) gives a contrary view. They find a positive correlation between Christian religions and attitudes conducive to economic growth.
3 As calculated in Allen (2001).
4 Allen (2001) gives data for 1900-1913, but Bairoch et al. (1988) does not provide population data for this period. Allen (2001) also does not have data for each city in each period. Where Allen's data are missing, I exclude these cities from the analysis. Population data from Bairoch et al. (1988) are from the beginning of the period in question. Bairoch and colleagues do not report population data for 1550 or 1650, so I derive these data by taking the geometric mean of the two surrounding points.
5 On the Reformation, see Weber (1905 [2002]), Tawney (1926), Becker and Wößmann (2008, 2009), and Arruñada (2010). On the printing press, see Eisenstein (1979), Baten and Van Zanden (2008), Buringh and van Zanden (2009), and Dittmar (2011). On the New World, see Pomeranz (2000) and Acemoglu, Johnson, and Robinson (2005). On the Renaissance, see Mokyr (2002) and McCloskey (2010). On the Ottomans, see Iyigun (2008, 2015).

www.MashalBooks.org

6 Rubin (2014a) suggests that centralized institutions like the medieval Church are particularly vulnerable to rapid revolt because they have numerous means of suppressing dissent. This means that the publicly stated preferences of people often differ from their privately held preferences (as in Kuran [1995]). Makowsky and Rubin (2013) further this argument, suggesting that information technology further increases the likelihood of revolt in economies with centralized institutions, as previously suppressed anti-authority preferences are more likely to rise to the surface.
7 Much of this section is from Rubin (2014b).
8 See Cameron (1991).
9 See Blickle (1984). Ekelund, Hébert, and Tollison (2002) suggest, in a similar manner, that civil authorities sought an alternative provider of legal services and a less costly path to salvation through the Reformation, as the Church (a monopolist) was overcharging. Their analysis highlights yet another necessary precondition of the Reformation, complementing the one proposed in this chapter.
10 See Scribner (1989).
11 See Holborn (1942) and Edwards (1994).
12 For more on the debate between papism and conciliarism, and especially the role played by Gerson, see Dolan (1965, ch. 4).
13 See Weber (1912).
14 See Wilhelm (1910).
15 A city is considered to have been part of the Holy Roman Empire if it were de facto subject to the Emperor and the empire's institutions throughout the sixteenth century. This includes cities in present-day Germany, Austria, Czech Republic, Belgium, Luxembourg, eastern France, and western Poland. This excludes Switzerland, which de facto broke away from the Empire in 1499; the Netherlands, which revolted and broke away from the Holy Roman Empire in the 1570s; and northern Italy (e.g., the Duchies of Savoy and Milan), which was not de facto subject to the Emperor. All results are robust to different definitions of the Holy Roman Empire.
16 Becker and Wößmann (2008, 2009) and Cantoni (2012) find that proximity to Wittenberg was a key factor determining whether towns in the Holy Roman Empire adopted the Reformation.
17 Pfaff and Corcoran (2012) argue that there are numerous other supply-and-demand features that contributed to cities adopting the Reformation. Curuk and Smulders (2016) suggest that princes may have demanded the Reformation to remove the power of the Church, and this demand was highest in regions that did not realize their economic potential. Their study suffers from a limited sample size, and it is unclear that their mechanism could have possibly worked in the free imperial cities, but their intuition is consistent with the arguments made in this book. For an overview of recent works on the economic, sociological, and political causes and consequences of the Reformation, see Becker, Pfaff, and Rubin (2016).
18 The variables controlled for are: whether the city housed a university by 1450, whether the city housed a bishop or archbishop by 1517, whether the city was a member of the Hanseatic League, whether the city was an independent, Free Imperial city in 1517, whether a city belonged to a lay magnate (i.e., it was neither free nor subject to an ecclesiastical lord), a dummy for the presence of printing, whether the city was on water (ocean, sea, large lake, or river connected to another city), the city's urban potential (i.e., the sum of the populations of all other cities weighted by their distance from the city in question), the city's distance to Wittenberg, and the latitude, longitude, and interaction between the two. For more on these data, see Rubin (2014b).
19 Formally, Rubin (2014b) analyzes both a probit and a two-stage probit to control for endogeneity. The first-stage dependent variable is whether a city had a printing press by 1500, and the instrument used is the city's distance to Mainz, the birthplace of printing. This variable correlates with the spread of printing but should not have had an independent effect on the spread of the Reformation. More details are available in Rubin (2014b).
20 For the relevant recent citations in the fiscal capacity literature, see Chapter 1. In many historical and present-day societies, the economic elite held the government's purse strings and provided council to rulers, helping them solve information problems and problems associated with succession. For more, see Congleton (2011, chs. 2-5).
21 For much more on the incentive for rulers to maximize revenue through predation - and attempts at constraining this type of action by other players in society - see Brennan and Buchanan (1980), Levi (1988), North and Weingast (1989), Tilly (1990), and Irigoin and Grafe (2013).
22 Congleton (2011, ch. 5) has a nice discussion of how differing "king and council" arrangements affect policy outcomes in different situations. Congleton's analysis is consistent with the one offered in this book, although the emphasis here is more on why differing arrangements arose in the first place. Also see van Zanden, Buringh, and Bosker (2012).
23 See van Zanden, Buringh, and Bosker (2012, p. 838).
24 Monarchs also called parliaments to legitimize themselves early in their reign, establish laws affecting local commerce, and hear complaints from petitioners.



25 Not all parts of Bavaria were Catholic, but this was the least-Reformed German region. The figure does not look very different with Bavaria classified as Protestant. Also, I drop Russia from this figure, since it was primarily Orthodox.
26 van Zanden, Buringh, and Bosker (2012) argue that there was a "little divergence" in parliamentary development between northwestern Europe and southern Europe between 1500 and 1800, but they do not attribute this divergence to the Reformation. Their empirical observation is consistent with the argument proposed in this book; indeed, the present argument helps explain why this "little divergence" arose when and where it did.
27 See van Zanden, Buringh, and Bosker (2012).
28 Another important distinction between Christianity and Islam is that the former has more centralized institutions than the latter. This argument is highly complementary to the one proposed in this chapter, as explained in note 6. I do not discuss this argument in detail because doing so would necessitate at least two more chapters that would detract from the central focus of the book.
29 See ?nalc?k (1973, chs. 18-19).
30 Much of this section is from Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a). I again thank Metin and Tom for their work and their permission to let me use these ideas we formulated together.
31 On wages, see Özmucur and Pamuk (2002). On literacy, see Quataert (2000, p. 167).
32 Calculated by Metin Co?gel from the information presented in Baysal (1968, pp. 40-2).
33 See Zilfi (1988, pp. 47-8).
34 See ?nalc?k (1973) and Hourani (1991, ch. 15).
35 See Hourani (1981), Özkaya (1994), and Karaman and Pamuk (2010).
36 Gill (1998, ch. 3) similarly notes, in the Latin American context, that one of the primary times in which states attack religious authority is when alternative sources of legitimacy arise. Gill focuses on the effects of alternative ideologies, such as nationalism or communism.
37 Quoted in Kurzman and Browers (2004, p. 5).
38 See Opwis (2004, pp. 30-3).
39 See Opwis (2004, p. 30). Opwis also notes that these events weakened the hold of religious authorities over the legal sphere as well.
40 See Kuran (2011) for an extensive analysis of the causes and consequences of the Ottoman capitulations.
41 Quoted in Kurzman and Browers (2004, p. 4). For more, also see Opwis (2004).
42 See Browers (2004).
43 See Opwis (2004, pp. 33-7).
44 Eickelman (1998) also points to mass education and communication as the impetus for an "Islamic Reformation," but he places the timing in the latter half of the twentieth century.
45 See Opwis (2004, p. 35).
46 See Opwis (2004, p. 38) and Browers (2004, p. 56).
47 Quoted in Kurzman and Browers (2004, p. 6).

## 7- کامیابی: انگلستان اور جمہوریہ ڈچ

1 See, for instance, North and Thomas (1973).
2 For an excellent overview of the Malthusian model and its usefulness in economic history, see Clark (2007).
3 See van Zanden, Buringh, and Bosker (2012).
4 See Graves (1985, p. 39).
5 See Congleton (2011, ch. 12) for more consequences of this arrangement.
6 Quoted in Hunt (2008, p. 43).
7 24 Henry VIII c.12.
8 26 Henry VIII c.1.
9 On the last point, see Graves (1985).
10 27 Henry VIII c.10 and 32 Henry VIII c.1.
11 See Ives (1967).
12 See Ives (1967).
13 See Holdsworth (1912), Bordwell (1926), Ives (1967), and North, Wallis, and Weingast (2009, ch. 3).
14 Mary was declared a bastard in the First Succession Act of 1533 (25 Henry VIII c.22), and Elizabeth was declared a bastard in the Second Succession Act of 1536 (28 Henry VIII c. 7).
15 35 Henry VIII c.1.
16 1 Mary st.2 c.1 and 1 Eliz. I c.3.
17 Burgess (1992) overviews the Tudor's and Stuart's use of the "divine right of kings" doctrine and the limitations of this doctrine.

www.MashalBooks.org

18 For more on this history of usury legislation, see Munro (2012). The reinstitution of usury laws brought back a statute passed under Henry VIII in 1545 that was struck down in 1552.
19 See North and Weingast (1989).
20 See Brenner (1993) for a fantastically detailed exposition of the "new merchant" and Parliamentary alliances that were the key to the Royalist opposition in the Civil War.
21 There is a large literature citing the seventeenth-century political conflicts between Parliament and the Crown as a key determinant of long-run economic success in England. Most famously, Douglass North and Barry Weingast (1989) suggest that the ultimate upshot of the conflicts, especially the Glorious Revolution settlement, was that the Crown could credibly commit to upholding the property rights of the economic elite, as Parliament showed they could remove a monarch. The constitutional structure resulting from the Settlement allowed action in times of crisis, but also gave wealth-holders in Parliament a greater say in the daily happenings of government. North and Weingast's theory is not without its detractors, and the present book does not engage in this debate. See in particular Clark (1996), who argues that rates of return were stable well before the Glorious Revolution and did not spike around the Revolution, as would be expected if North and Weingast are correct. For other criticisms of North and Weingast's theory, see Carruthers (1990), Wells and Wills (2000), Quinn (2001), and Sussman and Yafeh (2006). Pincus and Robinson (2014) argue that North and Weingast were correct to focus on institutional changes heralded by the Glorious Revolution, but that party politics were at the root of the changes, not credible commitment. Cox (2012) argues that North and Weingast were correct to focus on institutional changes, but their focus on property rights was misplaced. Cox suggests that the important changes were constitutional in nature, giving Parliament greater ability to grant tax revenues and issue debt.
22 For much more on the commercial policies of the Interregnum government, see Brenner (1993, ch. 12).
23 See de Vries and van der Woude (1997) and de Vries (2000) for numbers attesting to Dutch growth during the Golden Age.
24 See Israel (1995, ch. 6), de Vries and van der Woude (1997), van Zanden (2002a, 2002b), and van Bavel (2003). van Zanden (2002a, 2002b) attempts to pin the rise of the Dutch economy to an earlier period than de Vries and van der Woude. van Zanden (2002b) goes so far as to say that Dutch economic growth over the sixteenth-eighteenth centuries was "unspectacular." I have no interest in entering into this argument; the only point made here is that the Dutch had a "head start" on much of the rest of Europe, a relatively uncontroversial point within this literature.
25 See Allen (2001) and van Zanden (2002a).
26 See van Zanden (2002b), van Bavel (2003), and van Zanden, Zuijderduijn, and de Moor (2012).
27 See North (1981, p. 152).
28 See Israel (1995, p. 106).
29 See de Vries and van der Woude (1997, ch. 5) and van Zanden, Zuijderduijn, and de Moor (2012). van Zanden (2002a) argues that the Dutch did indeed have a feudal past, and he cites a recent literature in support of this assertion. Regardless, it is clear that the feudal nobility were weaker relative to the urban classes in the Low Countries than they were elsewhere in Europe.
30 See van Zanden, Zuijderduijn, and de Moor (2012) for more on the accessibility of credit in late medieval Holland.
31 See Israel (1995, ch. 6).
32 See Parker (1977, p. 32), van Gelderen (1992, pp. 22-3), and van Zanden, Zuijderduijn, and de Moor (2012).
33 See Israel (1995, ch. 13).
34 See van Zanden and Prak (2006).
35 See Parker (1977, p. 179) and de Vries and van der Woude (1997, ch. 4).
36 van Gelderen (1992) gives an excellent overview of the political thought underlying the Dutch Revolt.
37 See Israel (1995, p. 79).
38 See Parker (1977, pp. 36-7).
39 See Parker (1977, ch. 2), van Gelderen (1992), and de Vries and van der Woude (1997, ch. 9).
40 See Parker (1977, p. 155). van Gelderen (1992, ch. 4) notes that by the mid-1570s, the Dutch made efforts to deny that the Revolt was religiously motivated, instead arguing that it was a fight for liberty.
41 See Fritschy (2003).
42 See de Vries and van der Woude (1997, ch. 4), Fritschy (2003), and van Zanden and Prak (2006).
43 See Israel (1995, ch. 14).
44 See Gelderblom and Jonker (2004).
45 See Gelderblom and Jonker (2005).



46 See de Vries and van der Woude (1997, chs. 2, 5, 9).
47 See Israel (1995, ch. 15).
48 See de Vries and van der Woude (1997, chs. 11, 12).
49 See Israel (1995, ch. 6).
50 See de Vries and van der Woude (1997, chs. 3, 11, 13).
51 See Israel (1995, ch. 14), de Vries and van der Woude (1997, chs. 3, 8), and van Bavel (2003).
52 See Israel (1995, ch. 12).
53 See de Vries and van der Woude (1997, chs. 5, 8). Priest (2006) gives an excellent overview of laws regarding the alienability of land in English history.
54 See de Vries and van der Woude (1997, ch. 4).
55 Cameron and Neal (2003) give a nice overview of the order in which the European countries industrialized.
56 See de Vries and van der Woude (1997, chs. 8, 11, 14).
57 See de Vries (2000).

## 8- جمود: سپین اور سلطنتِ عثمانیہ

1 See Kamen (2003).
2 The exact number of people expelled has long been the subject of debate. For example, Elliott (1961) claims that Hamilton (1938) vastly underestimated the number of expulsions and thus underestimated their economic impact. It is not my purpose to enter into this debate, only to note that the expulsions affected the Spanish Crown's basis for legitimacy.
3 See Simpson (1956) and Lynch (1991, ch. 1).
4 See Lynch (1991, ch. 1). The police forces (hermandades) also brought the nobility to heel, as they were able to force contributions from both the nobility and the Church.
5 See Lynch (1991, p. 154).
6 See Dunn (1979, ch. 1), Kamen (1988, ch. 5), and Lynch (1991, ch. 8). Kamen in particular argues that the Spanish history of squashing nonorthodox thought gave the Reformation little it could build on in Spain. Another possibility, which I do not wish to push too far, is that publishing never became a big business in Spain prior to the Reformation (Kamen 1988, p. 69). This is consistent with the argument made in Chapter 6, which notes the importance of printing to the propaganda efforts of the Reformers.
7 See Lynch (1991, ch. 2).
8 See Lynch (1991, ch. 2).
9 Quote from Drelichman (2005a). For more on the effect of the comuneros revolt, see Drelichman (2005a), Lynch (1991, ch. 2), and Simpson (1956). Kamen (1988) argues that the "rubber stamp" view of the Cortes is untenable, but he points to the late sixteenth and seventeenth centuries as evidence. This may be true in the period Kamen is considering, but it is not the object of discussion here.
10 Quote from Lynch (1991, p. 64).
11 See Kamen (2003, ch. 2).
12 See Lynch (1991, ch. 9).
13 See Parker (1973) and Lynch (1991, ch. 9). Parker (1973) gives an overview of the repeated mutinies of the Spanish army in the late sixteenth century, all of which occurred due to lack of payment.
14 See Dunn (1979, ch. 1) and Lynch (1991, ch. 7).
15 See Lynch (1991, ch. 7).
16 See Drelichman and Voth (2011).
17 See Lynch (1991, ch. 2).
18 See Drelichman (2005a). Drelichman (2005b) argues that the import of precious metals from America created a "Dutch disease" that undermined Spanish long-run economic growth. Irigoin and Grafe (2008) and Grafe and Irigoin (2012) note that the Crown was able to extract significant revenue despite having almost no fiscal apparatus by outsourcing fiscal functions to private individuals.
19 See Drelichman (2005a) and Drelichman and Voth (2011).
20 See Drelichman and Voth (2011).
21 See Drelichman (2005a).
22 See Drelichman (2005a).
23 See Irigoin and Grafe (2008, 2013) and Grafe and Irigoin (2012). The fiscal apparatus was weak and decentralized. The central government had almost no control over which taxes their tax farmers levied.
24 For more on the long-run effects of such extractive institutions, see Acemoglu, Johnson, and

Robinson (2005) and Acemoglu and Robinson (2012).
25 Spanish policies regarding the wool industry were yet another cause of Spanish economic decline. The Mesta (sheep-owners' guild) was favored by the Crown, and the Crown therefore refrained from enclosing common lands and providing security of property rights for non-Mesta agriculturalists. See Hamilton (1938), Elliott (1961), North (1981), and Lynch (1991, ch. 4). Kamen (1978) argues that there is simply no plausible evidence to suggest that the Crown's favoring of the Mesta inhibited agriculture. I do not wish to enter into this argument here. I simply note that the arguments made in this book are consistent with the Crown's favoring of the Mesta at the expense of economic development, to the extent that this was historically the case.
26 Even where local finance and law and order were not under the control of the Crown, it was in the hands of the growing aristocracy and the Church, neither of whom were interested in commercial endeavors. See Kamen (1988, ch. 1).
27 See Lynch (1991, ch. 4).
28 See Lynch (1991, ch. 4) and Kamen (2003, chs. 2, 7).
29 See Lynch (1991, ch. 4).
30 See Lynch (1991, ch. 4).
31 See Elliott (1961) and Lynch (1991, pp. 172-3).
32 See Lynch (1991, pp. 198-9).
33 See Elliott (1961).
34 See Elliott (1961) and Lynch (1991, ch. 2).
35 Also see Álvarez-Nogal and de la Escosura (2007).
36 For more on the arbitristas, see Baeck (1988).
37 There is a long history of academic treatises trying to explain the "decline of Spain." For some of the relevant literature, see Hamilton (1938), Elliott (1961), and Kamen (1978). Kamen views the decline of Spain as a myth, arguing that Spain never really "rose" in the first place.
38 See Álvarez-Nogal and de la Escosura (2007). They show there was significant variation within Spain, but the general pattern over time appears robust.
39 See Hamilton (1938) and Álvarez-Nogal and de la Escosura (2007, 2013).
40 See Álvarez-Nogal and de la Escosura (2007, 2013).
41 For more on the varying sources of legitimacy employed by the Ottomans, see Co?gel, Miceli, and Rubin (2012a, 2012b).
42 For more, see ?nalc?k (1973, ch. 13), Hourani (1991, ch. 13), Pamuk (2004b), Co?gel and Miceli (2005), and Karaman and Pamuk (2010).
43 See ?nalc?k (1973).
44 See Karaman (2009).
45 For more on Ebu's-su'ud - his career, life, and place within the Ottoman hierarchy - see Imber (1997).
46 See van Zanden, Buringh, and Bosker (2012).
47 The Ottomans did face a threat in the early fifteenth century when Tamerlane overthrew them. Sultan Mehmed I (r. 1413-1421) won back the throne by ceding to the demands of the elite. However, this was prior to their expansion outside of the Anatolian and Balkan peninsulas. See Karaman (2009).
48 See Kuran (2005b, 2011).
49 See Pamuk (2004a) and Balla and Johnson (2009).
50 See Pamuk (2004a) and Karaman and Pamuk (2010).
51 See Pamuk (2004b).
52 See Pamuk (2004a, 2004b).
53 See Karaman and Pamuk (2010).
54 See Karaman and Pamuk (2010).
55 See Balla and Johnson (2009).
56 See Karaman (2009) for an analysis of the Ottoman tradeoffs between tax collection and stifling revolt.
57 The Ottomans did occasionally modify commercial law. For instance, in the nineteenth century, after external pressures made it obvious that economic stagnation was harming the Ottomans' position vis-à-vis Europe, they imposed a series of economic reforms. Moreover, the Qur'an is hardly wholly antithetical to commerce; scores of verses sanctify private property and encourage enrichment. The point is simply that the costs of modifying commercial law frequently, but not always, outweighed its benefits.
58 See ?nalc?k (1973, ch. 10) and Karaman (2009).
59 For example, one of Ebu's-su'ud's great accomplishments was that he harmonized secular administration with religious law by allowing rulers wide discretion in setting tax rates. See Imber (1997).
60 See Kuran (2011).



61 See Pamuk (2000).
62 See Özmucur and Pamuk (2002).
63 For overviews of the Great Debasement, see Challis (1967) and Munro (2011). For more on the inflationary effect of the Great Debasement, see Brenner (1961).
64 Metin Co?gel and Bogac Ergene (2014) find similar patterns in their analysis of courts in eighteenth-century Kastamonu, an Ottoman town in north-central Turkey. They show that members from elite families did much better than those from poorer families, although they suggest that it is possible that this was not the result of judicial bias, but resulted from the fact that members of the elite would only risk going to court if they were confident they would win.
65 On the merchant guild, see Greif, Milgrom, and Weingast (1994) and Greif (2006b). On the community responsibility system, see Greif (2002, 2004, 2006b).

www.MashalBooks.org

# حوالہ جات


Acemoglu, Daron (2005), 'Politics and Economics in Weak and Strong States', Journal of Monetary Economics, 52, 1199-226.

Acemoglu, Daron, Johnson, Simon, and Robinson, James A. (2001), 'The Colonial Origins of Comparative Development: An Empirical Investigation', American Economic Review, 91 (5), 1369-401.

Acemoglu, Daron, Johnson, Simon, and Robinson, James A. (2002), 'Reversal of Fortune: Geography and Institutions in the Making of the Modern World Income Distribution', Quarterly Journal of Economics, 118, 1231-94.

Acemoglu, Daron, Johnson, Simon, and Robinson, James A. (2005), 'The Rise of Europe: Atlantic Trade, Institutional Change, and Economic Growth', American Economic Review, 95 (3), 546-79.

Acemoglu, Daron and Robinson, James A. (2006), 'Economic Backwardness in Political Perspective', American Political Science Review, 100, 115-31.

Acemoglu, Daron and Robinson, James A. (2012), Why Nations Fail: The Origins of Power, Prosperity, and Poverty (New York: Crown).

Ahmad, Feroz (2000), 'Ottoman Perceptions of the Capitulations 1800-1914', Journal of Islamic Studies, 11 (1), 1-20.

Alesina, Alberto and Giuliano, Paola (2015), 'Culture and Institutions', Journal of Economic Literature, 53 (4), 898-944.

Alesina, Alberto and Spolaore, Enrico (1997), 'On the Number and Size of Nations', Quarterly Journal of Economics, 112 (4), 1027-56.

Alesina, Alberto and Spolaore, Enrico (2005), 'War, Peace, and the Size of Countries', Journal of Public Economics, 89 (7), 1333-54.

Allen, Robert C. (2001), 'The Great Divergence in European Wages and Prices from the Middle Ages to the First World War', Explorations in Economic History, 38, 411-47.

Alesina, Alberto and Spolaore, Enrico (2009), The British Industrial Revolution in Global Perspective (Cambridge: Cambridge University Press).

Allen, Robert C., et al. (2011), 'Wages, Prices, and Living Standards in China, 1738-1925: In Comparison with Europe, Japan, and India', Economic History Review, 64 (S1), 8-38.

Alston, Lee J., et al. (2016), Beliefs, Leadership and Critical Transitions: Brazil, 1964-2012 (Princeton: Princeton University Press).

Álvarez-Nogal, Carlos and de la Escosura, Leandro Prados (2007), 'The Decline of Spain (1500-1850): Conjectural Estimates', European Review of Economic History, 11, 319-66.

Alvarez-Nogal, Carlos and de la Escosura, Leandro Prados (2013), 'The Rise and Fall of Spain (1270-1850)', Economic History Review, 66 (1), 1-37.

Anderson, Robert Warren, Johnson, Noel D., and Koyama, Mark (2016), 'Jewish Persecutions and Weather Shocks: 1100-1800', Economic Journal, Forthcoming.

Aoki, Masahiko (2001), Toward a Comparative Institutional Analysis (Cambridge, MA: MIT Press).

Arruñada, Benito (2010), 'Protestants and Catholics: Similar Work Ethic, Different Social Ethic', Economic Journal, 120 (547), 890-918.

Ashtor, Eliahu (1973), 'Banking Instruments between the Muslim East and the Christian West', Journal of European Economic History, 1, 553-73.

Atiyeh, George Nicholas (1995), The Book in the Islamic World: The Written Word and Communication in the Middle East (Albany: State University of New York Press).

Baeck, Louis (1988), 'Spanish Economic Thought: The School of Salamanca and the Arbitristas',





History of Political Economy, 20 (3), 381-408.

Bairoch, Paul, Batou, Jean, and Che?vre, Pierre (1988), La Population des Villes Européennes, 800-1850 (Geneva: Droz).

Balla, Eliana and Johnson, Noel D. (2009), 'Fiscal Crisis and Institutional Change in the Ottoman Empire and France', Journal of Economic History, 69 (3), 809-45.

Barkan, Ömer Lütfi (1970), 'Research on the Ottoman Fiscal Surveys', in M.A. Cook (ed.), Studies in the Economic History of the Middle East (London: Oxford University Press), 163-71.

Barro, Robert and McCleary, Rachel M. (2003), 'Religion and Economic Growth Across Countries', American Sociological Review, 68 (5), 760-81.

Baten, Joerg and Zanden, Jan Luiten van (2008), 'Book Production and the Onset of Modern Economic Growth', Journal of Economic Growth, 13 (3), 217-35.

Bates, Robert H. (2001), Prosperity and Violence: The Political Economy of Development (New York: Norton).

Baysal, Jale (1968), Müteferrikadan Birinci Mesrutiyete kadar Osmanl? Türklerinin bast?klar? Kitaplar (Istanbul).

Bearman, P., et al. (2005), 'Brill Encyclopaedia of Islam', Second edn. (Leiden: Brill).

Becker, Sascha O., Pfaff, Steven, and Rubin, Jared (2016), 'Causes and Consequences of the Protestant Reformation', Explorations in Economic History, Forthcoming.

Becker, Sascha O. and Wößmann, Ludger (2008), 'Luther and the Girls: Religious Denomination and the Female Education Gap in 19th Century Prussia', Scandinavian Journal of Economics, 110 (4), 777-805.

Becker, Sascha O. and Wößmann, Ludger (2009), 'Was Weber Wrong? A Human Capital Theory of Protestant Economic History', Quarterly Journal of Economics, 124 (2), 531-96.

Berkey, Jonathan P. (2003), The Formation of Islam: Religion and Society in the Near East, 600-1800 (Cambridge: Cambridge University Press).

Berman, Eli (2000), 'Sect, Subsidy, and Sacrifice: An Economist's View of Ultra-Orthodox Jews', Quarterly Journal of Economics, 115 (3), 905-53.

Berman, Harold J. (1983), Law and Revolution: The Formation of the Western Legal Tradition (Cambridge, MA: Harvard University Press).

Besley, Timothy and Persson, Torsten (2009), 'The Origins of State Capacity: Property Rights, Taxation and Politics', American Economic Review, 99 (4), 1218-44.

Besley, Timothy and Persson, Torsten (2010), 'State Capacity, Conflict and Development', Econometrica, 78, 1-34.

Blaydes, Lisa and Chaney, Eric (2013), 'The Feudal Revolution and Europe's Rise: Political Divergence of the Christian West and the Muslim World before 1500 CE', American Political Science Review, 107 (1), 16-34.

Blickle, Peter (1984), 'Social Protest and Reformation Theology', in Kaspar von Greyerz (ed.), Religion, Politics and Social Protest: Three Studies on Early Modern Germany (London: George Allen & Unwin).

Bogart, Dan (2011), 'Did the Glorious Revolution Contribute to the Transport Revolution? Evidence from Investment in Roads and Rivers', Economic History Review, 64 (4), 1073-112.

Bogart, Dan and Richardson, Gary (2009), 'Making Property Productive: Reorganizing Rights to Real and Equitable Estates in Britain, 1660-1830', European Review of Economic History, 13, 3-30.

Bogart, Dan and Richardson, Gary (2011), 'Property Rights and Parliament in Industrializing Britain', Journal of Law and Economics, 54 (2), 241-74.

Bolt, Jutta and van Zanden, Jan Luiten (2014), 'The Maddison Project: Collaborative Research on Historical National Accounts', Economic History Review, 67 (3), 627-51.

Bordwell, Percy (1926), 'The Repeal of the Statute of Uses', Harvard Law Review, 39 (4), 466-84.

Bosker, Maarten, Buringh, Eltjo, and van Zanden, Jan Luiten (2013), 'From Baghdad to London: Unraveling Urban Development in Europe, the Middle East, and North Africa, 800-1800', Review of Economics & Statistics, 95 (4), 1418-37.

Botticini, Maristella and Eckstein, Zvi (2012), The Chosen Few: How Education Shaped Jewish History, 70-1492 (Princeton: Princeton University Press).

Brennan, Geoffrey and Buchanan, James M. (1980), The Power to Tax: Analytical Foundations of a Fiscal Constitution (Cambridge: Cambridge University Press).

Brenner, Reuven (1983), History - The Human Gamble (Chicago: University of Chicago Press).


www.KitaboSunnat.com

Brenner, Robert (1993), Merchants and Revolution: Commercial Change, Political Conflict, and London's Overseas Traders, 1550-1653 (Princeton: Princeton University Press).
Brenner, Y.S. (1961), 'The Inflation of Prices in Early Sixteenth Century England', Economic History Review, 14 (2), 225-39.
The British Library (2011), 'Incunabula Short Title Catalog (ISTC)', <www.bl.uk/ catalogues/istc/>, accessed September 9, 2016.
Browers, Michaelle (2004), 'Islam and Political Sinn: The Hermeneutics of Contemporary Islamic Reformists', in Michaelle Browers and Charles Kurzman (eds.), An Islamic Reformation? (Lanham: Lexington).
Burgess, Glenn (1992), 'The Divine Right of Kings Reconsidered', English Historical Review, 107 (425), 837-61.
Buringh, Eltjo and van Zanden, Jan Luiten (2009), 'Charting the "Rise of the West": Manuscripts and Printed Books in Europe, A Long-Term Perspective from the Sixth through Eighteenth Centuries', Journal of Economic History, 69 (2), 409-45.
Ça?atay, Ne?et (1970), 'Rib? and Interest Concept and Banking in the Ottoman Empire', Studia Islamica, 32, 53-68.
Cameron, Averil (1993), The Later Roman Empire: AD 284-430 (London: Fontana Press).
Cameron, Euan (1991), The European Reformation (Oxford: Oxford University Press).
Cameron, Rondo and Neal, Larry (2003), A Concise Economic History of the World: From Paleolithic Times to the Present (Oxford: Oxford University Press).
Cantoni, Davide (2012), 'Adopting a New Religion: The Case of Protestantism in 16th Century Germany', Economic Journal, 122 (560), 502-31.
Cantoni, Davide (2015), 'The Economic Effects of the Protestant Reformation: Testing the Weber Hypothesis in the German Lands', Journal of the European Economic Association, 13 (4), 561-98.
Carruthers, Bruce G. (1990), 'Politics, Popery, and Property: A Comment on North and Weingast', Journal of Economic History, 50 (3), 693-98.
Challis, C.E. (1967), 'The Debasement of the Coinage, 1542-1551', Economic History Review, 20 (3), 441-55.
Chaney, Eric (2013), 'Revolt on the Nile: Economic Shocks, Religion, and Political Power', Econometrica, 81 (5), 2033-53.
Chaney, Eric (2016), 'Religion and the Rise and Fall of Muslim Science', Harvard University Press Working Paper.
Chaudhary, Latika and Rubin, Jared (2011), 'Reading, Writing, and Religion: Institutions and Human Capital Formation', Journal of Comparative Economics, 39 (1), 17-33.
Chaudhary, Latika and Rubin, Jared (2016), 'Religious Identity and the Provision of Public Goods: Evidence from the Indian Princely States', Journal of Comparative Economics, 44 (3), 461-83.
Chilosi, David and Volckart, Oliver (2010), 'Books or Bullion? Printing, Mining and Financial Integration in Central Europe from the 1460s', LSE Working Paper 144/10.
Christ, Karl, Kern, Anton, and Otto, Theophil M. (1984), The Handbook of Medieval Library History (Metuchen, NJ: Scarecrow Press).
CIA (2014), 'The World Factbook' (Washington, DC).
Cipolla, Carlo M. (1967), Money, Prices, and Civilization in the Mediterranean World: Fifth to Seventeenth Century (New York: Gordian Press).
Çizakça, Murat (1995), 'Cash Waqfs of Bursa, 1555-1823', Journal of the Economic and Social History of the Orient, 38, 313-54.
Çizakça, Murat (2000), A History of Philanthropic Foundations: The Islamic World from the Seventh Century to the Present (Istanbul: Bogazici University Press).
Çizakça, Murat (2004), 'Ottoman Cash Waqfs Revisited: The Case of Bursa, 1555-1823', Foundation for Science, Technology and Civilization (June), 2-20.
Clair, Colin (1976), A History of European Printing (New York: Academic Press).
Clark, Gregory (1996), 'The Political Foundations of Modern Economic Growth: England, 1540-1800', Journal of Interdisciplinary History, 26 (4), 563-88.
Clark, Gregory (2007), A Farewell to Alms: A Brief Economic History of the World (Princeton: Princeton University Press).
Coleman-Norton, P.R. (1966), Roman State & Christian Church: A Collection of Legal Documents to A.D. 535 (London: S.P.C.K.).



Congleton, Roger D. (2011), Perfecting Parliament: Constitutional Reform, Liberalism, and the Rise of Western Democracy (Cambridge: Cambridge University Press).
Co?gel, Metin M. and Ergene, Bo?aç A. (2014), 'The Selection Bias in Court Records: Settlement and Trial in Eighteenth-Century Ottoman Kastamonu', Economic History Review, 67 (2), 517-34.
Co?gel, Metin M. and Miceli, Thomas J. (2005), 'Risk, Transaction Costs, and Government Finance: The Distribution of Tax Revenue in the Ottoman Empire', Journal of Economic History, 65 (3), 806-21.
Clark, Gregory (2009), 'State and Religion', Journal of Comparative Economics, 37, 402-16.
Co?gel, Metin M., Miceli, Thomas J., and Ahmed, Rasha (2009), 'Law, State Power, and Taxation in Islamic History', Journal of Economic Behavior and Organization, 71 (3), 704-17.
Co?gel, Metin M., Miceli, Thomas J., and Rubin, Jared (2012a), 'The Political Economy of Mass Printing: Legitimacy, Revolt, and Technology Change in the Ottoman Empire', Journal of Comparative Economics, 40 (3), 357-71.
Clark, Gregory (2012b), 'Political Legitimacy and Technology Adoption', Journal of Institutional and Theoretical Economics, 168 (3), 339-61.
Coulson, Noel J. (1969), Conflicts and Tensions in Islamic Jurisprudence (Chicago: University of Chicago Press).
Cox, Gary W. (2012), 'Was the Glorious Revolution a Constitutional Watershed?', Journal of Economic History, 72 (3), 567-600.
Cromer, Evelyn B. (1908), Modern Egypt, vol. 2 (London: Macmillan).
Crone, Patricia and Hinds, Martin (1986), God's Caliph: Religious Authority in the First Centuries of Islam (Cambridge: Cambridge University Press).
Curuk, Malik and Smulders, Sjak (2016), 'Malthus Meets Luther: The Economics Behind the German Reformation', CESifo Working Paper Series No. 6010.
Dale, Stephen F. (2010), The Muslim Empires of the Ottomans, Safavids, and Mughals (Cambridge: Cambridge University Press).
Danforth, Nick (2013), 'Stop Blaming Colonial Borders for the Middle East's Problems', The Atlantic, <www.theatlantic.com/international/archive/2013/09/stop-blaming-colonial-borders-forthe-middle-easts-problems/279561>.
David, Paul A. (1985), 'Clio and the Economics of QWERTY', American Economic Review, 75 (2), 332-37.
David, Paul A. (1994), 'Why Are Institutions the 'Carriers of History'?: Path Dependence and the Evolution of Conventions, Organizations, and Institutions', Structural Change and Economic Dynamics, 5, 205-20.
de Long, J. Bradford and Shleifer, Andrei (1993), 'Princes and Merchants: European City Growth before the Industrial Revolution', Journal of Law and Economics, 36 (2), 671-702.
de Roover, Raymond (1942), 'Money, Banking, and Credit in Medieval Bruges', Journal of Economic History, 2 (Supplement), 52-65.
de Roover, Raymond (1944), 'What Is Dry Exchange? A Contribution to the Study of English Mercantilism', Journal of Political Economy, 52, 250-66.
de Roover, Raymond (1946a), 'The Medici Bank Financial and Commercial Operations', Journal of Economic History, 6, 153-72.
de Roover, Raymond (1946b), 'The Medici Bank Organization and Management', Journal of Economic History, 6, 24-52.
de Roover, Raymond (1948), Money, Banking, and Credit in Mediæval Bruges (Cambridge, MA: Mediaeval Academy of America).
de Roover, Raymond (1963), The Rise and Decline of the Medici Bank: 1397-1494 (New York: W.W. Norton.).
de Vries, Jan (1984), European Urbanization 1500-1800 (Cambridge, MA: Harvard University Press).
de Vries, Jan (2000), 'Dutch Economic Growth in Comparative-Historical Perspective, 1500-2000', De Economist, 148 (4), 443-67.
de Vries, Jan and van der Woude, Ad (1997), The First Modern Economy: Success, Failure, and Perseverance of the Dutch Economy, 1500-1815 (Cambridge: Cambridge University Press).
Delacroix, Jacques and Nielsen, Francois (2001), 'The Beloved Myth: Protestantism and the Rise of Industrial Capitalism in Nineteenth-Century Europe', Social Forces, 80 (2), 509-53.

www.MashalBooks.org

Diamond, Jared (1997), Guns, Germs, and Steel: The Fates of Human Societies (New York: Norton).
Dickens, Arthur Geoffrey (1968), Reformation and Society in Sixteenth Century Europe (New York: Harcourt, Brace, & World).
Dickens, Arthur Geoffrey (1974), The German Nation and Martin Luther (New York: Harper).
Dien, M.Y. Izzi (1995), 'Suftadja', in C.E. Bosworth et al. (eds.), The Encyclopaedia of Islam: New Edition (Leiden: Brill).
Dincecco, Mark (2009), 'Fiscal Centralization, Limited Government, and Public Revenues in Europe', Journal of Economic History, 69 (1), 48-103.
Dincecco, Mark (2011), Political Transformations and Public Finances: Europe, 1650-1913 (Cambridge: Cambridge University Press).
Dincecco, Mark, Fenske, James, and Onorato, Massimiliano Gaetano (2016), 'Is Africa Different? Historical Conflict and State Development', CSAE Working Paper 2014-35.
Dittmar, Jeremiah (2011), 'Information Technology and Economic Change: The Impact of the Printing Press', Quarterly Journal of Economics, 126 (3), 1133-72.
Divine, Thomas F. (1959), Interest: An Historical and Analytical Study in Economics and Modern Ethics (Milwaukee: Marquette University Press.).
Djankov, Simon, et al. (2002), 'The Regulation of Entry', Quarterly Journal of Economics, 117 (1), 1-37.
Clark, Gregory (2003), 'Courts', Quarterly Journal of Economics, 118 (2), 453-517.
Dolan, John P. (1965), History of the Reformation: A Conciliatory Assessment of Opposite Views (New York: Desclee).
Dow, John (1922), 'Usury (Christian)', in James Hastings (ed.), Encyclopædia of Religion and Ethics, vol. 12 (New York: Charles Scribner's Sons).
Downey, Glanville (1969), The Late Roman Empire (New York: Holt, Rinehart and Winston).
Drelichman, Mauricio (2005a), 'All That Glitters: Precious Metals, Rent Seeking and the Decline of Spain', European Review of Economic History, 9 (3), 313-36.
Drelichman, Mauricio (2005b), 'The Curse of Moctezuma: American Silver and the Dutch Disease', Explorations in Economic History, 42 (3), 349-80.
Drelichman, Mauricio and Voth, Hans-Joachim (2011), 'Lending to the Borrower from Hell: Debt and Default in the Age of Philip II', Economic Journal, 121, 1205-27.
Dunn, Richard S. (1979), The Age of Religious Wars, 1559-1715 (New York: Norton).
Edwards, Mark U. (1994), Printing, Propaganda, and Martin Luther (Berkeley: University of California Press).
Eickelman, Dale F. (1998), 'Inside the Islamic Reformation', Wilson Quarterly, 22 (1), 80-89.
Einzig, Paul (1970), The History of Foreign Exchange, 2nd edn. (London: Macmillan).
Eisenstein, Elizabeth L. (1979), The Printing Press as an Agent of Change: Communications and Cultural Transformations in Early Modern Europe (Cambridge: Cambridge University Press).
Ekelund, Robert B., Hébert, Robert F., and Tollison, Robert D. (2002), 'An Economic Analysis of the Protestant Reformation', Journal of Political Economy, 110 (3), 646-71.
Ekelund, Robert B., et al. (1996), Sacred Trust: The Medieval Church as an Economic Firm (Oxford: Oxford University Press).
Elliott, John H. (1961), 'The Decline of Spain', Past & Present, 20, 52-75.
Engerman, Stanley L. and Sokoloff, Kenneth L. (1997), 'Factor Endowments, Institutions, and Differential Paths of Growth among New World Economies: A View from Economic Historians of the United States', in Stephen Haber (ed.), How Latin America Fell Behind: Essays on the Economic Histories of Brazil and Mexico, 1800-1914 (Stanford: Stanford University Press).
Engerman, Stanley L. and Sokoloff, Kenneth L. (2002), 'Factor Endowments, Inequality, and Paths of Development among New World Economies', NBER Working Paper 9259.
Ensminger, Jean (1997), 'Transaction Costs and Islam: Explaining Conversion in Africa', Journal of Institutional and Theoretical Economics, 153 (1), 4-29.
Febvre, Lucien and Martin, Henri-Jean (1958), The Coming of the Book: The Impact of Printing, 1450-1800 (London: Verso).
Feldman, Noah (2008), The Fall and Rise of the Islamic State (Princeton: Princeton University Press).
Feldman, Stephen M. (1997), Please Don't Wish Me a Merry Christmas: A Critical History of the



Separation of Church and State (New York: New York University Press).
Fierro, Maribel (1996), 'Caliphal Legitimacy and Expiation in al-Andalus', in Muhammad K. Masud, Brinkley Messick, and David S. Powers (eds.), Islamic Legal Interpretation: Muftis and their Fatwas (Cambridge, MA: Harvard University Press).
Findlay, Ronald and O'Rourke, Kevin H. (2007), Power and Plenty: Trade, War, and the World Economy in the Second Millennium (Princeton: Princeton University Press).
Finkel, Caroline (2005), Osman's Dream: The Story of the Ottoman Empire, 1300-1923 (London: Perseus).
Frazee, Charles A. (1983), Catholics and Sultans: The Church and the Ottoman Empire 1453-1923 (Cambridge: Cambridge University Press).
Friedman, David (1977), 'A Theory of the Size and Shape of Nations', Journal of Political Economy, 85 (1), 59-77.
Frierson, James G. (1969), 'Changing Concepts on Usury: Ancient Times through the Time of John Calvin', American Business Law Journal, 7, 115-25.
Fritschy, Wantje (2003), 'A 'Financial Revolution' Reconsidered: Public Finance in Holland during the Dutch Revolt, 1568-1648', Economic History Review, 56 (1), 57-89.
Gager, John G. (1975), Kingdom and Community: The Social World of Early Christianity (Englewood Cliffs: Prentice-Hall).
Galor, Oded (2011), Unified Growth Theory (Princeton: Princeton University Press).
Gelderblom, Oscar and Jonker, Joost (2004), 'Completing a Financial Revolution: The Finance of the Dutch East India Trade and the Rise of the Amsterdam Capital Market, 1595-1612', Journal of Economic History, 64 (3), 641-72.
Gelderblom, Oscar and Jonker, Joost (2005), 'Amsterdam as the Cradle of Modern Futures Trading and Options Trading, 1550-1650', in W.N. Goetzmann and K.G. Rouwenhorst (eds.), The Origins of Value. The Financial Innovations that Created Modern Capital Markets (Oxford: Oxford University Press).
Gelpi, Rosa-Maria and Julien-Labruyère, François (2000), The History of Consumer Credit: Doctrines and Practices (New York: St. Martin's).
Gennaioli, Nicola and Voth, Hans-Joachim (2015), 'State Capacity and Military Conflict', Review of Economic Studies, 83, 1-47.
Gerber, Haim (1988), Economy and Society in an Ottoman City: Bursa, 1600-1700 (Jerusalem: The Hebrew University).
Gerber, Haim (1999), Islamic Law and Culture 1600-1840 (Leiden: Brill).
Gilchrist, John (1969), The Church and Economic Activity in the Middle Ages (London: Macmillan).
Gill, Anthony (1998), Rendering Unto Caesar: The Catholic Church and the State in Latin America (Chicago: University of Chicago Press).
Gill, Anthony (2008), The Political Origins of Religious Liberty (Cambridge: Cambridge University Press).
Glaeser, Edward L. and Scheinkman, Jose (1998), 'Neither a Borrower nor a Lender Be: An Economic Analysis of Interest Restrictions and Usury Laws', Journal of Law and Economics, 41 (1), 1-36.
Glaeser, Edward L. and Shleifer, Andrei (2002), 'Legal Origins', Quarterly Journal of Economics, 117 (4), 1193-229.
Glaeser, Edward L., et al. (2004), 'Do Institutions Cause Growth?', Journal of Economic Growth, 9 (3), 271-303.
Göçek, Fatma Muge (1987), East Encounters West: France and the Ottoman Empire in the Eighteenth Century (Oxford: Oxford University Press).
Goitein, Shelomo D. (1967), A Mediterranean Society: The Jewish Communities of the Arab World as Portrayed in the Documents of the Cairo Geniza, vol. 1 (Berkeley: University of California Press).
Goldstone, Jack A. (2000), 'The Rise of the West - or Not? A Revision to Socio-economic History', Sociological Theory, 18 (2), 175-94.
Goodenough, Erwin R. (1931), The Church in the Roman Empire (New York: Henry Holt and Company).
Goody, Jack (1983), The Development of the Family and Marriage in Europe (Cambridge: Cambridge University Press).

www.MashalBooks.org

Grafe, Regina and Irigoin, Alejandra (2012), 'A Stakeholder Empire: The Political Economy of Spanish Imperial Rule in America', Economic History Review, 65 (2), 609-51.
Graves, Michael A.R. (1985), The Tudor Parliaments: Crown, Lords, and Commons, 1485-1603 (New York: Longman).
Greif, Avner (1993), 'Contract Enforceability and Economic Institutions in Early Trade: The Maghribi Traders' Coalition', American Economic Review, 83 (3), 525-48.
Greif, Avner (1994a), 'Cultural Beliefs and the Organization of Society: A Historical and Theoretical Reflection on Collectivist and Individualist Societies', Journal of Political Economy, 102 (5), 912-50.
Greif, Avner (1994b), 'On the Political Foundations of the Late Medieval Commercial Revolution: Genoa during the Twelfth and Thirteenth Centuries', Journal of Economic History, 54 (2), 271-87.
Greif, Avner (2002), 'The Islamic Equilibrium: Legitimacy and Political, Social, and Economic Outcomes', Mimeo.
Greif, Avner (2004), 'Impersonal Exchange without Impartial Law: The Community Responsibility System', Chicago Journal of International Law, 5 (1), 109-38.
Greif, Avner (2006a), 'Family Structure, Institutions, and Growth: The Origins and Implications of Western Corporations', American Economic Review, 96 (2), 308-12.
Greif, Avner (2006b), Institutions and the Path to the Modern Economy (Cambridge: Cambridge University Press).
Greif, Avner (2010), 'A Theory of Moral Authority: Moral Choices under Moral Networks Externalities', Mimeo.
Greif, Avner and Iyigun, Murat (2013), 'Social Organizations, Risk-Sharing Institutions and Industrialization', American Economic Review, 103 (3), 534-38.
Greif, Avner, Iyigun, Murat, and Sasson, Diego (2012), 'Social Institutions and Economic Growth: Why England and not China Became the First Modern Economy', Mimeo.
Greif, Avner, Milgrom, Paul, and Weingast, Barry R. (1994), 'Coordination, Commitment, and Enforcement: The Case of the Merchant Guild', Journal of Political Economy, 102 (4), 745-76.
Greif, Avner and Rubin, Jared (2015), 'Endogenous Political Legitimacy: The English Reformation and the Institutional Foundations of Limited Government', Mimeo.
Greif, Avner and Tabellini, Guido (2015), 'The Clan and the Corporation: Sustaining Cooperation in China and Europe', Stanford University working paper.
Greif, Avner and Tadelis, Steven (2010), 'A Theory of Moral Persistence: Crypto-Morality and Political Legitimacy', Journal of Comparative Economics, 38, 229-44.
Grice-Hutchinson, Marjorie (1978), Early Economic Thought in Spain, 1177-1740 (London: George Allen & Unwin).
Grier, Robin (1997), 'The Effect of Religion on Economic Development: A Cross National Study of 63 Former Colonies', Kyklos, 50 (1), 47-62.
Guiso, Luigi, Sapienza, Paola, and Zingales, Luigi (2003), 'People's Opium? Religion and Economic Attitudes', Journal of Monetary Economics, 50 (1), 225-82.
Guiso, Luigi, Sapienza, Paola, and Zingales, Luigi (2006), 'Does Culture Affect Economic Outcomes?', Journal of Economic Perspectives, 20 (2), 23-48.
Guiso, Luigi, Sapienza, Paola, and Zingales, Luigi (2009), 'Cultural Biases in Economic Exchange?', Quarterly Journal of Economics, 124 (3), 1095-131.
Guiso, Luigi, Sapienza, Paola, and Zingales, Luigi (2016), 'Long-Term Persistence', Journal of the European Economic Association, Forthcoming.
Hallaq, Wael B. (1984), 'Was the Gate of Ijtihad Closed?', International Journal of Middle East Studies, 16 (1), 3-41.
Hallaq, Wael B. (2001), Authority, Continuity, and Change in Islamic Law (Cambridge: Cambridge University Press).
Hallaq, Wael B. (2005), The Origins and Evolution of Islamic Law (Cambridge: Cambridge University Press).
Hamilton, Earl J. (1938), 'Revisions in Economic History: VIII. - The Decline of Spain', Economic History Review, 8 (2), 168-79.
Haskins, Charles Homer (1957), The Rise of Universities (Ithaca: Great Seal Books).
Hassan, Farooq (1981), The Concept of State and Law in Islam (Washington, DC: University Press of America).



Hefele, Charles Joseph ([1894] 1973), A History of the Christian Councils (New York: AMS Press).
Helmholz, Richard H. (1986), 'Usury and the Medieval English Church Courts', Speculum, 61 (2), 364-80.
Helpman, Elhanan (2004), The Mystery of Economic Growth (Cambridge, MA: Harvard University Press).
Hoffman, Philip T. (2011), 'Prices, the Military Revolution, and Western Europe's Comparative Advantage in Violence', Economic History Review, 64 (S1), 39-59.
Hoffman, Philip T. (2012), 'Why Was It Europeans Who Conquered the World?,' Journal of Economic History, 72 (3), 601-33.
Hoffman, Philip T. (2015), Why Did Europe Conquer the World? (Princeton: Princeton University Press).
Holborn, Louise W. (1942), 'Printing and the Growth of a Protestant Movement in Germany from 1517 to 1524', Church History, 11 (2), 123-37.
Holdsworth, W.S. (1912), 'The Political Causes which Shaped the Statute of Uses', Harvard Law Review, 26 (2), 108-27.
Homer, Sidney and Sylla, Richard (1991), A History of Interest Rates (3rd edn.; New Brunswick: Rutgers University Press).
Hourani, Albert (1981), 'Ottoman Reform and the Politics of Notables', in Albert Hourani (ed.), Emergence of the Modern Middle East (Berkeley: University of California Press), 36-66.
Hourani, Albert (1991), A History of the Arab Peoples (Cambridge, MA: Harvard University Press).
Howorth, Jolyon (2014), 'Explainer: Why a Century-old Deal between Britain and France got ISIS Jihadis Excited', The Conversation, <http://theconversation.com/explainer-why-a-century-old-dealbetween-britain-and-france-got-isis-jihadis-excited-28643>.
Hunt, Alice (2008), The Drama of the Coronation: Medieval Ceremony in Early Modern England (Cambridge: Cambridge University Press).
Hunt, Edwin S. and Murray, James M. (1999), A History of Business in Medieval Europe, 1200-1550 (Cambridge: Cambridge University Press).
Hyma, Albert (1938), Christianity and Politics: A History of the Principles and Struggles of Church and State (Philadelphia: J.B. Lippincott).
Iannaccone, Laurence R. (1998), 'Introduction to the Economics of Religion', Journal of Economic Literature, 36 (3), 1465-95.
Ignatius, David (2014), 'Rethinking Woodrow Wilson's 14 Points', The Washington Post, <www.washingtonpost.com/opinions/david-ignatius-rethinking-woodrow-wilsons-14-points/2014/07/08/809c20b0-06c1-11e4-a0dd-f2b22a257353_story.html>.
Imber, Colin (1997), Ebu's-su'ud: The Islamic Legal Tradition (Stanford: Stanford University Press).
IMF (2012), 'World Economic Outlook Database'.
?nalc?k, Halil (1973), The Ottoman Empire (New York: Praeger).
Irigoin, Alejandra and Grafe, Regina (2008), 'Bargaining for Absolutism: A Spanish Path to Nation-State and Empire Building', Hispanic American Historical Review, 88 (2), 173-209.
Irigoin, Alejandra and Grafe, Regina (2013), 'Bounded Leviathan: Fiscal Constraints and Financial Development in the Early Modern Hispanic World', in D'Maris Coffman, Adrian Leonard, and Larry Neal (eds.), Questioning Credible Commitment: Perspectives on the Rise of Financial Capitalism (Cambridge: Cambridge University Press).
Israel, Jonathan I. (1995), The Dutch Republic: Its Rise, Greatness, and Fall 1477-1806 (Oxford: Oxford University Press).
Ives, E.W. (1967), 'The Genesis of the Statute of Uses', English Historical Review, 82 (325), 673-97.
Iyer, Sriya (2016), 'The New Economics of Religion', Journal of Economic Literature, 54 (2), 395-441.
Iyigun, Murat (2008), 'Luther and Suleyman', Quarterly Journal of Economics, 123 (4), 1465-94.
Iyigun, Murat (2010), 'Monotheism (From a Sociopolitical & Economic Perspective)', University of Colorado Working Paper.
Iyigun, Murat (2015), War, Peace, and Prosperity in the Name of God: The Ottoman Role in

Europe's Socioeconomic Evolution (Chicago: University of Chicago Press).
Jacob, Marcus (2010), 'Long-Term Persistence: The Free and Imperial City Experience in Germany', SSRN Working Paper.
Jennings, Ronald C. (1973), 'Loans and Credit in Early 17th Century Ottoman Judicial Records: The Sharia Court of Anatolian Kayseri', Journal of the Economic and Social History of the Orient, 16 (2-3), 168-216.
Jha, Saumitra (2013), 'Trade, Institutions and Ethnic Tolerance: Evidence from South Asia', American Political Science Review, 107 (4), 806-32.
Johns, Adrian (1998), The Nature of the Book: Print and Knowledge in the Making (Chicago: University of Chicago Press).
Johnson, Noel D. and Koyama, Mark (2014), 'Taxes, Lawyers, and the Decline of Witch Trials in France', Journal of Law and Economics, 57 (1), 77-112.
Johnson, Paul (1976), A History of Christianity (New York: Simon & Schuster).
Johnson, Todd M. and Grim, Brian J. (2008), 'World Religion Database', (Leiden and Boston: Brill).
Jones, A.H.M. (1949), Constantine and the Conversion of Europe (London: Macmillan).
Jones, A.H.M. (1964), The Later Roman Empire 284-602 (Norman: University of Oklahoma Press).
Jones, Eric L. (1981), The European Miracle: Environments, Economics, and Geopolitics in the History of Europe and Asia (Cambridge: Cambridge University Press).
Jones, Eric L. (1988), Growth Recurring: Economic Change in World History (Oxford: Clarendon Press).
Jones, Philip (1997), The Italian City-State: From Commune to Signoria (Oxford: Clarendon Press).
Kamen, Henry (1978), 'The Decline of Spain: A Historical Myth?', Past & Present, 81, 24-50.
Kamen, Henry (1988), Golden Age Spain (New York: Palgrave Macmillan).
Kamen, Henry (2003), Empire: How Spain Became a World Power, 1492-1763 (New York: HarperCollins).
Karaman, K?vanç (2009), 'Decentralized Coercion and Self-Restraint in Provincial Taxation: The Ottoman Empire, 15th-16th centuries', Journal of Economic Behavior & Organization, 71 (3), 690-703.
Karaman, K?vanç and Pamuk, ?evket (2010), 'Ottoman State Finances in European Perspective, 1500-1914', Journal of Economic History, 70 (3), 593-629.
Clark, Gregory (2013), 'Different Paths to the Modern State in Europe: The Interaction between Warfare, Economic Structure, and Political Regime', American Political Science Review, 107 (3), 603-26.
Kennedy, Paul M. (1987), The Rise and Fall of the Great Powers: Economic Change and Military Conflict from 1500 to 2000 (New York: Random House).
Kerridge, Eric (2002), Usury, Interest, and the Reformation (Burlington: Ashgate).
Kertcher, Zack and Margalit, Ainat N. (2006), 'Challenges to Authority, Burdens of Legitimization: The Printing Press and the Internet', Yale Journal of Law and Technology, 8 (1), 1-31.
Khan, Mir S.A. (1929), 'The Mohammedan Laws against Usury and How They Are Evaded', Journal of Comparative Legislation and International Law, 11, 233-44.
Kim, Hyojoung and Pfaff, Steven (2012), 'Structure and Dynamics of Religious Insurgency: Students and the Spread of the Reformation', American Sociological Review, 77 (2), 188-215.
Kindleberger, Charles P. (1980), 'Review of The Dawn of Modern Banking by the Center for Medieval and Renaissance Studies', Journal of Political Economy, 88 (1), 217-19.
Ko, Chiu Yu, Koyama, Mark, and Sng, Tuan-Hwee (2016), 'Unified China; Divided Europe', International Economic Review, Forthcoming.
Kohn, Meir (1999), 'Bills of Exchange and the Money Market to 1600', SSRN working paper.
Koyama, Mark (2010), 'Evading the 'Taint of Usury': Complex Contracts and Segmented Capital Markets', Explorations in Economic History, 47 (4), 420-42.
Kuran, Timur (1986), 'The Economic System in Contemporary Islamic Thought: Interpretation and Assessment', International Journal of Middle East Studies, 18, 135-64.
Kuran, Timur (1995), Private Truths, Public Lies: The Social Consequences of Preference Falsification (Cambridge, MA: Harvard University Press).
Kuran, Timur (1997), 'Islam and Underdevelopment: An Old Puzzle Revisited', Journal of



Institutional and Theoretical Economics, 153 (1), 41-71.
Kuran, Timur (2001), 'The Provision of Public Goods under Islamic Law: Origins, Impact, and Limitations of the Waqf System', Law and Society Review, 35 (4), 841-97.
Kuran, Timur (2004a), 'The Economic Ascent of the Middle East's Religious Minorities: The Role of Islamic Legal Pluralism', Journal of Legal Studies, 33, 475-515.
Kuran, Timur (2004b), 'Why the Middle East is Economically Underdeveloped: Historical Mechanisms of Institutional Stagnation', Journal of Economic Perspectives, 18 (3), 71-90.
Kuran, Timur (2005a), Islam and Mammon: The Economic Predicaments of Islamism (Princeton: Princeton University Press).
Kuran, Timur (2005b), 'The Absence of the Corporation in Islamic Law: Origins and Persistence', The American Journal of Comparative Law, 53, 785-834.
Kuran, Timur (2005c), 'The Logic of Financial Westernization in the Middle East', Journal of Economic Behavior and Organization, 56, 593-615.
Kuran, Timur (2011), The Long Divergence: How Islamic Law Held Back the Middle East (Princeton: Princeton University Press).
Kuran, Timur (ed.) (2013), Social and Economic Life in Seventeenth-Century Istanbul: Glimpses from Court Records, vols. 9-10 (Istanbul: ?? Bankas? Kültür Yay?nlar?).
Kuran, Timur and Lustig, Scott (2012), 'Judicial Biases in Ottoman Istanbul: Islamic Justice and its Compatibility with Modern Economic Life', Journal of Law and Economics, 55 (3), 631-66.
Kuran, Timur and Rubin, Jared (in press), 'The Financial Power of the Powerless: Socio-Economic Status and Interest Rates under Partial Rule of Law', Economic Journal, Forthcoming.
Kurzman, Charles and Browers, Michaelle (2004), 'Introduction: Comparing Reformations', in Michaelle Browers and Charles Kurzman (eds.), An Islamic Reformation? (Lanham: Lexington).
La Porta, Rafael, Lopez-de-Silanes, Florencio, and Shleifer, Andrei (2008), 'The Economic Consequences of Legal Origins', Journal of Economic Literature, 46 (2), 285-332.
La Porta, Rafael, et al. (1997), 'Legal Determinants of External Finance', Journal of Finance, 52 (3), 1131-50.
La Porta, Rafael (1998), 'Law and Finance', Journal of Political Economy, 106 (6), 1113-55.
La Porta, Rafael (1999), 'The Quality of Government', Journal of Law, Economics, & Organization, 15 (1), 222-79.
Labib, Subhi Y. (1969), 'Capitalism in Medieval Islam', Journal of Economic History, 29, 79-96.
Lagerlöf, Nils-Peter (2014), 'Population, Technology and Fragmentation: The European Miracle Revisited', Journal of Development Economics, 108, 87-105.
Landes, David S. (1998), The Wealth and Poverty of Nations: Why Some Are So Rich and Some So Poor (New York: Norton).
Lane, Frederic C. (1966), Venice and History: The Collected Papers of Frederic C. Lane (Baltimore: Johns Hopkins Press).
le Goff, Jacques (1979), 'The Usurer and Purgatory', in Center for Medieval and Renaissance Studies (ed.), The Dawn of Modern Banking (New Haven: Yale University Press).
Lewis, Bernard (1988), Your Money or Your Life: Economy and Religion in the Middle Ages (Cambridge, MA: MIT Press).
Levi, Margaret (1988), Of Rule and Revenue (Berkeley: University of California Press).
Lewis, Bernard (1974), Islam: From the Prophet Muhammad to the Capture of Constantinople (New York: Harper & Row).
Lewis, Bernard (1982), The Muslim Discovery of Europe (New York: Norton).
Lewis, Bernard (1993), The Arabs in History (Oxford: Oxford University Press).
Lewis, Bernard (1995), The Middle East (New York: Scribner).
Lewis, Bernard (2002), What Went Wrong? The Clash between Islam and Modernity in the Middle East (New York: HarperCollins).
Lieber, Alfred E. (1968), 'Eastern Business Practices and Medieval European Commerce', Economic History Review, 21, 230-43.
Lipset, Seymour Martin (1959), 'Some Social Requisites of Democracy: Economic Development and Political Legitimacy', American Political Science Review, 53 (1), 69-105.
Lopez, Robert S. (1971), The Commercial Revolution of the Middle Ages, 950-1350 (Cambridge: Cambridge University Press).
Love, Harold (1993), Scribal Publication in Seventeenth-Century England (Oxford: Oxford

www.MashalBooks.org

University Press).
Lucas, Robert (1988), 'On the Mechanics of Economic Development', Journal of Monetary Economics, 22 (1), 3-42.
Lynch, John (1991), Spain 1516-1598: From Nation State to World Empire (Malden: Blackwell).
Makowsky, Michael and Rubin, Jared (2013), 'An Agent-Based Model of Centralized Institutions, Social Network Technology, and Revolution', PLoS ONE, 8 (11), e80380.
Maloney, Robert P. (1973), 'The Teaching of the Fathers on Usury: An Historical Study on the Development of Christian Thinking', Vigiliae Christianae, 27, 241-65.
Mandaville, Jon E. (1979), 'Usurious Piety: The Cash Waqf Controversy in the Ottoman Empire', International Journal of Middle East Studies, 10 (3), 289-308.
Mann, Michael (1986), The Sources of Social Power: A History of Power from the Beginning to A.D. 1760 (Cambridge: Cambridge University Press).
Marshall, Monty G. and Cole, Benjamin R. (2014), Global Report 2014: Conflict, Governance, and State Fragility (Vienna, VA: Center for Systemic Peace).
Masud, Muhammad K., Messick, Brinkley, and Powers, David S. (1996), 'Muftis, Fatwas, and Islamic Legal Interpretation', in M.K. Masud, B. Messick, and D.S. Powers (eds.), Islamic Legal Interpretation: Muftis and their Fatwas (Cambridge, MA: Harvard University Press).
McCloskey, Deirdre (2010), Bourgeois Dignity: Why Economics Can't Explain the Modern World (Chicago: University of Chicago Press).
McCusker, John J. (2005), 'The Demise of Distance: The Business Press and the Origins of the Information Revolution in the Early Modern Atlantic World', American Historical Review, 110 (2), 295-321.
Meyersson, Erik (2013), 'Islamic Rule and the Emancipation of the Poor and Pious', Econometrica, 82 (1), 229-69.
Mez, Adam (1937), Die Renaissance des Islam, trans. S. Khuda Bukhsh and D.S. Margoliouth (London: Luzac & Co.).
Michalopoulos, Stelios, Naghavi, Alireza, and Prarolo, Giovanni (2015), 'Trade and Geography in the Spread of Islam', NBER working paper 18438.
Milgrom, Paul R., North, Douglass C., and Weingast, Barry R. (1990), 'The Role of Institutions in the Revival of Trade: The Law Merchant, Private Judges, and the Champagne Fairs', Economics and Politics, 2 (1), 1-23.
Mokyr, Joel (1990), The Lever of Riches (Oxford: Oxford University Press).
Mokyr, Joel (2002), The Gifts of Athena: Historical Origins of the Knowledge Economy (Princeton: Princeton University Press).
Mokyr, Joel (2009), The Enlightened Economy: Britain and the Industrial Revolution 1700-1850 (New Haven: Yale University Press).
Mueller, Reinhold (1997), The Venetian Money Market: Banks, Panics, and the Public Debt, 1200-1500 (Baltimore: Johns Hopkins University Press).
Munro, John (2003), 'The Medieval Origins of the Financial Revolution: Usury, Rentes, and Negotiablity', The International History Review, 25 (3), 505-62.
Munro, John (2008), 'The Usury Doctrine and Urban Public Finances in Late-Medieval Flanders (1220-1550): Rentes (Annuities), Excise Taxes, and Income Transfers from the Poor to the Rich', in S. Cavaciocchi (ed.), Fiscal Systems in the European Economy from the 13th to the 18th Centuries, vol. 39 (Florence: University of Florence Press).
Munro, John (2011), 'The Coinages and Monetary Policies of Henry VIII (r. 1509-47)', in James Estes (ed.), The Collected Works of Erasmus: The Correspondence of Erasmus, Vol. 14: Letters 1926 to 2081, A.D. 1528 (Toronto: University of Toronto Press), 423-76.
Munro, John (2012), 'Usury, Calvinism, and Credit in Protestant England: From the Sixteenth Century to the Industrial Revolution', in Francesco Ammannati (ed.), Religion and Religious Institutions in the European Economy, 1000-1800 (Florence: Firenze University Press), 155-84.
Mystakidis, B.A. (1911), 'Hükümet-i Osmaniye Taraf?ndan ?lk Tesis Olunan Matbaa ve Bunun Sirayeti', Türk Tarih Encümeni Dergisi, 1.
Needham, Joseph (1954), Science and Civilization in China, vol. 1 (Cambridge: Cambridge University Press).
Noland, Marcus (2005), 'Religion and Economic Performance', World Development, 33 (8), 1215-32.



Noonan, John T. (1957), The Scholastic Analysis of Usury (Cambridge, MA: Harvard University Press).
Noonan, John T. (1966), 'Authority, Usury, and Contraception', Cross Currents, 16 (1), 55-79.
Noonan, John T. (1993), 'Development in Moral Doctrine', Theological Studies, 54, 662-77.
Noonan, John T. (2005), A Church That Can and Cannot Change (Notre Dame: University of Notre Dame Press).
North, Douglass C. (1981), Structure and Change in Economic History (New York: Norton).
North, Douglass C. (1990), Institutions, Institutional Change and Economic Performance (Cambridge: Cambridge University Press).
North, Douglass C. and Thomas, Robert P. (1971), 'The Rise and Fall of the Manorial System: A Theoretical Model', Journal of Economic History, 31 (4), 777-803.
North, Douglass C. and Thomas, Robert P. (1973), The Rise of the Western World: A New Economic History (Cambridge: Cambridge University Press).
North, Douglass C., Wallis, John Joseph, and Weingast, Barry R. (2009), Violence and Social Orders: A Conceptual Framework for Interpreting Recorded Human History (Cambridge: Cambridge University Press).
North, Douglass C. and Weingast, Barry R. (1989), 'Constitutions and Commitment: The Evolution of Institutional Governing Public Choice in Seventeenth-Century England', Journal of Economic History, 49 (4), 803-32.
Opwis, Felicitas (2004), 'Changes in Modern Islamic Legal Theory: Reform or Reformation?', in Michaelle Browers and Charles Kurzman (eds.), An Islamic Reformation? (Lanham: Lexington).
Osman, O. (2013), 'Why Border Lines Drawn with a Ruler in WW1 Still Rock the Middle East', BBC News, <www.bbc.com/news/world-middle-east-25299553>.
Ostrom, Elinor (1990), Governing the Commons: The Evolution of Institutions for Collective Action (Cambridge: Cambridge University Press).
Ostrom, Elinor (2005), Understanding Institutional Diversity (Princeton: Princeton University Press).
Özkaya, Yücel (1994), Osmanli Imparatorlugu'nda Ayânlik (Ankara: Türk Tarih Kurumu Basimevi).
Özmucur, Süleyman and Pamuk, ?evket (2002), 'Real Wages and Standards of Living in the Ottoman Empire, 1489-1914', Journal of Economic History, 62 (2), 293-321.
Pamuk, ?evket (2000), A Monetary History of the Ottoman Empire (Cambridge: Cambridge University Press).
Ostrom, Elinor (2004a), 'The Evolution of Financial Institutions in the Ottoman Empire, 1600-1914', Financial History Review, 11 (1), 7-32.
Ostrom, Elinor (2004b), 'Institutional Change and the Longevity of the Ottoman Empire, 1500-1800', Journal of Interdisciplinary History, 35, 225-47.
Ostrom, Elinor (2011), 'Real Wages and GDP Per Capita Estimates for the Middle East, 700 to 1800', mimeo.
Parker, Geoffrey (1973), 'Mutiny and Discontent in the Spanish Army of Flanders 1572-1607', Past & Present, 58, 38-52.
Parker, Geoffrey (1977), The Dutch Revolt (London: Penguin).
Pascali, Luigi (2016), 'Banks and Development: Jewish Communities in the Italian Renaissance and Current Economic Performance', Review of Economics & Statistics, 98 (1), 140-58.
Pedersen, Johannes (1984), The Arabic Book, trans. Geoffrey French (Princeton: Princeton University Press).
Pfaff, Steven and Corcoran, Katie E. (2012), 'Piety, Power, and the Purse: Religious Economies Theory and Urban Reform in the Holy Roman Empire', Journal for the Scientific Study of Religion, 51 (4), 757-76.
Pincus, Steven C.A. and Robinson, James (2014), 'What Really Happened During the Glorious Revolution?', in Sebastian Galiani and Itai Sened (eds.), Institutions, Property Rights, and Economic Growth: The Legacy of Douglass North (Cambridge: Cambridge University Press).
Pirenne, Henri (1925), Medieval Cities: Their Origins and the Revival of Trade (New York: Doubleday Anchor Books).
Pirenne, Henri (1937), Economic and Social History of Medieval Europe (New York: Harcourt, Brace, and Company).

Platteau, Jean-Philippe (2011), 'Political Instrumentalization of Islam and the Risk of Obscurantist Deadlock', World Development, 39 (2), 243-60.
Pomeranz, Kenneth L. (2000), The Great Divergence: China, Europe, and the Making of the Modern World Economy (Princeton: Princeton University Press).
Posner, Richard A. (1980), 'A Theory of Primitive Society, with Special Reference to Law', Journal of Law and Economics, 23, 1-53.
Priest, Claire (2006), 'Creating an American Property Law: Alienability and its Limits in American History', Harvard Law Review, 120 (2), 385-458.
Putnam, Robert D. (1993), Making Democracy Work: Civic Traditions in Modern Italy (Princeton: Princeton University Press).
Quataert, Donald (2000), The Ottoman Empire, 1700-1922 (Cambridge: Cambridge University Press).
Quinn, Stephen (2001), 'The Glorious Revolution's Effect on English Private Finance: A Microhistory, 1680-1705', Journal of Economic History, 61 (3), 593-615.
Rahman, Fazlur (1964), 'Rib? and Interest', Islamic Studies, 3, 1-43.
Ray, Nicholas D. (1997), 'The Medieval Islamic System of Credit and Banking: Legal and Historical Considerations', Arab Law Quarterly, 12, 43-90.
Razi, G. Hossein (1990), 'Legitimacy, Religion, and Nationalism in the Middle East', American Political Science Review, 84 (1), 69-91.
Reed, Clyde G. and Bekar, Cliff T. (2003), 'Religious Prohibitions Against Usury', Explorations in Economic History, 40, 347-68.
Robinson, Francis (1993), 'Technology and Religious Change: Islam and the Impact of Print', Modern Asian Studies, 27 (1), 229-51.
Rodinson, Maxime (1973), Islam and Capitalism (Austin: University of Texas Press).
Rodrik, Dani, Subramanian, Arvind, and Trebbi, Francesco (2004), 'Institutions Rule: The Primacy of Institutions Over Geography and Integration in Economic Development', Journal of Economic Growth, 9, 131-65.
Romer, Paul M. (1986), 'Increasing Returns and Long-Run Growth', Journal of Political Economy, 94 (5), 1002-37.
Rubin, Jared (2009), 'Social Insurance, Commitment, and the Origin of Law: An Economic Theory of the Emergence of Interest Bans', Journal of Law and Economics, 52 (4), 761-77.
Rubin, Jared (2010), 'Bills of Exchange, Interest Bans, and Impersonal Exchange in Islam and Christianity', Explorations in Economic History, 47 (2), 213-27.
Rubin, Jared (2011), 'Institutions, the Rise of Commerce, and the Persistence of Laws: Interest Restrictions in Islam & Christianity', Economic Journal, 557, 1310-39.
Rubin, Jared (2012), 'Trade and Commerce', in Gerhard Bowering et al. (eds.), Encyclopedia of Islamic Political Thought (Princeton: Princeton University Press).
Rubin, Jared (2014a), 'Centralized Institutions and Cascades', Journal of Comparative Economics, 42 (2), 340-57.
Rubin, Jared (2014b), 'Printing and Protestants: An Empirical Test of the Role of Printing in the Reformation', Review of Economics & Statistics, 96 (2), 270-86.
Sachs, Jeffrey D. (2001), 'Tropical Underdevelopment', NBER Working Paper 8119.
Said, Edward (1978), Orientalism (New York: Pantheon Books).
Sardar, Ziauddin (1993), 'Paper, Printing, and Compact Disks: The Making and Unmaking of Islamic Culture', Media, Culture & Society, 15, 43-59.
Savage-Smith, Emilie (2003), 'Islam', in R. Porter (ed.), The Cambridge History of Science. Vol. 4. Eighteenth-Century Science (Cambridge: Cambridge University Press).
Sazak, Selim Can (2014), 'Good Riddance to Sykes-Picot', The National Interest, <http://nationalinterest.org/commentary/good-riddance-sykes-picot-9868>.
Schachner, Nathan (1962), The Mediaeval Universities (New York: A.S. Barnes).
Schacht, Joseph (1964), An Introduction to Islamic Law (Oxford: Oxford University Press).
Schacht, Joseph (1995), 'Rib?', in C.E. Bosworth et al. (eds.), The Encyclopaedia of Islam: New Edition (Leiden: Brill).
Schacht, Joseph (2006), 'Hiyal', Encyclopaedia of Islam Online Edition (2nd edn.).
Scribner, R.W. (1989), 'Oral Culture and the Transmission of Reformation Ideas', in Helga Robinson-Hammerstein (ed.), The Transmission of Ideas in the Lutheran Reformation (Dublin: Irish



Academic Press).
Simpson, Lesley Byrd (1956), 'The Cortes of Castile', The Americas, 12 (3), 223-33.
Sokoloff, Kenneth L. and Engerman, Stanley L. (2000), 'History Lessons: Institutions, Factor Endowments, and Paths of Development in the New World', Journal of Economic Perspectives, 14 (3), 217-32.
Sombart, Werner (1967 [1913]), Luxury and Capitalism (Ann Arbor: University of Michigan Press).
Spenkuch, Jörg L. (2016), 'Religion and Work: Micro Evidence from Contemporary Germany', Northwestern University working paper.
Spitz, Lewis S. (1985), The Protestant Reformation, 1517-1559 (New York: Harper & Row).
Stark, Rodney (1996), The Rise of Christianity (Princeton: Princeton University Press).
Stark, Rodney and Bainbridge, William Sims (1985), The Future of Religion: Secularization, Revival, and Cult Formation (Berkeley and Los Angeles: University of California Press).
Stasavage, David (2014), 'Was Weber Right? The Role of Urban Autonomy in Europe's Rise', American Political Science Review, 108 (2), 337-54.
Sussman, Nathan and Yafeh, Yishay (2006), 'Institutional Reforms, Financial Development, and Sovereign Debt: Britain 1690-1790', Journal of Economic History, 66 (4), 906-35.
Swetz, Frank J. (1987), Capitalism & Arithmetic: The New Math of the 15th Century (La Salle: Open Court).
Tabellini, Guido (2010), 'Culture and Institutions: Economic Development in the Regions of Europe', Journal of the European Economic Association, 8 (4), 677-716.
Tawney, Richard H. (1926 [1954]), Religion and the Rise of Capitalism (New York: Mentor).
Tekiner, Efdaleddin (1916), 'Memâlik-i Osmaniye'de T?bâatim K?demi', Türk Tarih Encümeni Dergisi, 7, 242-49.
Tierney, Brian (1988), The Crisis of Church and State 1050-1300 (Toronto: University of Toronto Press).
Tierney, Brian and Painter, Sidney (1992), Western Europe in the Middle Ages, 300-1475, 5th edn. (New York: McGraw-Hill).Tilly, Charles (1975), 'Reflections on the History of European State-Making', in Charles Tilly (ed.),
The Formation of States in Western Europe (Princeton: Princeton University Press), 3-83.
Tilly, Charles (1990), Coercion, Capital, and European States, AD 990-1990 (Oxford: Blackwell).
Turchin, Peter, Hall, Thomas D., and Adams, Jonathan M. (2006), 'East-West Orientation of Historical Empires and Modern States', Journal of World-Systems Research, 12 (2), 219-29.
Udovitch, Abraham L. (1970), Partnership and Profit in Medieval Islam (Princeton: Princeton University Press).
Udovitch, Abraham L. (1975), 'Reflections on the Institutions of Credits and Banking in the Medieval Islamic Near East', Studia Islamica, 41, 5-21.
Udovitch, Abraham L. (1979), 'Bankers without Banks: Commerce, Banking, and Society in the Islamic World of the Middle Ages', in Center for Medieval and Renaissance Studies (ed.), The Dawn of Modern Banking (New Haven: Yale University Press), 255-73.
United Nations Development Program (2014), 'Human Development Report'.
Usher, Abbott Payson (1914), 'The Origin of the Bill of Exchange', Journal of Political Economy, 22, 566-76.
van Bavel, Bas (2003), 'Early Proto-Industrialization in the Low Countries? The Importance and Nature of Market-Oriented Non-Agricultural Activities on the Countryside in Flanders and Holland, c. 1250-1570', Revue belge de philology et d'histoire, 81 (4), 1109-65.
van Bavel, Bas, Buringh, Eltjo, and Dijkman, Jessica (2015), 'Immovable Capital Goods in Medieval Muslim Lands: Why Water-Mills and Building Cranes Went Missing', Utrecht University Working Paper.
van Gelderen, Martin (1992), The Political Thought of the Dutch Revolt, 1555-1590 (Cambridge: Cambridge University Press).
van Zanden, Jan Luiten (2002a), 'The 'Revolt of the Early Modernists' and the 'First Modern Economy': An Assessment', Economic History Review, 55 (4), 619-41.
van Zanden, Jan Luiten (2002b), 'Taking the Measure of the Early Modern Economy: Historical National Accounts for Holland in 1510/14', European Review of Economic History, 6, 131-63.
van Zanden, Jan Luiten (2009), The Long Road to the Industrial Revolution: The European Economy in a Global Perspective, 1000-1800, eds. Maarten Prak and Jan Luiten van Zanden

www.mashalbooks.org

(Global Economic History Series; Leiden: Brill).
van Zanden, Jan Luiten, Buringh, Eltjo, and Bosker, Maarten (2012), 'The Rise and Decline of European Parliaments, 1188-1789', Economic History Review, 65 (3), 835-61.
van Zanden, Jan Luiten and Prak, Maarten (2006), 'Towards an Economic Interpretation of Citizenship: The Dutch Republic between Medieval Communes and Modern Nation-States', European Review of Economic History, 10, 111-45.
van Zanden, Jan Luiten, Zuijderduijn, Jaco, and de Moor, Tine (2012), 'Small is Beautiful: The Efficiency of Credit Markets in Late Medieval Holland', European Review of Economic History, 16, 3-22.
von Grunebaum, Gustave E. (1966), Medieval Islam: A Study in Cultural Orientation (Chicago: University of Chicago Press).
Wallis, John Joseph and North, Douglass C. (2014), 'Leviathan Denied: Rules, Governments, and Social Dynamics', Mimeo.
Watson, Andrew W. (1983), Agricultural Revolution in the Early Islamic World: The Diffusion of Crops and Farming Techniques 700-1100 (Cambridge: Cambridge University Press).
Watt, W. Montgomery (1988), Islamic Fundamentalism and Modernity (London: Routledge).
Weber, Max (1905 [2002]), The Protestant Ethic and the 'Spirit' of Capitalism (New York: Penguin).
Weber, Max (1922), Economy and Society: An Outline of Interpretive Sociology (Berkeley: University of California Press).
Weber, Nicholas (1912), 'Waldenses', The Catholic Encyclopedia, vol. 15 (New York: Robert Appleton Company).
Weiss, Bernard (1978), 'Interpretation in Islamic Law: The Theory of Ijtihad', American Journal of Comparative Law, 26 (2), 199-212.
Wells, John and Wills, Douglas (2000), 'Revolution, Restoration, and Debt Repudiation: The Jacobite Threat to England's Institutions and Economic Growth', Journal of Economic History, 60 (2), 418-41.
Westcott, Mark (2013), 'Muslims and Minorities: Religion and City Growth in the Ottoman Empire', Mimeo.
Wilhelm, Joseph (1910), 'Jan Hus', The Catholic Encyclopedia, vol. 7 (New York: Robert Appleton Company).
Williamson, Oliver E. (1985), The Economic Institutions of Capitalism (New York: Free Press).
Williamson, Oliver E. (2000), 'The New Institutional Economics: Taking Stock, Looking Ahead', Journal of Economic Literature, 38 (3), 595-613.
Wintrobe, Ronald (1998), The Political Economy of Dictatorship (Cambridge: Cambridge University Press).
World Bank (2014), World Development Indicators: GDP Per Capita (Current US$) (Washington, DC: World Bank).
Young, Cristobal (2009), 'Religion and Economic Growth in Western Europe: 1500-2000', Stanford University working paper.
Zilfi, Madeline C. (1988), The Politics of Piety: The Ottoman Ulema in the Postclassical Age (1600-1800) (Minneapolis: Bibliotheca Islamica).



www.MashalBooks.org

اسلامی بنیاد پرستی کا عروج اور پھیلاؤ ممکن طور پر بیسویں صدی کی زندہ رہنے والی کہانیوں میں سے ایک ہوگا۔ اس کو روکنے کا بہترین طریقہ..... بلاشبہ کسی بھی قسم کی انتہا پسندی کو روکنے کا بہترین طریقہ..... معاشی ترقی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انتہا پسندانہ خیالات، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیکولر، اُس وقت بہت زیادہ پُرکشش ہوتے ہیں جب ایک بہتر مستقبل کی بہت کم اُمید ہو۔ ایسے خیالات، اور اُن کو بروئے کار لانے والی شدید انتہا پسندانہ تراکیب ایک ایسی دُنیا کی ذیلی پیداوار ہیں جو معاشی طور پر پیچھے رہ گئی ہے..... یہ کتاب ہمیں ایسے معاشی جمود کے ذرائع کو سمجھنے کے لئے ایک قدم قریب تر لے جائے گی، جبکہ یہ اس بات پر بھی کچھ روشنی ڈالے گی کہ، مشرقِ وسطیٰ میں کونسا راستہ ایک طویل مدتی مستقل معاشی ترقی کی طرف لے جائے گا۔

جیریڈ روبن چیپ مین یونیورسٹی، اورنج، کیلی فورنیا میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ سیاسی اور مذہبی اداروں کے باہمی رابطوں اور معاشی ترقی میں ان کے کردار پر ان کے تحقیقی مضامین، دنیا کے موقر جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔


مشعل بکس
mashbks@brain.net.pk
Ph: 042-35866859